
پیکار
شمیم نوید

زیادہ سے زیادہ طاقت کا حصول اور دوسروں پر برتری حاصل کرنے کی خواہش ہمیشہ سے انسان کی فطرت میں شامل رہی ہے۔ یہ ایک ایسے سیدھے سادے نوجوان کی ہنگامہ خیز داستان ہے جسے حالات نے طاقت کے حصول کے لیے مجبور کر دیا تھا۔ وہ اپنی زندگی بچانے کے لیے دوسروں کی زندگی لینے پر مجبور ہو گیا۔

اسے ایک انوکھی طاقت حاصل ہو گئی تھی۔ باپ دادا کے چھوڑے ہوئے ترکے میں اسے ایک ایسی کتاب مل گئی جس میں پُراسرار عملیات کا خزانہ بند تھا۔ پُراسرار طاقتوں کے حصول کے بعد وہ بدی کی طاقتوں کے خلاف برسرِ پیکار ہو گیا۔ جرم کی بساط بچھانے والے بڑے بڑے شاطر اس کے ہاتھوں مات کھا گئے۔

''دیوہان'' ''سرباز'' اور ''زنجیر'' جیسی بڑی کہانیوں کے خالق محترم شمیم نوید کی زندگی کی یہ آخری کہانی ہے جو سنڈے ایکسپریس میں قسط وار چھپتی رہی۔ محترم شمیم نوید اس کہانی کو کتابی شکل میں دیکھنے سے پہلے ہی اس دنیا سے کوچ کر گئے......انا للہ وانا الیہ راجعون!

وہ خود تو اس دنیا سے چلے گئے ہیں لیکن وہ کتابوں کی صورت میں ہمیشہ ہمارے دلوں میں موجود رہیں گے اور قارئین ان کے فن کو خراجِ تحسین پیش کرتے رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین!

عبدالغفار

اپنی جیپ کو جیسے ہی میں نے دائیں جانب جنگل کے درمیان سے گزرنے والی کچی سڑک پر موڑا، فضا زبردست دھماکے سے گونج اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی میری جیپ ایک طرف جھک گئی جیپ کا ایک ٹائر برسٹ ہو گیا تھا، مگر وہ دھماکہ صرف ٹائر برسٹ ہونے کا نہیں تھا۔ یقیناً کسی نے گولی چلائی تھی۔ میں نے فوری طور پر اگلے اور پچھلے دونوں بریک ایک ساتھ لگا دیے ورنہ جیپ کے الٹ جانے کا امکان تھا۔ بریک لگاتے ہی پے در پے کئی اور دھماکے ہوئے اور میرا سر ونڈ اسکرین سے ٹکرایا۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھیل گیا۔ اسی عالم میں بیک وقت کئی تیز چیخیں میری سماعت سے ٹکرائیں۔ ان میں ایک نسوانی چیخ بھی شامل تھی میرا سر جھکتا چلا گیا۔ مجھے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اسٹیرنگ سے اپنا سر اٹھانا چاہا، لیکن کامیاب نہ ہوا۔ سر پر چوٹ لگنے کے سبب میرے ہوش و حواس جواب دیتے جا رہے تھے۔ اپنے وجود کو میں نے کسی گہرے کنویں میں اترتے دیکھا اور پھر مجھے یاد نہیں کیا ہوا۔

معلوم نہیں مجھے کتنی دیر بعد ہوش آیا۔ کچھ دیر تک میں سمجھ ہی نہ سکا کہ کہاں ہوں۔ پھر مجھے سب کچھ یاد آ گیا اور میرے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ پہلا خیال مجھے ناہید کا آیا اور میں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ میرے برابر والی سیٹ خالی تھی۔ ناہید میرے ساتھ آگے ہی بیٹھی تھی۔ پچھلی سیٹ پر کمالے اور جبید ے تھے۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو میرے ذہن کو شدید جھٹکا لگا۔ ان دونوں کے لہولہان جسم ادھر سے اُدھر لڑھکے ہوئے تھے۔ قریب ہی ان کی رائفلیں پڑی تھیں۔ ان کے جسم گولیوں سے چھلنی تھے۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ وہ دونوں مر چکے ہیں۔ پھر بھی میں نے انہیں ہلا جلا کر دیکھا اور میرے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ اب مجھے ناہید کی فکر ہوئی کہ وہ کہاں گئی! میری حالت بہر حال اس قابل تھی کہ میں اسے اردگرد تلاش کر سکتا۔ میرے ماتھے کی کھال پھٹ کر وہاں خون جم گیا تھا اور ہلکا سا ابھار بھی محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے سوا میرے جسم پر کوئی چوٹ نہیں آئی

تھی۔ سر میں البتہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں، لیکن تکلیف اتنی نہیں تھی کہ میں برداشت نہ کر پاتا۔

میں خود کو سنبھالتا ہوا ناہید کو تلاش کرنے دائیں جانب بڑھا۔ ابھی شام ہونے میں دیر تھی اور اندھیرا نہیں پھیلا تھا۔ میں جنگل میں گھس گیا۔ میری نظریں تیزی کے ساتھ اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ناہید کو میں نے جنگل کے اس حصے میں دور تک تلاش کیا، مگر وہ مجھے کہیں نظر نہ آئی، ممکن ہے فائرنگ سے بچنے کی خاطر وہ جنگل میں بائیں سمت نکل گئی ہو۔ میں نے اپنے دل کو تسلی دی اور پھر دوبارہ سڑک پر آ گیا۔ سڑک عبور کر کے میں جنگل کے دوسرے حصے میں داخل ہو گیا، لیکن میری یہ کوشش بھی لاحاصل رہی۔ ناہید وہاں بھی نہیں تھی۔ جیپ کی طرف لوٹتے ہوئے میری آنکھوں میں ناہید کا سراپا گھوم گیا۔ شہد اور دودھ میں گندھا ہوا سرخ وسفید رنگ، بڑی بڑی بولتی ہوئی سی آنکھیں، گھنی اور لمبی پلکیں، ستواں ناک، ابھرے ابھرے سے ہونٹ، چوڑی پیشانی، ساون کی گھٹاؤں جیسے شانوں پر لہراتے بال، کتابی چہرہ، رفتار ایسی کہ چلتی تو یوں لگتا جیسے زمانہ اس کے قدموں میں ٹھوکریں کھا رہا ہو۔ ناہید کے حسن سے کوئی بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا، میں تو پھر بھی نوجوان تھا۔ میں تو اس کی محبت کو اپنے دل کی گہرائیوں میں کسی قیمتی سرمائے کی طرح چھپائے ہوئے تھا کہ کہیں اس پر کسی کی نظر نہ پڑ جائے۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ جس دن میری چاہت کا راز کھل گیا وہ میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔ کچھ خواب ایسے ہوتے ہیں جن کی تعبیر نہیں ہوتی۔ ناہید بھی میرے لیے ایسا ہی ایک حسین خواب تھی۔

ناہید کے بارے میں سوچتا ہوا میں جنگل سے نکل کر جیپ تک پہنچ گیا۔ میرے خیال میں ناہید کو اغوا کیا گیا تھا۔ حملہ آور یقیناً اتنے ماہر نشانے باز ہوں گے کہ ان کی کوئی گولی ناہید کے حسین جسم کو چھو نہ سکی ہوگی۔ اگر حملہ آوروں کا مقصد ناہید کو مارنا ہی تھا تو اسے قتل کر کے اس کی لاش بھی وہیں پھینک گئے ہوتے۔ وہ کون تھے اور انہوں نے ایسا کیوں کیا تھا، میری سمجھ میں یہ بات نہ آ سکی۔ مجھے غالباً وہ اس لیے زندہ چھوڑ گئے تھے کہ بے ہوش ہونے کے سبب میں ان کی راہ میں مزاحم نہ ہوتا۔

چوہدری اسلم کے حکم پر کمالے، جیدا اور میں، ناہید کو ساتھ لے کر شہر سے گاؤں لوٹ رہے تھے کہ راستے میں یہ اندوہناک واقعہ پیش آ گیا۔ ناہید کی تلاش میں ناکامی کے بعد اب میرے لیے یہی ایک صورت باقی رہ گئی تھی کہ گاؤں پہنچ کر ناہید کے باپ چوہدری اسلم کو اس واقعے سے آگاہ کر دوں۔ غیر ضروری تاخیر میرے لیے مشکلات پیدا کر سکتی تھی۔

جیپ میں ایک اضافی وہیل موجود تھا اور وہیل بدلنے کا سامان بھی، میں نے وہیل بدلا اور پھر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ سورج غروب ہونے سے پہلے ہی میں گاؤں میں پہنچ گیا۔ جب میری جیپ حویلی میں داخل ہوئی اور چوہدری اسلم کو اس ہولناک واقعے کا علم ہوا تو اس پر جیسے بجلی گر پڑی۔ اس نے مجھ سے حملہ آوروں کے بارے میں پوچھا، لیکن میں کچھ بتا نہ سکا۔

"شاید اس لیے چوہدری صاحب...... کہ میں بے ہوش ہو گیا تھا" میں نے جواب دیا اور پیش آنے والے واقعے کی تفصیل بیان کر دی۔ چوہدری اسلم نے اپنے تمام کارندوں کو جمع کر لیا اور انہیں ناہید کی تلاش کا حکم دیا۔ میں ان کی رہنمائی کے لیے ساتھ تھا۔ کارندوں نے آس پاس کے سارے جنگل کو کھنگال ڈالا، مگر ناہید کا کوئی سراغ نہ ملا۔ ناکام ونامراد ہم گاؤں واپس آ گئے۔ پھر بھی میرے دل کو یہ ڈھارس تھی کہ ناہید زندہ ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کی لاش مل گئی ہوتی۔

اس رُوح فرسا واقعے کو ابھی ایک ہفتہ گزرا تھا کہ گاؤں کے باہر ایک لاش ملی۔ لاش کسی عورت ہی کی تھی جس کا چہرہ مسخ کر دیا گیا تھا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ چہرے پر تیزاب پھینکا گیا ہے۔ جسم پر موجودہ کپڑوں اور زیورات سے لاش کو شناخت کر لیا گیا۔ ناہید وہی کپڑے اور زیورات پہنے ہوئے تھی۔ جنہیں زیب تن کیے شہر سے گاؤں لوٹ رہی تھی۔ حویلی میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ اب تک میرے دل کو جو آس تھی، وہ بھی ٹوٹ گئی۔ پھر اپنے خوابوں کو خود میں نے کاندھا دیا۔ ناہید کو کس نے اغوا کرایا تھا اور پھر کیوں موت کی نیند سلا دیا، کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا۔ ہاں چوہدری اسلم کو اس علاقے کی ایک اور باحیثیت وبااثر شخصیت پر اس سلسلے میں ضرور شک تھا، لیکن ٹھوس ثبوت کے بغیر صرف شک سے کیا ہوتا ہے اور اسی لیے کوئی قدم نہیں اٹھا سکا۔

کہتے ہیں کہ وقت گہرے سے گہرے زخم بھر دیتا ہے۔ سو کچھ دنوں چوہدری اسلم کی حویلی ویران ویران ہی رہی، پھر دھیرے دھیرے اس کی رونقیں لوٹ آئیں۔ اس کا ایک بڑا سبب ملک میں ہونے والے عام انتخابات تھے۔ چوہدری اسلم کی سیاسی سرگرمیاں شروع ہو گئیں۔ اپنے حلقے سے اس نے صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑنے کے لیے تیاریوں کا آغاز کر دیا۔ جس سیاسی پارٹی سے اس کی وابستگی تھی، اسے اپنا امیدوار نامزد کرنے پر آمادہ ہو گئی۔ گزشتہ انتخاب وہ پارٹی ٹکٹ نہ ملنے کی وجہ سے وہ ہار گیا تھا۔ اس نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے انتخاب میں حصہ لیا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس کا روایتی حریف ملک مظفر کامیاب رہا۔ اس نشست پر عرصہ دراز سے چوہدری اسلم کی اجارہ داری تھی۔ اسے اسی لیے شکست

پر بہت رنج ہوا۔

ملک مظفر اور چوہدری اسلم سیاسی میدان کے پرانے کھلاڑی تھے۔ گزشتہ انتخاب میں ملک مظفر نے اپنی وفاداریاں تبدیل کرلیں۔ وہ اپنی سیاسی پارٹی کو چھوڑ کر اس پارٹی کے ساتھ آگیا جس سے چوہدری اسلم وابستہ تھا۔ ملک مظفر نے کچھ ایسے داؤ پیچ آزمائے کہ پارٹی ٹکٹ اسے مل گیا۔ چوہدری اسلم کو یہ غرور تھا کہ علاقے میں اپنے سیاسی اثر کے سبب ہمیشہ اسے فتح حاصل ہوتی ہے، لیکن انتخاب کے نتیجے نے اس کا غرور خاک میں ملا دیا۔ پارٹی ٹکٹ ملک مظفر کو دیے جانے پر پارٹی کے کچھ بڑے عہدیداروں سے اس کی ان بن بھی ہوگئی۔ ان عہدے داروں نے چوہدری اسلم پر زور دیا تھا کہ وہ ملک مظفر کے حق میں دست بردار ہو جائے۔ چوہدری اسلم نے یہ مشورہ قبول نہیں کیا۔ وہ بہ حیثیت آزاد امیدوار میدان میں ڈٹا رہا۔ یہ الگ بات کہ اسے ملک مظفر کے مقابلے میں شکست فاش ہوئی۔

اب جو انتخاب ہونے والا تھا، اس میں صورت حال قطعی برعکس تھی۔ ملک ظفر کو پارٹی ٹکٹ نہیں ملا تو اس نے پارٹی سے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ اب وہ چوہدری اسلم کے مقابلے میں آزاد امیدوار تھا۔ لوگوں کا کہنا یہ تھا کہ ملک مظفر کو اب تک گزشتہ انتخاب میں اپنی کامیابی کا نشہ ہے۔ ملک مظفر کو یہ بھی کہتے سنا گیا کہ بہت جلد چوہدری اسلم اس کے حق میں دست بردار ہو جائے گا۔

کاغذاتِ نامزدگی واپس لینے کی تاریخ ابھی نہیں آئی تھی۔ ملک مظفر کے دعوے کی روشنی میں لوگ اسی لیے طرح طرح کی قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔ ذاتی طور پر اس جھگڑے سے مجھے صرف اس حد تک دلچسپی تھی کہ میں بہر حال چوہدری اسلم کا ایک کارندہ تھا۔ اس کے علاوہ چوہدری اسلم سے میری دور کی رشتے داری بھی تھی۔ میرے والدین کا انتقال اس وقت ہو گیا تھا جب میں نے ہوش نہیں سنبھالا تھا۔ میری پرورش حویلی میں ہی ہوئی تھی۔ گاؤں کے بزرگوں سے میں نے سنا تھا کہ میرے ماں باپ کی وفات بڑے پُراسرار حالات میں ہوئی تھی۔ ایک صبح وہ دونوں اپنے گھر مردہ پائے گئے تھے۔ میری عمر اس وقت چار سال کے قریب ہوگی جب میں بڑا ہوا تو کچھ اور باتیں میرے سامنے آئیں۔ معلوم ہوا کہ گاؤں میں میرے والد کی خاصی زمین تھی اس زمین پر اب چوہدری اسلم کا قبضہ تھا۔ میرے اندر خود تو کبھی اتنا حوصلہ پیدا نہ ہوا کہ اس سلسلے میں چوہدری اسلم سے کچھ پوچھ سکتا، ہاں اسی نے ایک روز مجھ پر حقیقت واضح کر دی۔ اس نے مجھے کچھ کاغذات بھی دکھائے جن پر میرے والد کے دستخط تھے۔ چوہدری اسلم نے مجھے بتایا۔

''پتر شہباز! بھا کریم نے اپنی زندگی میں ساری زمین میرے نام کر دی تھی۔ یہ اسی کے کاغذات ہیں۔ معلوم نہیں انہیں اپنی موت کا پہلے ہی سے کس طرح علم ہو گیا تھا! تبھی تو مرنے سے پہلے وہ مجھ سے ملے تھے۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ اگر وہ دنیا میں نہ رہیں تو تیری پرورش میں کروں۔ سو میں آج تک وہی وعدہ نبھا رہا ہوں۔ یہ باتیں میں نے تجھے اس لیے بتائی ہیں کہ اب تُو بڑا ہو گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کچھ لوگ تجھے میری طرف سے بہکانے کی کوشش کریں۔ تجھے اپنے والد کی طرف سے وراثت میں صرف ایک مکان ملا ہے جو تیرے قبضے میں ہے۔ یہ مکان بھا کریم نے میرے نام نہیں کیا تھا۔''

میں نے یہ سن کر کہا۔ ''چوہدری صاحب! آپ میرے باپ کی جگہ ہیں۔ آپ نے مجھے پالا پوسا ہے، دسویں کلاس تک گاؤں کے اسکول میں پڑھایا ہے، میں کیسے کسی کے بہکائے میں آسکتا ہوں! میں تو صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ میرے ماں باپ اچانک کس طرح انتقال کر گئے؟''

چوہدری اسلم نے جواب دیا۔ ''جہاں تک مجھے خبر ہے، کوئی وظیفہ الٹا ہو گیا تھا۔''

میں حیرت سے چوہدری اسلم کی صورت دیکھنے لگا کیونکہ وظیفہ الٹا ہونے کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اپنے والد کے متعلق گاؤں کے بوڑھوں سے بھی میں نے کچھ اسی طرح کی باتیں سنی تھیں کہ انہیں وظائف اور عملیات کا شوق تھا۔ پھر بھی چوہدری اسلم نے جو کہا وہ میرے پلے نہیں پڑا۔ آخر میں نے پوچھ ہی لیا۔ ''چوہدری صاحب! وظیفہ الٹا کیسے ہو جاتا ہے؟''

''ہر وظیفے کی ایک مدت ہوتی ہے۔'' چوہدری اسلم مجھے بتانے لگا۔ ''اگر وظیفہ پڑھنے والا کسی وجہ سے وہ مدت پوری نہیں کر پاتا اور وظیفے کو ادھورا ہی چھوڑ دیتا ہے تو اسے سخت نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اسی کو وظیفہ الٹا ہونا کہتے ہیں۔ کبھی کبھی اس میں جان بھی چلی جاتی ہے۔ تُو مجھ سے ایک وعدہ کر شہباز پتر، کہ ان چکروں میں نہیں پڑے گا۔ یہ بہت خطرناک کام ہے۔ تجھے میں اسی لئے تیرے گھر آنے جانے سے بھی منع کرتا رہتا ہوں کہ تیرے ہاتھ کوئی ایسی ویسی چیز نہ پڑ جائے۔''

میں نے چوہدری اسلم کو یقین دلایا کہ اس کی نصیحت پر عمل کروں گا۔ اسی کے ساتھ میرے ذہن میں یہ سوال بھی پیدا ہوا کہ لوگ وظیفے کیوں پڑھتے ہیں؟ اس کی کوئی وجہ تو ہو گی۔ وظیفے پڑھنے والے بلا سبب ہی تو اپنی زندگی خطرے میں نہیں ڈالتے ہوں گے۔

چوہدری اسلم کی نصیحت کا مجھ پر الٹا اثر ہوا۔ میں اسی دن گاؤں کی مسجد کے مولانا

قدرت اللہ سے ملا۔ وہ اسی وقت نماز پڑھا کر اپنے حجرے میں آیا تھا۔ میرا سوال سن کر مولانا نے پوچھا۔ ''تم یہ بات کس لئے معلوم کرنا چاہتے ہو؟''

''بس یوں ہی اپنی معلومات کے لیے جاننا چاہتا ہوں۔'' میں نے بتایا۔

''نہیں پتر! بات کچھ اور ہی لگتی ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے مجھ سے دھیمی اور رازدارانہ آواز میں معلوم کیا۔ ''کہیں تمہیں اپنے گھر سے کوئی پرانی کتاب، کاپی یا ڈائری تو نہیں ملی جس میں وظیفے لکھے ہوں؟ تم مجھے بتا دو، میں کسی سے نہیں کہوں گا۔ تمہارے مرحوم والد کو بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ ایک عامل تھے۔''

''عامل کسے کہتے ہیں مولانا صاحب؟'' میں نے دریافت کیا۔

''میں تمہارے ہر سوال کا جواب دوں گا، تمہیں ہر بات بتا دوں گا مگر مجھ سے ایک وعدہ کرو۔'' قدرت اللہ نے میرے چہرے پر نظر جما دیں، پھر بعد لمحے چند کہنے لگا۔ ''تمہیں اپنے گھر میں جو چیز ملی ہے، وہ مجھے لا کر ضرور دکھاؤ گے۔''

''لیکن مولانا صاحب، مجھے تو کچھ نہیں ملا۔ ویسے میں وہاں نہیں چوہدری صاحب کی حویلی میں رہتا ہوں۔ میں تو کبھی کبھار گھر کی صفائی کرنے وہاں چلا جاتا ہوں۔'' میں نے جو کچھ کہا، وہی حقیقت تھی۔

میرا جواب سن کر قدرت اللہ کچھ دیر چپ رہا، پھر بولا۔ ''اگر تم سچ کہہ رہے ہو اور تمہیں کوئی ایسی کام کی چیز نہیں ملی تو پھر..... پھر ایسا کرو مجھے اپنے گھر لے چلو۔'' اس کی متوقع نظریں میری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

''وہ کس لیے مولانا صاحب؟'' میں نے چونک کر سوال کیا۔

''میں خود وہ چیز تلاش کرلوں گا۔''

مولانا قدرت اللہ کے اصرار سے میں اتنا تو سمجھ ہی گیا کہ اسے جس چیز کی تلاش ہے، وہ یقیناً قیمتی ہے۔ قدرت اللہ اس قیمتی چیز کو کسی بہانے مجھ سے ہتھیا لینا چاہتا تھا۔ یہی سوچ کر میں نے کہا۔ ''آپ سے میں وعدہ کرتا ہوں کہ میرے گھر میں کوئی ایسی چیز ہوئی تو خود ہی ڈھونڈ کر دے جاؤں گا، لیکن پہلے میرے سوالوں کا جواب تو دیں۔''

''خوب سوچ لو شہباز پتر کہ تم مسجد میں بیٹھ کے مجھ سے یہ وعدہ کر رہے ہو!'' قدرت اللہ نے مجھے اپنی دانست میں ڈرایا۔

''ہاں ہاں مجھے معلوم ہے مولانا صاحب!'' میں نے یہ سوچ اقرار میں گردن ہلا دی کہ اس کا حجرہ مسجد کی حدود میں نہیں تھا۔

''اچھا تو پھر پوچھو، کیا معلوم کرنا ہے تمہیں؟'' اس نے پہلو بدلا۔ میں نے اپنا پہلا سوال دہرایا تو وہ بتانے لگا۔ ''مختلف وظیفے مختلف کاموں کے لیے پڑھے جاتے ہیں، مثلاً دولت حاصل کرنے کے لیے یا اپنے اندر کوئی ایسی پُراسرار قوت پیدا کرنے کی خاطر جو عام انسانوں میں نہیں ہوتی۔ عمل کرنے والے یا وظیفے پڑھنے والے کو عامل کہتے ہیں۔''

پھر مولانا قدرت اللہ دیر تک وظائف اور عملیات کے بارے میں بتاتا رہا۔ اس کی باتیں میرے لیے انتہائی حیرت انگیز اور دلچسپ تھیں۔ درمیان میں مَیں نے بہت سے سوالات بھی کیے جن کے مجھے تسلی بخش جواب ملے۔ جب میں مکمل معلومات حاصل کر کے اٹھنے لگا تو اس نے مجھے پھر میرا وعدہ یاد دلایا۔ میں نے اسے مطمئن کر دیا کہ اپنا وعدہ ضرور نبھاؤں گا حالانکہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ لاعلمی میں تو یہ ممکن تھا کہ میں یہ غلطی کر بیٹھتا لیکن اب تو مجھے سب کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ وہ بوڑھا مجھے شاید کوئی کم عقل نوجوان سمجھ رہا تھا جو اسے یہ امید تھی کہ میں اتنی قیمتی شے اس کے حوالے کر دوں گا جب کہ وہ میری ملکیت تھی۔

جب میں مولانا قدرت اللہ کے حجرے سے نکلا تو رات ہو چکی تھی۔ میں نے اسی لیے حویلی کی راہ لی۔

دوسرے دن صبح ضروری کاموں سے فارغ ہوتے ہی میں حویلی سے نکلا اور اپنے گھر پہنچ گیا۔ میرے گھر میں بہت سا ایسا سامان تھا جسے میں نے جھاڑ پونچھ کے باوجود کبھی کھول کر نہیں دیکھا تھا۔ انہی میں میر الد کا ایک بوسیدہ بکس بھی تھا۔ ٹین کے اس زنگ آلود بکس میں جانے کیا کیا بھرا پڑا تھا۔ میں نے پہلی بار اسے کھولا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ اسی بکس میں کچھ ہو سکتا ہے۔ بکس کھولتے ہی اس میں مجھے پھٹے پرانے کپڑے نظر آئے جن میں کیڑا لگا ہوا تھا۔ وہ کپڑے نکال کر میں نے ایک طرف رکھ دیے۔ انہی کپڑوں کے ساتھ مجھے کاغذوں کے کئی پلندے دکھائی دیے جن کے خاصے حصے کو دیمک اپنی خوراک بنا چکی تھی۔ معلوم نہیں میرے والد نے انہیں کیوں سنبھال کر رکھا تھا۔ کاغذوں کے جو حصے دیمک سے بچ رہے تھے، ان کی روشنائی اتنی پھیکی پڑ گئی تھی کہ میں بہ مشکل اس تحریر کو پڑھنے میں کامیاب ہوا۔ ان کاغذوں پر میرے والد نے کچھ حساب لکھا تھا۔ کہیں کہیں سے ہندسے پڑھنے میں آئے۔ میں نے ان کاغذوں کو بھی ایک جانب ڈال دیا تو پلاسٹک کی ایک تھیلی میں کوئی چیز لپٹی ہوئی نظر آئی۔ وہ چیز بکس کی تہہ میں سب سے نیچے بڑی حفاظت کے ساتھ رکھی ہوئی تھی۔ اسے میں نے بکس میں سے نکال لیا اور تھیلی کھول کر دیکھی۔ اس وقت میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ میرا سانس بھی تیزی سے چلنے لگا۔

تھیلی کے اندر مجھے پلاسٹک کا کور چڑھی ہوئی ایک ڈائری ملی اس ڈائری کے پہلے صفحے پر بسم اللہ کے نیچے چوہدری رحیم بخش کا نام لکھا ہوا تھا گویا وہ ڈائری رحیم بخش کی تھی یہ میرے دادا کا نام تھا۔ ڈائری کے مزید صفحات کھول کر دیکھنے سے میرے دل کی دھڑکنوں میں اور بھی اضافہ ہو گیا اس میں مختلف وظائف تحریر کئے تھے ہر وظیفے کے ساتھ اس کی تفصیل درج تھی کہ وظیفہ کس وقت کہاں اور کتنے دن تک پڑھا جاتا ہے نیز اس کی شرائط کیا ہیں بھی کچھ لکھا ہوا تھا۔ میں سمجھ گیا یقیناً یہی وہ چیز ہے جس کی نشان دہی مولانا قدرت اللہ نے کی تھی اس ڈائری کو میں پھر کسی وقت اطمینان سے دیکھنے کے لیے اپنے ساتھ لے آیا۔ اسے میں نے حویلی آکر اپنے کمرے میں حفاظت سے ایک جگہ چھپا دیا کہ کوئی دیکھ نہ لے۔ اس کے بعد کئی بار آتے جاتے مولانا قدرت اللہ نے مجھے میرا وعدہ یاد دلایا۔ ہر بار میرا ایک ہی جواب ہوتا کہ مولانا ابھی تک تو مجھے کوئی ایسی چیز نہیں ملی۔

''ڈھونڈو شہباز پتر، ڈھونڈو! ضرور ملے گی۔'' مولانا قدرت اللہ تاکید کرتا۔

''میں تلاش میں ہوں مولانا! جب بھی وہ چیز مل گئی، آپ کے پاس لے آؤں گا۔'' میں تسلی دے دیتا۔

میں نے اس عرصے میں رات کے وقت ڈائری کا مطالعہ شروع کر دیا تھا اردو عبارت کے ساتھ ساتھ وہ وظائف عربی زبان میں لکھے ہوئے تھے۔ میں نے قرآن شریف پڑھا تھا اس لیے اعراب کے ساتھ لکھی ہوئی عربی عبارت پڑھنے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ ہاں اس عربی عبارت کا مفہوم سمجھنے سے میں قاصر تھا۔ مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں تھی ایک بات میں نے خاص طور پر محسوس کی کہ ان وظائف کو پڑھنے کی شرائط بہت سخت تھیں۔ وظائف مختلف نوعیت کے اور طویل ومختصر دونوں طرح کے تھے۔ وظیفہ رد بلا، وظیفہ کی جیتی عمر، وظیفہ نجات دشمنی وحسد، وظیفہ قربت محبوب اور نہ جانے کتنے وظائف اس ڈائری میں تحریر تھے۔ میں اس وقت عمر کی ایسی منزل میں تھا کہ جب شعور زیادہ پختہ نہیں ہوتا لڑکپن سے جوانی کی حدود میں قدم رکھے مجھے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا اٹھارہ سال کی عمر ہی کتنی ہوتی ہے، پھر بھی مجھے اتنا احساس ضرور تھا کہ وہ ڈائری میرے لیے ایک قیمتی سرمائے کی حیثیت رکھتی ہے۔

جب مجھے مولانا قدرت اللہ نے زیادہ ٹوکنا شروع کر دیا تو میں نے اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ تلاش کرنے کے باوجود کوئی ایسی چیز نہیں مل رہی۔ اس پر مولانا قدرت اللہ نے تجویز رکھی۔ ''تم ایسا کرو شہباز پتر کہ مجھے اپنے گھر لے چلو، میں خود اس چیز کو ڈھونڈ لوں گا۔'' اس تجویز پر عمل کرنے سے میری جان آئندہ کے لیے چھوٹ سکتی تھی۔

ڈائری تو میں پہلے ہی وہاں سے نکال کر لے جا چکا تھا اس لیے قدرت اللہ کی بات مان لی۔ ایک روز میں اسے اپنے ساتھ گھر لے گیا۔ کئی گھنٹے وہ جھک مارتا رہا، مگر وہاں کچھ ہوتا تو اسے ملتا اس دن کے بعد سے قدرت اللہ نے میری جان چھوڑ دی۔

سب کچھ جاننے اور ڈائری میں پڑھ لینے پر بھی میرے اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ کسی وظیفے پر عمل کر سکتا۔ اس کی بڑی وجہ یہ خوف بھی تھا کہ کہیں کوئی وظیفہ الٹا نہ ہو جائے۔ میں اپنے والدین کی موت کو بھولا نہیں تھا جو بقول چوہدری اسلم وظیفہ الٹا ہونے کے سبب ہی انتقال کر گئے تھے۔ میرے والد کے عامل ہونے کی تصدیق مولانا قدرت اللہ نے بھی کی تھی۔

ناہید عمر میں مجھ سے دو سال چھوٹی تھی مگر اس کی صحت اچھی تھی وہ سولہ سال کے بجائے میرے برابر ہی لگتی تھی۔ جب عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ میں نے اپنے دل میں اس کے لیے میٹھی میٹھی سی کسک محسوس کی تو مجھے ڈائری میں لکھا ہوا ایک وظیفہ یاد آیا میں نے کئی مرتبہ ڈائری میں وہ وظیفہ دیکھا اور اس کی شرائط بھی غور سے پڑھیں، لیکن اس وظیفے کو پڑھنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ بہر حال وہ ڈائری میرے پاس محفوظ رہی پھر وہ حادثہ پیش آ گیا جس نے مجھے خون کے آنسو رونے پر مجبور کر دیا۔ میری محبت میری ناہید ہمیشہ کے لیے مجھ سے بچھڑ گئی میں بہت پچھتایا اور سوچا کاش اس کے حصول کی خاطر وظیفہ پڑھ لیا ہوتا پھر شاید مجھے یہ دن نہ دیکھنا پڑتا، لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ میری محبت مجھ سے روٹھ کر چلی گئی تھی۔

انتخاب کی تیاریاں زور وشور سے جاری تھیں۔ ان میں چوہدری اسلم جیسے اپنی بیٹی کی موت کو بھول ہی گیا تھا لیکن میں اسے کیسے بھلا دیتا! کسی کام میں بھی میرا جی نہ لگتا اور میں ہر وقت بجھا بجھا سا رہتا۔

انہی دنوں کا ذکر ہے کہ ایک شام چوہدری اسلم کے کمرے کی عقبی راہداری سے گزرتے ہوئے میرے پیروں میں جیسے کسی نے زنجیر ڈال دی اور میں ٹھٹک کر رک گیا۔ جو کچھ میں نے اپنے کانوں سے سنا اس پر مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہیں مردے بھی زندہ ہوتے ہیں۔

عقبی راہداری میں کھلنے والی نیم وا کھڑکی سے مجھے چوہدری اسلم کے خاص کارندے کی آواز سنائی دی۔ چوہدری اسلم اسے اپنا شکرا کہتا تھا اس کا نام سردارے تھا اس کی آواز حیرت میں ڈوبی ہوئی تھی وہ کہہ رہا تھا۔ ''لیکن چوہدری صاحب یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ناہید بی بی کو تو ہم نے خود اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتارا تھا۔''

''میں نے جو بھی کہا ہے سردارے وہی سچ ہے ناہید زندہ ہے تجھے اور کالئے کو ہر

قیمت پر ناہید کا پتا چلانا ہے کہ ہمارے دشمنوں نے اِسے کہاں چھپا رکھا ہے۔'' چوہدری اسلم کی آواز آئی۔

''اور پھر چوہدری صاحب؟'' سردارے نے سوال کیا۔

''اور پھر...... پھر اسے قتل کر دینا ہے۔'' چوہدری اسلم کی آواز میں بلا کی سفا کی تھی۔

''قتل قتل چوہدری صاحب؟ ناہید بی بی کو ہم...... قتل کر دیں؟'' سردارے نے رک رک کر پوچھا۔

''تو اس کھیل کو نہیں سمجھ سکتا پاگلا، ہمارے دشمنوں نے ایک ایسی گہری چال چلی ہے جس کا اب صرف ایک ہی توڑ ہے۔ وہ کوئی اور ہی عورت تھی کہ جس کا چہرہ بگاڑ کر اسے ناہید کے کپڑے اور زیورات پہنا دیے گئے تھے۔ دشمن کا مقصد اس سے یہ تھا کہ ہم ناہید کی تلاش ترک کر دیں اور وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب رہا۔ اس عورت کو ہم نے ناہید سمجھ کر دفنا دیا اور مطمئن ہو گئے۔ اب مجھ سے پوچھو انہوں نے ایسا کیوں کیا؟''

''کیوں چوہدری صاحب؟'' چوہدری اسلم کے خاموش رہنے پر سردارے نے پوچھا۔

''اس لیے کہ میرے دشمن مجھے ذلیل و رسوا کر سکیں اور مجھ سے اپنی ہر بات منواتے رہیں۔ فون پر مجھ سے خود ناہید کی بات کرائی گئی ہے...... اور تجھے معلوم ہے کہ مجھ سے پہلا مطالبہ کیا کیا گیا ہے؟...... مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں اپنے حریف ملک مظفر کے حق میں دست بردار ہو جاؤں۔''

چوہدری اسلم سے یہ سن کر کالیا پہلی بار بولا۔ ''چوہدری صاحب، اگر آپ کو ناہید بی بی کی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں تو پھر فکر کی کون سی بات ہے۔ اگر آپ نے ان کا مطالبہ نہیں مانا تو وہ زیادہ سے زیادہ یہی تو کر سکتے ہیں کہ ناہید بی بی کو ٹھکانے لگا دیں۔''

''کالئے، تیری موٹی عقل میں یہ بات نہیں آئے گی وہ اتنے بے وقوف نہیں ہیں کہ ناہید کو قتل کر دیں۔ اس طرح تو وہ پوری بازی ہی ہار جائیں گے۔ وہ مجھے واضح الفاظ میں بتا چکے ہیں کہ اگر میں نے ان کا مطالبہ تسلیم نہیں کیا اور حالیہ انتخاب سے کنارہ کشی اختیار نہ کی تو وہ کیا کریں گے۔ انہوں نے بہت سوچ سمجھ کر میرے خلاف یہ سازش تیار کی ہے یہ دیکھ وہ تصویریں جو مجھے بھیجی گئی ہیں......''

چند لمحوں کے لیے چوہدری اسلم کی آواز آنی بند ہو گئی اور پھر کالئے کی آواز ابھری۔ ''ارے، اس میں تو ناہید بی بی دلہن بنی ہوئی ہیں۔''

''اور یہ دیکھ دوسری تصویر اس میں ناہید کا نکاح پڑھایا جا رہا ہے، لے سردارے تُو

بھی دیکھ۔'' چوہدری اسلم نے اپنے ''شکرے'' کو مخاطب کیا۔

''چوہدری صاحب، یہ...... یہ جو دولہا بنا بیٹھا ہے اس...... اسے میں پہچانتا ہوں ہوں...... یہ خیرو ہے ملک مظفر کا خاص الخاص کارندہ۔'' چوہدری اسلم نے بھی سردارے کی بات سے اتفاق کیا۔

''ٹھیک پہچانا تُو نے، یہ وہی ہے یہ تیسری تصویر بھی دیکھ لے، اس میں یہی کمینہ خیرو دلہن بنی ہوئی ناہید کا گھونگٹ اٹھا رہا ہے...... اب مجھ سے سن کہ میں نے دشمنوں کا مطالبہ نہیں مانا تو وہ کیا قدم اٹھائیں گے۔ یہ سب تصویریں، خبارات میں اشاعت کے لیے دے دی جائیں گی ان کے ساتھ جو خبر چھپے گی وہ نہ صرف میری سیاسی موت ہو گی بلکہ مجھے جیتے جی درگور کر دے گی۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔ خبر کے الفاظ کچھ اس طرح ہوں گے کہ چوہدری اسلم کی بیٹی ناہید ملک مظفر کے ایک کارندے خیرو کے عشق میں مبتلا تھی، چوہدری اسلم اس کے خلاف تھا ناہید اسی لیے گھر سے بھاگ گئی اور خیرو سے شادی کر لی۔ چوہدری اسلم نے بدنامی سے بچنے کی خاطر پہلے ناہید کے اغوا ہو جانے اور پھر اس کی موت کا سوانگ رچایا، لیکن ناہید زندہ ہے۔ اپنے عشق پر اس نے مال و دولت کو ٹھوکر مار دی اب وہ اپنے عاشق خیرو کے ساتھ خوشگوار ازدواجی زندگی گزار رہی ہے یہ دیکھو......''

چوہدری اسلم نے یہ کہتے ہوئے سردارے کی طرف ایک اور تصویر بڑھا دی۔

سردارے وہ تصویر لے کر دیکھنے لگا۔

''یہ تصویر خیرو کے ساتھ شادی کے بعد کی ہے۔'' چوہدری اسلم نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''اس میں خیرو کے برابر ناہید نظریں جھکائے کھڑی ہے۔ اب تم دونوں سمجھے دشمن کی اصل سازش؟...... اگر آج میں اس کا یہ پہلا مطالبہ مان لیتا ہوں تو کل وہ کوئی دوسرا مطالبہ بھی کر سکتا ہے۔ وہ میری اسی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر مجھ سے تمام زمین وجائیداد اپنے نام لکھوا کے مجھے کوڑی کوڑی کا محتاج بھی کر سکتا ہے۔''

اس کے بعد کچھ دیر کو کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ کیا ایک باپ اپنی بیٹی کے قتل کا حکم بھی دے سکتا ہے؟ یہ سوال بار بار میرے ذہن میں گردش کرنے لگا۔ معاً سردارے کی آواز کمرے میں چھائی ہوئی خاموشی سے ابھری۔ وہ کہنے لگا۔ ''چوہدری صاحب! اگر ہم نے ناہید بی بی کا پتا چلا لیا اور انہیں قتل بھی کر دیا تو دشمنوں کے پاس یہ تصویریں ہوں گی۔ وہ انہیں اخباروں میں چھپوا کے آپ کو بدنام کر سکتے ہیں۔''

میں اس وقت تک ادھ کھلی کھڑکی سے لگ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ کھڑکی کی جھری سے اب

مجھے کمرے کے اندر کا منظر صاف صاف نظر آ رہا تھا۔ ''تُو نے ٹھیک کہا سردارے! لیکن وہ ایسا کریں گے نہیں کیوں کہ اس طرح وہ خود پھنس جائیں گے۔'' چوہدری اسلم نے جواب دیا۔

''وہ کس طرح چوہدری صاحب؟'' سردار نے معلوم کیا۔

''کیا تُو بھول گیا کہ میں نے علاقے کے تھانے میں ناہید کے اغوا ہو جانے کا پرچہ درج کرایا تھا! اغوا کا شک میں نے ملک مظفر ہی پر ظاہر کیا تھا۔ بظاہر رسمی طور پر پولیس نے مجھے یہی یقین دلایا تھا کہ اس سلسلے میں فوری ضروری کارروائی کی جائے گی، خواہ اس کے لیے پولیس کو ملک مظفر کی حویلی پر چھاپا ہی کیوں نہ مارنا پڑے۔ میں اتنا ناسمجھ اور بے وقوف نہیں تھا کہ پولیس کی ان باتوں پر یقین کر لیتا۔ یہ لوگ تو چڑھتے سورج کے پجاری ہوتے ہیں۔ ان میں اتنی ہمت کہاں ہو سکتی ہے کہ یہ اپنے علاقے کے رکن اسمبلی کے خلاف کوئی قدم اٹھا سکیں۔ میں نے یہ جاننے کے باوجود احتیاطاً پرچہ کٹا دیا تھا کہ شاید کبھی اس سے کوئی فائدہ اٹھایا جا سکے۔ اب یہ سمجھ کہ تُو نے میرے حکم پر ناہید کو قتل کر دیا تو وہ اپنی بات کی سچائی کس طرح ثابت کریں گے!'' چوہدری اسلم کہتا رہا۔ ''ناہید کا قتل ان کے گلے کا پھندا بن جائے گا۔ خاص طور پر ایسی صورت میں کہ ان کے خلاف میں پہلے ہی پرچہ کٹوا چکا ہوں۔ مان لیا کہ ناہید کے قتل ہونے کے بعد بھی انہوں نے یہ تصویریں اخبارات میں چھپوا دیں تو میرے بیان سے وہ پھنس جائیں گے۔ میں جواب میں بیان دوں گا کہ ملک مظفر نے پہلے ناہید کو اغوا کرایا پھر اسے قتل کر کے میرے گاؤں کے باہر پھنکوا دیا۔ تیری سمجھ میں اب آیا کہ ناہید کو اگر قتل کر دیا گیا تو وہ ہرگز یہ تصویریں اخبارات کو چھاپنے کے لیے نہیں دیں گے۔ میں اپنے دشمنوں کو اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ اتنے بے وقوف ہرگز نہیں ہیں۔''

''میں سمجھ گیا چوہدری صاحب!...... ساری بات اچھی طرح سمجھ گیا۔'' سردار نے اقرار کیا۔

''تو پھر آج ہی سے تم دونوں ناہید کی تلاش شروع کر دو!'' چوہدری اسلم نے حکم دیا۔ ''تم اسے دیکھتے ہی گولی مار دینا! مجھے تم بعد میں اطلاع دے سکتے ہو۔'' چوہدری اسلم کا حکم سن کر وہ دونوں کمرے سے نکل گئے۔ پھر میں بھی وہاں نہیں رکا۔

اپنے کمرے میں آ کر میں نے دروازہ بند کیا اور لڑکھڑاتے قدموں سے بستر کی طرف بڑھا۔ اپنے حواس پر قابو پانے میں مجھے کچھ دیر لگی۔ اس خبر نے جیسے مجھے ایک نئی زندگی عطا کر دی تھی کہ میری محبت، میری ناہید ابھی زندہ ہے۔ قاتل اس کی تلاش میں روانہ

ہو چکے تھے۔ مجھے ان قاتلوں سے پہلے ناہید تک پہنچنا ہے۔ میں نے دل ہی دل میں عہد کر کیا۔ میں اسے مرنے نہیں دوں گا۔ اس کا سراغ کیسے لگایا جائے؟ یہ سوچتے ہوئے اچانک میرے ذہن میں روشنی ہو گئی۔ یاد آ گیا کہ میں نے ڈائری میں ''وظیفہ تلاش گمشدہ'' بھی دیکھا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ بستر سے اٹھا اور اپنی الماری کھول کر اس میں سے ڈائری نکال لی۔

میں اس قدر عجلت میں اور بوکھلایا ہوا تھا کہ ایک مرتبہ ڈائری کے تمام صفحات ایک ایک کر کے الٹ گیا مگر مجھے وہ وظیفہ نہیں ملا۔ میرا دل بجھ سا گیا میں نے سوچا، شاید یہ میرا وہم ہو کہ ڈائری میں کوئی ایسا وظیفہ دیکھا ہے۔ پھر بھی میں ہمت نہیں ہارا اور دوبارہ ڈائری کے اوراق پلٹنے لگا۔ اس بار [illegible] نہیں دکھائی اور ہر وظیفے پر لکھا ہو عنوان توجہ سے پڑھا۔ ڈائری کے وسط میں مجھے دو ورق کسی قدر چپکے ہوئے ملے۔ ان اوراق کو میں پہلی دفعہ جلدی میں ایک ساتھ الٹ گیا تھا۔ دونوں ورق میں نے احتیاط سے الگ کیے اور پھر دائیں جانب ''وظیفہ تلاش گمشدہ'' پر نظر پڑتے ہی میرا دل تیزی کے ساتھ دھڑکنے لگا۔

شرائط کے مطابق مجھے وہ وظیفہ نماز عشاء کے بعد پڑھنا تھا۔ اس وظیفے کو مجھے زوال کے وقت، یعنی بارہ بجے رات سے پہلے پہلے ہر حال میں پڑھ لینا تھا۔ اس مدت میں سوا لاکھ مرتبہ مجھے وظیفہ کے الفاظ دہرانے تھے۔ اس عرصے میں مجھے نہ تو اپنی جگہ سے اٹھنا تھا، نہ کسی صورت بھی وظیفہ ادھورا چھوڑنا تھا۔ ڈائری میں لکھا تھا کہ اگر وظیفہ پڑھنے والا کسی سبب اسے مکمل نہ کر سکا تو اس کی یادداشت گم ہو سکتی ہے۔ وظیفے کی دیگر تفصیلات کو بھی میں نے بہت غور سے پڑھا۔

مجھے معلوم تھا کہ چوہدری اسلم کو کسی بھی وقت میری ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اس سے بچنے کی کیا صورت ہو؟ میں سوچنے لگا۔ وظیفہ ایک مرتبہ شروع کر کے اسے ادھورا چھوڑ کے اٹھنا میرے لیے ناممکن تھا۔ یادداشت گم ہو جانے کا مطلب بھی ایک طرح کی موت ہی تھی۔ اگر ناہید کی تلاش کا معاملہ درپیش نہ ہوتا تو میں ہرگز یہ خطرہ مول نہ لیتا۔ اس مسئلے کا مجھے ایک ہی حل نظر آیا کہ میں پہلے ہی سے بیماری کا بہانہ کر کے اپنے کمرے میں بند ہو جاؤں۔ اس کے لیے یہ ضروری تھا کہ میں کسی طرح چوہدری اسلم کے علم میں یہ بات لے آؤں کہ میری طبیعت خراب ہے اور آج رات دوا پی کر جلدی سو جاؤں گا۔ اس صورت میں چوہدری اسلم مجھے نہ بلواتا۔

ڈائری میں درج عبادت کے مطابق مجھے آج ہی رات پتا چل جاتا کہ ناہید کہاں

ہے! میں نے فیصلہ کیا کہ یہ معلوم ہوتے ہی مجھے فوری طور پر حویلی سے روانہ ہو جانا چاہیے۔ جیپ کی چابیاں میرے پاس ہی رہتی تھیں۔ حویلی میں ایک اور جیپ بھی تھی۔ یہ جیپ عموماً سردارے کے استعمال میں رہتی تھی۔ کبھی کسی ضرورت سے دوسرے کارندے بھی اسے استعمال کر لیتے تھے۔ ان دو جیپوں کے علاوہ ایک کار بھی تھی جسے چوہدری اسلم اکثر خود ہی ڈرائیو کرتا تھا۔ ابھی تک میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ ناہید کا سراغ لگا کر اسے کہاں لے جاؤں گا؟ اس کے لیے مجھے رقم کی بھی ضرورت تھی۔ کھانا، پینا، رہنا سہنا، کپڑے وغیرہ سبھی کچھ چوہدری اسلم کی ذمے داری تھی۔ مجھے ہر مہینے پابندی سے جو تنخواہ ملتی تھی اس کا بڑا حصہ بچ رہتا تھا۔ سب سے پہلے میں نے وہی بچی ہوئی رقم الماری سے نکال کر گنی۔ میرے اندازے کے مطابق کوئی کام کیے بغیر یہ رقم کئی ماہ میرے اور ناہید کے اخراجات پورے کر سکتی تھی۔ میں اب ناہید کی خاطر یہ حویلی ہمیشہ کے لیے چھوڑنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

میرے فیصلے کے مطابق آج اس حویلی میں میری آخری رات تھی۔ میرے پاس ایک سوٹ کیس بھی تھا میں نے اس میں اپنے کپڑے، رقم، ڈائری اور ضروری استعمال کی دیگر چیزیں رکھ لیں۔ ڈائری کو میں نے رقم کے ساتھ کپڑوں کے نیچے بہت احتیاط سے رکھا تھا۔ اس ڈائری کی حیثیت بھی میرے لیے ایک قیمتی سرمائے ہی کی تھی۔ یہ تمام تیاریاں کرنے میں مجھے ایک گھنٹا لگ گیا۔ اس عرصے میں مغرب کی اذان ہو چکی تھی۔ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر میں نکلنے ہی والا تھا کہ چونک اٹھا۔ کمرے کے دروازے پر کوئی دستک دے رہا تھا۔ میں نے جلدی سے اپنا سوٹ کیس اٹھا کر الماری کی آڑ میں رکھ دیا۔ شاید یہ میرے دل کا چور ہی تھا جس نے مجھے ایسا کرنے پر مجبور کیا تھا ورنہ کسی کو کیا پڑی تھی کہ مجھ سے سوٹ کیس کے بارے میں پوچھتا۔ دروازہ کھولنے پر مجھے سردارے کی منحوس شکل نظر آئی۔ وہ اپنی عادت کے مطابق مونچھوں کو بل دے رہا تھا۔

''تمہیں چوہدری صاحب بلا رہے ہیں شہباز! میرے ساتھ چلو۔'' سردارے نے مجھے مخاطب کیا۔

''میں تو حکیم جی کے یہاں دوا لینے جا رہا تھا۔'' میں نے اپنے منصوبے کے مطابق تمہید باندھی۔ ''بخار سا ہو رہا ہے۔''

''شہباز! ٹھیک ہو جاؤ کیوں کہ تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہے۔'' سردارے بولا۔

''ٹھیک ہونا میرے ہاتھ میں تو نہیں۔'' میں نے کہا، پھر سب کچھ جانتے بوجھتے سوال کیا۔ ''چلنا کہاں ہے؟''

''ابھی کچھ طے نہیں کہ کدھر چلنا ہے۔ دراصل ہم تمہیں نہ لے جاتے مگر ہماری جیپ کی بیٹری ڈاؤن ہو گئی ہے اور اپنی جیپ کے نخرے تمہی اٹھا سکتے ہو۔'' یہی باتیں کرتے ہوئے ہم دونوں چوہدری اسلم کے کمرے میں پہنچ گئے۔ چوہدری اسلم نے سردارے کو مخاطب کیا۔ ''اگر تُو شہباز کو بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے تو اسے بھی ساری بات بتانی پڑے گی تاکہ یہ ہوشیار اور چوکنا رہے۔ ایسا کوئی کام اس سے پہلے لیا نہیں......''

میں جیسے سن کر بھی کچھ نہیں سن رہا تھا۔ ناہید کی تلاش میں جو قاتل روانہ ہو رہے تھے، اب ان میں میرا نام بھی شامل تھا۔ میرا دل بیٹھنے لگا۔

اسی حالت میں مجھے ذرا توقف سے چوہدری اسلم کی آواز پھر سنائی دی۔ وہ میرے بارے میں اپنے ''شکرے'' سردارے سے پوچھ رہا تھا۔

''شہباز جی تو نہیں چھوڑ بیٹھے گا؟ تُو نے یہ بھی سوچ لیا ہے؟''

''ناں جی چوہدری صاحب! بندہ یہ بھی کام ہی کا ہے۔ آپ اسے ایک موقع تو دے کر دیکھیں۔'' سردارے نے گویا میری سفارش کی۔

''میرا تو خیال یہ تھا سردارے کہ خود تُو ہی اس کی جیپ لے جاتا۔'' چوہدری اسلم کے چہرے سے تذبذب کا اظہار ہونے لگا۔ ''میری بات مان، اسے پھر کبھی کسی اور معاملے میں موقع مناسب دیکھ کر آزمالیں گے۔''

پھر اس سے پہلے کہ سردارے جواب میں کچھ کہتا، میں بول اٹھا۔ ''چوہدری صاحب! میری طبیعت ویسے بھی ٹھیک نہیں۔ میں نے سردارے کو بھی بتایا تھا۔''

چوہدری اسلم نے یہ سنتے ہی اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ''سردارے! رہنے ہی دے اسے۔ یہ ایسا ہی معاملہ ہے کہ میں کسی قسم کا کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا۔''

''جو حکم چوہدری صاحب!'' سردارے مان گیا۔ ''میں تو اس لیے اسے ساتھ لے جا رہا تھا کہ انجن کی چھوٹی موٹی خرابی یہ خود ہی ٹھیک کر لیتا ہے۔''

''ویسے بھی یہ بات جتنے کم لوگوں کو معلوم ہو، اچھا ہے۔'' چوہدری اسلم نے کہا اور پھر ہم دونوں کو جانے کا اشارہ کیا۔

''چوہدری صاحب! دوا پی کر میں آج رات جلد سو جاؤں گا، کوئی کام......''

''ٹھیک ہے۔'' چوہدری اسلم نے میری بات کاٹ دی۔ ''جا، کوئی کام وام نہیں۔ اگر کام ہوا بھی تو حویلی میں ایک تُو ہی نہیں اور بھی کارندے موجود ہیں۔''

چوہدری اسلم کا شکریہ ادا کر کے سردارے کے ساتھ میں باہر آ گیا تو اس نے مجھ سے

جیپ کی چابی مانگی۔ میں نے کہہ دیا۔ ''چابی میرے کمرے میں ہے، صبح لے لینا! اس وقت تو مجھے دوا لے آنے دو!'' سردارے نے تاکید کی۔

''تم فکر نہ کرو، تمہاری پہلی ہی دستک پر میں کمرے کا دروازہ کھول دوں گا۔'' میں نے یہ کہہ کر اسے اطمینان دلا دیا۔

اقرار میں ہلا کر سردارے ایک طرف چلا گیا۔ میں اپنے جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر گھوم گھام کر میں حویلی کی طرف لوٹا تو مسجد سے عشاء کی اذان سنائی دے رہی تھی۔ کپڑے بدل کر ابھی مجھے وضو بھی کرنا تھا اس لیے تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔

حویلی میں داخل ہوتے وقت میں دعا کر رہا تھا کہ کہیں سردارے نہ مل جائے۔ ایسی صورت میں وہ جیپ کی چابی لینے میرے ساتھ ہو لیتا۔ ناہید کا سراغ لگانے کے بعد مجھے جیپ کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ میں اسی لیے سردارے کو چابی دینا نہیں چاہتا تھا۔ چوکنا انداز میں اردگرد کا جائزہ لیتا ہوا میں اپنے کمرے تک پہنچ گیا۔ سردارے سے مڈبھیڑ نہ ہونے پر میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکریہ ادا کیا۔ کپڑے بدلنے اور وضو کرنے میں مجھے دیر نہ لگی۔

میں کبھی کبھار جمعے کو یا عید بقرعید نماز پڑھنے چلا جاتا تھا۔ حویلی میں کبھی میں نے نماز نہیں پڑھی تھی۔ میرے کمرے میں اسی لیے جا نماز نہیں تھی۔ جا نماز کی جگہ میں نے دھلی ہوئی ایک چادر بچھائی اور پہلے عشاء کی نماز پڑھی۔ نماز پڑھ کر میں نے اپنی کامیابی کے لیے صدق دل سے دعا کی، پھر سوٹ کیس کھول کر ڈائری نکال لی۔ ڈائری کا مطلوبہ ورق میں نے شام ہی کو موڑ دیا تھا تاکہ وظیفہ تلاش کرنے میں دشواری نہ ہو۔ وظیفہ محض چند الفاظ پر مشتمل تھا جنہیں میں نے یاد کر لیا۔ اب میرے سامنے گنتی کا مسئلہ تھا۔ وہ الفاظ مجھے سوا لاکھ دفعہ پڑھنے تھے۔ اس کے لیے میں نے کاغذ قلم اپنے پاس رکھ لیا کہ اس پر تعداد لکھتا جاؤں۔ ایک سو کے لیے میں نے ایک لکیر مقرر کی۔ اسی طرح ایک ہزار کے لیے ایک دائرہ بنانے کا فیصلہ کیا۔ ان دائروں کی تعداد جب ایک سو پچیس ہو جاتی تو مجھے اپنا وظیفہ ختم کر کے آنکھیں بند کرنی تھیں۔

اللہ کا نام لے کر میں نے وظیفہ پڑھنا شروع کیا۔ مجھے یقین تھا کہ میں مقررہ وقت میں وظیفہ ختم کر لوں گا۔ وقت دیکھنے اور اس کے لحاظ سے جلدی یا اطمینان کے ساتھ وظیفہ پڑھنے کی خاطر میں نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی بھی قریب ہی رکھ لی تھی۔

گیارہ بجنے سے پہلے ہی سو دائرے میں نے کاغذ پر گنے۔ اس کا مطلب تھا کہ میں ایک لاکھ مرتبہ وظیفے کے الفاظ پڑھ چکا ہوں۔ اب صرف پچیس ہزار مرتبہ وہ الفاظ مجھے اور پڑھنے تھے۔ احتیاطاً میں نے مزید تیزی کے ساتھ وظیفہ پڑھنا شروع کر دیا۔ کاغذ پر دائروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ بارہ بجنے میں سولہ منٹ باقی تھے کہ وظیفہ پورا ہو گیا اور میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ میرے جسم میں اس وقت سنسنی سی پھیلی ہوئی تھی۔ زندگی میں پہلی بار میں ایک پُراسرار تجربے سے گزرنے والا تھا۔

چند لمحوں کے بعد ایک غیر انسانی سی گونج دار آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ''لکھن پور۔''

اس آواز کی گونج ختم ہوتے ہی میری بند آنکھوں میں ایک منظر واضح ہو گیا۔ یہ ایک گاؤں کا منظر تھا۔ گاؤں کے کنارے میں مجھے ایک پن چکی نظر آئی۔ اسی کے قریب ایک گھر تھا۔ گھر کی دیواریں زیادہ اونچی نہیں تھیں۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے اس گھر کی دیوار کے پاس جیپ روکی ہو اور پھر دیوار پر چڑھ کر اندر کود گیا ہوں۔ سامنے ہی کچھ فاصلے پر مجھے ایک بند دروازہ دکھائی دیا۔ دروازے کی کنڈی باہر سے لگی ہوئی تھی۔ بائیں جانب بھی مجھے ایک دروازہ نظر آیا جو کھلا ہوا تھا۔ اندر میں نے لالٹین کی روشنی دیکھی۔ دروازے کے قریب ہی ایک چارپائی پر کوئی شخص چادر اوڑھے سو رہا تھا۔ لالٹین اسی چارپائی کے سرہانے زمین پر رکھی تھی۔ ادھر سے نظر ہٹاتے ہی مجھے ایک اور حیرت ناک تجربہ ہوا۔ مجھے یوں لگا کہ سامنے والے بند دروازے سے گزر کر میں اندر کمرے میں پہنچ گیا ہوں۔ وہاں میں نے ایک پلنگ پر اپنی قرار جاں ناہید کو سوتے ہوئے دیکھا۔ وہ دائیں جانب کروٹ لیے ہوئی تھی۔ وہاں مجھے کوئی لالٹین دکھائی نہیں دی۔ یہ امر بھی میرے لیے پُراسرار ہی تھا کہ اندھیرے کے باوجود مجھے سب کچھ واضح نظر آ رہا تھا۔

پھر اسی طرح واپسی کا سفر شروع ہوا اور میں اس گاؤں لکھن پور سے اپنے گاؤں واپس آ گیا۔ اسی کے ساتھ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میرے گاؤں سے لکھن پور تقریباً پچیس تیس میل کے فاصلے پر ہو گا۔ اگر اس پُراسرار تجربے کے دوران میں مجھے وہاں تک پہنچنے کا راستہ معلوم بھی نہ ہوتا تو میرے لیے وہاں تک پہنچنا مشکل نہیں تھا۔ میں وہاں گزشتہ انتخابات کے وقت جا چکا تھا۔ وہ گاؤں چوہدری اسلم کے حلقہ انتخاب میں شامل تھا۔ اب صرف آخری مرحلہ باقی رہ گیا تھا، یعنی حویلی سے فرار!

اس سلسلے میں بھی پہلے ہی میں نے سوچ لیا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ حویلی کے پھاٹک

سے لگی ہوئی چوکیدار کی کوٹھری تھی۔ رات کو وہ کوٹھری کے اندر ہی سوتا تھا۔ اگر میں باہر سے اس کی کوٹھری کا دروازہ بند کر دیتا تو وہ مجھے نہ دیکھ پاتا، نہ مجھ سے کوئی سوال کر پاتا کہ اتنی رات کو جیپ لے کر کہاں جا رہا ہوں! پھر پھاٹک کھول کر فرار ہونے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہ آتی۔

حویلی ہی کے احاطے میں دونوں جیپیں اور چوہدری اسلم کی کار کھڑی کی جاتی تھی۔ اپنی جیپ اسٹارٹ کر کے مجھے حویلی کے پھاٹک سے نکلنا تھا۔ پھر میرے لیے کوئی خطرہ نہ ہوتا۔

سوٹ کیس میں ڈائری رکھ کر میں نے اسے بند کیا اور اپنے کمرے پر آخری نظر ڈالی۔ میں ہمیشہ کے لیے وہ در و دیوار چھوڑ کر جا رہا تھا۔ اپنا سوٹ کیس ہاتھ میں اٹھاتے ہی اچانک مجھے خیال آیا کہ ایک ضروری چیز تو میں اپنی الماری میں چھوڑے ہی جا رہا ہوں۔ گزشتہ انتخابات میں چوہدری اسلم نے مجھے ریوالور دلوایا تھا جسے میں نے چلانا بھی سیکھ لیا تھا۔ ریوالور کا لائسنس بھی میرے پاس تھا۔ میں نے سوٹ کیس زمین پر رکھ دیا اور الماری سے ریوالور کے ساتھ اس کی گولیاں بھی لے لیں۔ ریوالور لوڈ کر کے میں نے سوٹ کیس میں رکھ لیا۔ کسی بھی آڑے وقت میں وہ ریوالور میرے کام آ سکتا تھا۔ سوٹ کیس ہاتھ میں اٹھائے ہوئے اپنے کمرے کا دروازہ آہستگی سے کھول کر میں باہر آ گیا۔

حویلی میں ہر طرف خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ میں دبے قدموں صدر دروازے کی طرف بڑھتا رہا۔ ایک ایک راستہ میرا دیکھا بھالا تھا اس لیے اندھیرا ہونے کے باوجود مجھے صدر دروازے تک پہنچنے میں کوئی وقت نہیں ہوئی۔ صدر دروازہ کھول کر باہر آتے ہی اسے میں نے بھیڑ دیا اور برآمدے سے گزر کر سیڑھیاں اترنے لگا۔

حویلی کے احاطے میں ٹھنڈی اور پرسکون چاندنی دکھائی دی۔ وہ چڑھتے چاند کی شاید بارہ یا تیرہ تاریخ تھی۔ باہر جتنا سکون تھا، میرے اندر اتنا ہی ہیجان برپا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے کسی بھی لمحے چوہدری اسلم حویلی کا صدر دروازہ کھول کر باہر آ جائے گا اور میں پکڑ لیا جاؤں گا۔ میرے لیے ایک ایک قدم اٹھانا دشوار ہو رہا تھا، سارے جسم میں خوف کی لہر سی دوڑ رہی تھی۔ بڑی احتیاط کے ساتھ میں اپنی جیپ تک پہنچا اور ڈرائیونگ سیٹ کے برابر والی نشست پر سوٹ کیس رکھ دیا۔ پھر میں پنجوں کے بل مزید چوکنا ہو کر چوکیدار کی کوٹھری کا دروازہ باہر سے بند کرنے کے لیے آگے بڑھا۔

چوکیدار کو میں نے کوٹھری میں بے خبر سوتے ہوئے پایا۔ میں نے آہستگی کے ساتھ

کوٹھری کا ادھ کھلا دروازہ بند کیا اور باہر سے کنڈی لگا دی۔

چوکیدار کی طرف سے مطمئن ہو کر میں نے حویلی کے پھاٹک کی بھاری کنڈی کھولی اور اس کے دونوں وزنی پٹ بھی دھیرے دھیرے پورے کھول دیے تاکہ آواز نہ ہو۔ واپس اپنی جیپ تک پہنچنے میں مجھے زیادہ دیر نہ لگی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہی جیب سے چابی نکال کے میں نے ذرا سی دیر میں جیپ اسٹارٹ کر دی۔ جیپ کے انجن کی آواز سے سناٹا مجروح ہو گیا۔ اسی کے ساتھ میرے جسم کے سارے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے تیزی سے جیپ کو ریورس میں لے کر اسے پھاٹک کی طرف موڑا اور پھر کمان سے چھوٹے ہوئے کسی تیر کی طرح پھاٹک سے باہر آ گیا۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ اس طرح رات کے وقت پھاٹک کھلا چھوڑ کر نہ جاؤں، مگر اس پر عمل نہ کیا۔ اب میں وہاں رک کر خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھا۔ اپنے اس طرح فرار ہونے پر مجھے حیرت تھی اور میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ کوئی میرے بارے میں تصور تک نہیں کر سکتا کہ یوں بھی حویلی سے خاموشی کے ساتھ کسی رات بھاگ سکتا ہوں۔ اسی حویلی میں تو میری پرورش ہوئی تھی، وہیں پل کر تو میں جوان ہوا تھا، پھر کس طرح وہاں سے فرار ہو جاتا!

میں کچھ ہی دیر میں گاؤں کی حدود سے نکل کر لکھن پور جانے والے راستے پر آ گیا۔ یہی راستہ مجھے پراسرار تجربے کے دوران میں بھی نظر آیا تھا۔ لکھن پور کی طرف تیز رفتاری سے میرا سفر جاری تھا لیکن اس سے بھی زیادہ میرا ذہن تیز رفتاری دکھا رہا تھا۔ مجھے اپنے بچپن کا ایک دوست ارشد یاد آ گیا۔ کئی برس پہلے اس کے والدین گاؤں سے اپنی زمین بیچ کر بہاولپور میں جا بسے تھے۔ وہاں جا کر شروع شروع میں ارشد نے مجھے کچھ خط لکھے تھے۔ میں نے بھی اس کے خطوں کے جواب دیے تھے پھر خطوط میں لمبے وقفے آنے لگے۔ تقریباً ایک سال سے نہ ارشد نے مجھے کوئی خط لکھا تھا، نہ میں نے۔ اس کا پتا مجھے زبانی یاد تھا۔ وہ فرید گیٹ کے کوچہ گل حسن میں رہتا تھا۔ ناہید کو لے کر فوری طور پر میں اپنے دوست ارشد کے گھر میں پناہ لے سکتا تھا، بعد میں جو ہوتا دیکھا جاتا۔

ارشد کا خیال آنے سے میرا ایک بہت بڑا مسئلہ حل ہو گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ چوہدری اسلم جیسا منتقم مزاج شخص میرے فرار ہونے پر خاموش نہیں بیٹھے گا۔ میری تلاش میں وہ ہر طرف اپنے پالتو کتے دوڑا دے گا۔ ان حالات میں یہی بہتر تھا کہ میں اپنے گاؤں سے حتی الامکان دور چلا جاؤں۔ بہاولپور بہر حال میرے گاؤں سے بہت دور تھا۔ اول تو چوہدری اسلم کے ذہن میں یہ خیال ہی نہ آتا کہ میں وہاں جا سکتا ہوں، پھر اگر یہ خیال اسے آ بھی

جاتا تو بہاولپور شہر اس کے حلقہ اثر سے خاصا دور تھا۔

سارے راستے میں یہی باتیں سوچتا رہا۔ میرے فرار کا علم صبح ہونے سے پہلے مشکل ہی تھا۔ پھر چوہدری اسلم کے لیے یہ سمجھنا بھی دشوار ہو جاتا کہ میں نے راہِ فرار کیوں اختیار کی ہے! اس بھری پُری دنیا میں چوہدری اسلم کے سوا میرا اور تھا بھی کون! میں جاتا بھی تو کہاں اور کس لیے! اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ میرے لیے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ترین ہستی خود اس کی بیٹی ہے جس کی خاطر میں سب کچھ چھوڑ سکتا ہوں۔ میری منزل اب قریب آتی جا رہی تھی۔ میں اسی لیے خیالوں کے حصار سے باہر نکل آیا اور چوکنا ہو گیا۔ چاندنی رات میں فاصلے کے باوجود مجھے آبادی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ مجھے اپنی جیپ مطلوبہ مکان تک لے جانی تھی تاکہ میں نے پُراسرار تجربے کے دوران میں جو منظر دیکھا تھا، اس پر عمل کر سکوں۔ وہ مکان کہ جس کے ایک کمرے میں میری زندگی، میری ناہید قید تھی، اگر گاؤں کے کنارے نہ ہوتا تو شاید مجھے مشکل پیش آتی۔ یقیناً قدرت میرا ساتھ دے رہی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں ایک مظلوم و بے گناہ ہستی کو قتل ہونے سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔

چاندنی میں مجھے پن چکی دور ہی سے نظر آ گئی۔ اسی کے قریب وہ مکان تھا جس کی دیوار پر چڑھ کر مجھے اندر کودنا تھا۔ میں نے جیپ کی رفتار تھوڑی کم کر دی اور پھر اسے کچے میں اتار لیا۔ مکان کی دیوار سے لگا کر کھڑا کیا اور اس کا انجن بند کر دیا۔ دور سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں قریب آتی جا رہی تھیں۔ جیپ کے انجن کی آواز سن کر ہی شاید وہ اس طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ میں نے اس خطرے کے بارے میں پہلے سے کچھ نہیں سوچا تھا۔ کتے زور زور سے بھونک کر گاؤں والوں کو گہری نیند سے جگا بھی سکتے تھے۔ میں نے سوچا کہ اب تو جو بھی ہو دیکھا جائے گا۔

پھر مزید ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر میں کھڑا ہوا اور دیوار پر چڑھ گیا۔ تصور کی آنکھ سے میں نے جو منظر دیکھا تھا، وہی منظر اب مجھے جاگتی آنکھوں سے دکھائی دے رہا تھا۔ دیوار اتنی چوڑی تھی کہ میں اس پر بہ آسانی بیٹھ کر دوسری طرف گھر کے اندر لٹک گیا۔ میرے پیروں اور صحن کے کچے فرش کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ میں نے ایک نظر نیچے دیکھا اور پھر کود گیا۔

اپنے گاؤں کی حویلی سے فرار ہوتے وقت میں نے جس تدبیر پر عمل کیا تھا، اسی کو یہاں آزمایا۔ بائیں جانب جس کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا، میں دبے قدموں سانس

روکے اس میں داخل ہوا اور لالٹین اٹھا لی۔ میں یہ بھولا نہیں تھا کہ ناہید جس کمرے میں بند ہے، وہاں اندھیرا ہوگا۔ اندھیرے میں کسی کے جگانے اور قریب آنے پر ناہید گھبرا کر چیخ بھی سکتی تھی۔ وہ مکان ہر چند کہ گاؤں کی آبادی سے الگ تھلگ تھا پھر بھی وہاں ایک شخص تو موجود تھا۔ پہلے میں نے اسی کا بندوبست کیا۔ وہاں سے لالٹین اٹھا کر خاموشی کے ساتھ میں باہر آ گیا۔ دروازہ بند کر کے باہر سے میں نے کنڈی لگا دی۔

خود کو فوری طور پر پیش آنے والے خطرے سے محفوظ کر کے میں سامنے والے کمرے کی طرف بڑھا جس کی کنڈی باہر سے بند تھی۔ آہستگی سے کنڈی کھول کر میں نے دروازے پر اپنے ہاتھ کا ہلکا سا دباؤ ڈالا۔ دروازہ اندر کی طرف کھلتا چلا گیا۔ لالٹین کی روشنی میں دیوار کے ساتھ بچھے ہوئے پلنگ پر مجھے ناہید اسی طرح کروٹ لیے سوتی ہوئی نظر آئی جس طرح میں نے اسے پُراسرار تجربے کے دوران میں بند آنکھوں سے دیکھا تھا۔

پلنگ سے تھوڑے فاصلے پر رک کر میں نے دھیمی آواز میں پکارا۔ ''بی بی جی!...... بی بی جی!''

اسے پوری شدت کے ساتھ چاہنے کے باوجود میرے اندر اتنا حوصلہ نہ ہوا کہ اس کے جسم کو ہاتھ لگا سکتا۔ جب وہ میرے آوازیں دینے پر نہیں جاگی تو میں اور آگے بڑھا۔ اب میں اس کے بالکل قریب کھڑا تھا۔ چند لمحے توقف کے بعد میں نے اسے نام لے کر آواز دی۔ آواز دیتے ہوئے میں تھوڑا سا جھک بھی گیا تھا۔ اس غارت گر ہوش کو میں نے آخری بار بہت دیکھا تھا۔ یہ اس وقت کی بات تھی جب اسے اغوا کیا گیا تھا۔ حالانکہ اس واقعہ کو آٹھ نو مہینے سے زیادہ نہیں ہوئے تھے مگر مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے اسے دیکھے صدیاں گزر گئی ہوں۔ میرے دل کی حالت اس وقت عجیب سی تھی۔

''ناہید بی بی!'' میں نے ایک مرتبہ پھر اسے قدرے زور سے آواز دی۔ زیادہ دیر میرا وہاں رکنا خطرے سے خالی نہیں، مجھے اس کا پورا احساس تھا۔

اس بار میری آواز کا ردعمل ظاہر ہونے میں دیر نہ ہوئی۔ ناہید نے آنکھیں کھول دیں۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے سے شدید حیرت کا اظہار ہوا۔ چند لمحے اس کی نظریں یوں میری طرف اٹھی رہیں جیسے اسے اپنی بصارت پر یقین نہ ہو۔

''اٹھیے ناہید بی بی!...... جلدی کیجئے، ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا ہے۔'' میں نے اسے پھر مخاطب کیا۔

''تم...... تم شہباز!...... مگر......'' وہ ہکلا کر رہ گئی۔

"ہاں میں شہباز ہوں بی بی جی! آپ کوئی خواب نہیں دیکھ رہیں۔" میں نے اس کی کیفیت دیکھ کر کہا۔

"لیکن تم..... تم یہاں کیسے..... کس طرح آ گئے؟..... اور وہ..... وہ خیرو....."

"بی بی جی! اسے میں نے برابر والے کمرے میں بند کر دیا ہے۔ آپ بالکل نہ گھبرائیں۔ خیرو اب آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔" میں نے اسے یقین دلایا، پھر بولا۔ "میں آپ کے تمام سوالوں کا جواب دے دوں گا لیکن پہلے یہاں سے نکل چلیں۔ یہاں ہم کسی بھی وقت خطرے سے دوچار ہو سکتے ہیں۔" میں سمجھ گیا کہ برابر والے کمرے میں سونے والے شخص کا نام خیرو ہے۔ اسے میں نے پہلی بار ہی دیکھا تھا۔

وہ مزید کچھ کہے بغیر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ مجھے یہ دیکھ کر دکھ ہوا کہ اس کے جسم پر میلے کپڑے تھے۔ ایسے میلے کپڑوں میں اسے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پلنگ ہی پر سرہانے کی طرف ایک چادر رکھی تھی۔ وہ چادر بھی میلی اور کئی جگہ سے پھٹی ہوئی تھی۔ ناہید نے اسی کو اوڑھ لیا۔ لعل تو گدڑی میں بھی نہیں چھپتے۔ ناہید پر اس وقت یہی مثل صادق آ رہی تھی۔ میلے کپڑوں میں اس کا حسن ماند نہیں پڑا تھا۔ چادر اوڑھ کر اس کمرے سے باہر نکلنے کے لیے ناہید میرے ساتھ دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی کہ اچانک برابر والے کمرے کا دروازہ پیٹا جانے لگا۔ یقیناً برابر والے کمرے میں سویا ہوا خیرو جاگ اٹھا تھا۔ ناہید کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ اس کے چہرے پر خوف کے آثار تھے۔

"وہ..... وہ خیرو....." ناہید ہکلائی۔

"اس کی پروا بالکل نہ کریں بی بی جی!" میں نے ہمت کر کے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اسی کے ساتھ میرے سارے وجود میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ اس کا ہاتھ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ پکڑا تھا۔ اپنی حالت اور جذبات کی شدت پر قابو پاتے ہوئے میں نے اسے تسلی دی۔

"میں آپ کو بتا چکا ہوں ناہید بی بی کہ اس کمرے کا دروازہ باہر سے بند ہے، چلئے، جلدی کیجئے! قدم اٹھائیے!"

"ٹھیک..... ٹھیک ہے..... چل..... چلتی ہوں۔" ناہید رک رک کر بولی۔

میں نے محسوس کر لیا وہ خیرو سے کچھ زیادہ ہی خوفزدہ تھی۔ میرے ساتھ چلتے ہوئے اس کے پیر کانپ رہے تھے۔ اسے میرے سہارے کی ضرورت تھی۔ میں اگر اس کا ہاتھ تھام کر سہارا نہ دیتا تو شاید وہ قدم قدم اٹھانے سے بھی قاصر ہی رہتی۔ ابھی تک خیرو دروازہ دھڑ دھڑائے جا رہا تھا۔

"دروازہ کھولو!..... کھولو دروازہ!" خیرو نے اب چیخنا بھی شروع کر دیا تھا۔ معلوم نہیں اس بدبخت کی آنکھ کیسے کھل گئی تھی!

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ناہید کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اسے ساتھ لیے گھر کے دروازے تک آ گیا۔ دروازے کی کنڈی کھول کر میں نے اطراف کا جائزہ لیا۔ دور دور تک مجھے کوئی دکھائی نہ دیا۔ کتے بھی بھونک بھونک کر واپس چلے گئے تھے۔

ناہید کا ہاتھ تھامے ہوئے میں گھر سے باہر نکل آیا۔ مزید احتیاط کے طور پر میں نے گھر کا دروازہ بھی باہر سے بند کر دیا۔ اندر سے خیرو کے چیخنے اور دروازہ پیٹے جانے کی آوازیں اب تک آ رہی تھیں۔ مجھے اس کی کوئی فکر نہیں تھی کیوں کہ خاصے فاصلے تک وہاں کوئی اور مکان نہیں تھا۔

خیرو کو اب اسی وقت قید سے رہائی ملتی جب آئندہ روز صبح قریبی پن چکی کھلتی۔

بائیں جانب مڑ کر جلد ہی میں اپنی جیپ تک پہنچ گیا۔ اپنا سوٹ کیس اٹھا کر میں نے پیچھے رکھ دیا تا کہ ناہید آگے بیٹھ سکے۔ اس کے جسم پر اب بھی لرزہ طاری تھا۔ میں نے اسے جیپ پر چڑھنے میں مدد دی۔ وہ سیٹ پر بیٹھ گئی تو پھر میں بھی سامنے سے گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔

مجھے اب تک یقین سا نہیں آ رہا تھا کہ میں نے ناہید کی زندگی بچالی ہے اور اسے قید سے رہائی دلا کر اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔

میں نے جیپ اسٹارٹ کی اور پھر ذرا سی دیر میں اسی سڑک پر آ گیا جس پہ چل کر وہاں تک پہنچا تھا۔ جیپ کو واپس گاؤں کی طرف لے جانے کے بجائے میں نے اسے سیدھا ہی دوڑانا شروع کر دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ دس بارہ میل آگے اسی سڑک پر ایک ریلوے اسٹیشن ہے جہاں سے بہاولپور جانے کے لیے کوئی ٹرین مل سکتی ہے۔ فی الحال بہاولپور ہی میری منزل تھی۔

ابھی تک ناہید بالکل خاموش تھی۔ اس نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا تھا، لیکن میرے لیے اب چپ رہنا مشکل ہو گیا۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ اغوا ہونے کے بعد اس پر کیا گزری؟ میں یہ بات بھی نہیں بھولا تھا کہ خیرو سے اس کی شادی ہو چکی ہے۔ اس کے باوجود میں اسے اپنانے پر راضی تھا۔ میرے لیے یہ رنج کی بات تو ضرور تھی کہ اب وہ کنواری نہیں رہی مگر ایسا ہونے میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ اس کے ساتھ زبردستی ہوئی تھی۔ اسے دلہن بننے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔

پھر سب سے پہلے میری زبان پر یہی سوال آیا۔ ''بی بی جی! کیا انہوں نے زبردستی خیرو سے آپ کی شادی کرادی تھی۔''

''شادی؟...... کیسی شادی؟'' وہ چونک کر بولی۔ ''اگر...... اگر شہباز، تم نے کچھ...... کچھ ایسی تصویریں دیکھی ہیں تو...... تو وہ...... وہ محض ایک ڈھونگ تھا...... فریب...... کھلا فریب!''

اس مرتبہ چونکنے کی باری میری تھی۔ میں نے کہا۔ ''لیکن بی بی جی، یہ سب کس طرح ہوا؟''

''انہوں نے مجھے زبردستی دلہن بنا کر پہلے صرف میری تصویریں، پھر خیرو کے ساتھ تصویریں کھینچی تھیں۔ مجھے دلہن بنا کر ایک کمرے میں مسہری پر بٹھا دیا گیا تھا۔ وہ کمرا اسی طرح سجایا گیا تھا جیسے...... جیسے وہاں سہاگ......'' ناہید کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

اس کے ادھورے جملے سے پورا مطلب سمجھ لینا میرے لیے مشکل نہ ہوا۔ وہ چپ رہی تو میں نے پوچھا۔ ''پھر...... پھر کیا ہوا بی بی جی؟''

''پھر اچانک دبے پاؤں کوئی کمرے میں داخل ہوا۔'' ناہید بتانے لگی۔ ''میں نے دیکھا وہ خیرو تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر میرا گھونگٹ اٹھا دیا۔ اسی لمحے روشنی کا جھماکا ہوا اور اس حالت میں میری تصویر کھینچ لی گئی۔ اس کے بعد مجھ سے کپڑے بدلنے کو کہا گیا۔ خیرو اس کمرے سے جا چکا تھا۔ دلہن بنائے جانے سے پہلے خیرو نے مجھے خوب مارا پیٹا تھا کیوں کہ میں نے دلہن بننے سے انکار کر دیا تھا۔ دوبارہ اس کی مار پیٹ سے بچنے کے لیے میں نے کپڑے بدلنے پر ضد نہیں کی۔ عورتیں مجھے ایک اور کمرے میں لے آئیں۔ خیرو میرے برابر آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں نظریں جھکائے کھڑی رہوں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ پھر خیرو کے ساتھ میری ایک اور تصویر کھینچ لی گئی۔ میں فیصلہ کر چکی تھی کہ...... کہ اگر خیرو نے حد سے آگے بڑھنے کی کوشش میں کوئی غلط قدم اٹھایا تو...... تو اپنی جان دے دوں گی، مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔''

ناہید سے یہ سن کر کہ وہ تصویریں محض ایک فریب تھیں، خیرو سے اس کی شادی نہیں ہوئی، میرا دل تیزی کے ساتھ دھڑکنے لگا۔ میرے لیے یہ ایک بہت بڑی خوش خبری تھی کہ ناہید کی عزت و آبرو محفوظ ہے۔

''بی بی جی! آپ کو اغوا کرنے کے بعد کہاں لے جایا گیا تھا؟'' میں نے دریافت کیا۔

''یہ تو مجھے ٹھیک طرح نہیں معلوم کہ وہ کون سی جگہ تھی، ہاں اتنا احساس ضرور ہوا کہ وہ کسی بڑی حویلی کا حصہ ہے۔ مجھے وہیں ہوش آیا تھا۔ فائرنگ شروع ہوتے ہی میں جیپ سے کود کر ایک طرف بھاگی تھی۔ تم اس وقت تک جیپ روک چکے تھے۔ میں دوڑتی ہوئی جنگل میں گھسی ہی تھی کہ ڈھاٹا باندھے ہوئے چند مسلح افراد نے مجھے دبوچ لیا تھا۔ پھر انہی میں سے ایک نے میرے منہ پر رومال رکھ دیا اور میں بے ہوش ہو گئی۔ رومال پر یقیناً بے ہوشی کی دوا چھڑکی گئی ہوگی۔'' ناہید مجھے اپنے اغوا کی روداد سنانے لگی۔ ''جس کمرے میں مجھے ہوش آیا، وہ خاصا بڑا تھا۔ میں ایک آرام دہ مسہری پر دراز تھی۔ ضرورت کی ہر چیز مجھے وہاں نظر آئی۔ میں نے اٹھ کر کمرے میں جائزہ لیا۔ اس میں کھڑکیاں تو تھیں مگر اندر سے انہیں کھولنا ممکن نہیں تھا۔ وہ دوسری جانب سے بند تھیں۔ کمرے میں ایک روشن دان بھی تھا لیکن اتنی بلندی پر کہ وہاں تک پہنچا نہ جا سکے۔ اس میں بھی آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ اگر میں کسی طرح اس تک پہنچ بھی جاتی تو سلاخوں کی وجہ سے باہر نہ نکل پاتی۔ اس روشن دان کا مقصد کمرے میں محض ہوا کا گزر تھا۔ کمرے کے دروازے کو میں پہلے ہی دیکھ چکی تھی کہ بند ہے۔ پھر بھی میں نے اسے ہلایا جلایا لیکن اس سے کچھ حاصل نہ ہوا۔ دائیں جانب مجھے ایک اور دروازہ نظر آیا تو اسے کھول کر دیکھا۔ وہ واش روم تھا۔ وہاں بھی خاصی بلندی پر ایک روشن دان تھا، مگر اس میں بھی آہنی سلاخیں لگی دکھائی دیں۔ واش روم کا دروازہ بند کر کے میں پلٹی ہی تھی کہ کمرے کا دروازہ کھلا۔ میں نے ایک ادھیڑ عمر عورت اور اس کے ساتھ پہلی مرتبہ خیرو کو دیکھا۔ عورت کے ہاتھ میں کھانے کی ٹرے تھی۔ میں نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔ خیرو آگے بڑھا اور اس نے بڑی بے دردی کے ساتھ میرے سر کے بال پکڑ لیے اور منہ پر زوردار طمانچہ مارتے ہوئے بولا، میرا نام خیرو ہے اور میں نے کسی پر رحم کرنا نہیں سیکھا۔ نخرے چھوڑ دے اور کھانا کھا ورنہ میں تیری کھال ادھیڑ دوں گا۔ جواباً میں بھی اسے نوچنے کھسوٹنے لگی، مگر اس کا نتیجہ میرے حق میں اچھا نہیں نکلا۔ خیرو نے مجھے بہت مارا اور پھر عورت کو ساتھ لیے کمرا بند کر کے چلا گیا۔'' ناہید یہ کہہ کر سانس لینے کو رکی۔

ڈرائیونگ کرتے ہوئے میں نے اس کے چہرے کا جائزہ لیا جس پر دکھوں کی پرچھائیاں رقص کر رہی تھیں۔ چند لمحے رک کر ناہید پھر اپنی بپتا سنانے لگی۔ ''پہلے ہی دن خیرو نے مجھ پر اپنا رعب بٹھا دیا اور میں اس سے ڈرنے لگی۔ وہ...... وہ آدمی نہیں درندہ تھا۔ میں اس کا کوئی حکم ماننے سے ذرا بھی انکار کرتی تو وہ مجھے دھن کے رکھ دیتا۔ اس کے رویے سے مجھے ایسا لگتا تھا جیسے اسے عورت ذات سے انتہائی نفرت ہو۔ بھوک کی وجہ سے اور پھر خیرو کی

مار سے بچنے کے لیے میں نے دوسرے ہی دن صبح کھانا کھالیا۔ خیرو نے اب تک مجھے کوئی
ایسا حکم نہیں دیا تھا جس سے میری غیرت و آبرو کو خطرہ ہوتا لیکن جس روز اس نے یہ حکم دیا کہ
میں دلہن بن جاؤں، میرا ماتھا ٹھنکا۔ اس کے ساتھ کئی عورتیں تھیں۔ وہ عورتیں اپنے لباس کی
وجہ سے اس حویلی کی ملازمائیں ہی لگتی تھیں۔ ان عورتوں کے پاس ایک سرخ جوڑا اور
دوسرے لوازمات تھے۔ وہ مجھے دلہن بنانے آئی تھیں۔ جیسا کہ میں تمہیں پہلے بتا چکی ہوں
دلہن بننے سے انکار پر خیرو نے مجھے بہت مارا۔ عورتیں بھی مجھے سمجھانے لگیں کہ میں، خیرو کی
بات مان لوں، خیرو مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ ان عورتوں نے مجھے یہ بھی یقین دلا
کہ دلہن کے لباس میں میری صرف چند تصویریں کھینچی جائیں گی، اس کے سوا کچھ اور نہیں ہو
گا۔

تن بہ تقدیر میں دلہن بننے پر آمادہ ہو ہی گئی۔ پھر انہی عورتوں نے اس کمرے
سجایا۔ اس دن صرف تصویریں ہی کھینچی گئیں۔ جب خیرو مجھے اس کمرے میں بند کر کے چ
گیا تو میرے دل کو ڈھارس بندھی، عورتوں نے غلط نہیں کہا تھا۔ اسی واقعے کے دوسر
دن، رات کو خیرو نے مجھے سوتے سے جگایا تو میں گھبرا گئی۔ اس نے مجھ سے اپنے ساتھ چلن
کو کہا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ مجھ کہاں لے جارہا ہے؟ جواب تھپڑ کی صورت میں ملا
پھر اس نے میرے منہ پر رومال رکھ کر مجھے ہوش وحواس سے بیگانہ کر دیا۔ شاید وہ سمجھ
چکا تھا کہ بہ آسانی اس کے ساتھ کہیں جانے پر آمادہ نہیں ہوں گی۔ ہوش آنے پر میں نے خو
کو اسی گھر میں پایا جہاں سے تم نے مجھے رہائی دلائی ہے۔''

ناہید اپنی دکھ بھری روداد بیان کر کے خاموش ہوگئی تو میں نے پوچھا۔ ''بی بی جی! مجھ
ایک بات یاد کر کے بتائیں۔''

''پوچھو۔'' ناہید نرمی سے بولی۔

''آپ نے کبھی خیرو سے کوئی سوال نہیں کیا کہ آپ کو کس نے اور کیوں اغوا کرا
ہے؟'' میں نے معلوم کیا۔

''شروع ہی سے میرے ساتھ خیرو کا رویہ ایسا تھا جیسے میں اس کی زر خرید لونڈ
ہوں۔'' ناہید نے جواب دیا۔ ''میں اس سے خوفزدہ رہتی تھی۔ اول تو ان حالات میں اس
سے کچھ پوچھنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی، پھر بھی ایک دفعہ زبان کھولی۔ نتیجہ وہی نکلا جس کا مجھے
ڈر تھا۔ جواب میں مجھے اس کی گندی گندی گالیاں سننی پڑیں۔ اس کے ساتھ اس نے مجھے
دھمکی بھی دی کہ اگر آئندہ میں نے ایسا کوئی سوال کیا تو وہ میری عزت و آبرو خاک میں

دے گا۔ یہ دھمکی ایسی تھی کہ پھر کبھی میں نے اس سے کچھ نہیں پوچھا۔''

''بی بی جی! اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ اس کمینے اور ذلیل آدمی خیرو نے آپ پر اتنے ظلم
ڈھائے ہیں تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑتا۔'' میں پُر جوش آواز میں بولا۔ ''آپ پر کوئی ہاتھ
اٹھا سکتا ہے یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ مجھے پتہ ہوتا تو میں اسے مار ڈالتا۔''

''میں...... میں ہرگز تمہیں ایسا نہ کرنے دیتی شہباز! وہ...... وہ بہت خطرناک آدمی
ہے۔'' ناہید نے خوفزدہ آواز میں کہا۔

''اس سے میں ایک دن بدلہ تو ضرور لوں گا بی بی جی!'' میرے لہجے میں عزم تھا۔
میں اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید بولا۔ ''مجھے اچھی طرح معلوم ہے بی بی جی کہ وہ کس
کا پالتو کتا ہے! میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ کو کس نے اور کیوں اغوا کرایا تھا! خیرو تو محض اس
کا کارندہ ہے۔''

''تمہیں...... اگر تمہیں سب کچھ معلوم ہے شہباز تو...... تو پھر مجھے بھی بتاؤ کہ...... کہ
میرے اغوا میں کس کا ہاتھ تھا؟'' جذباتی ہو کر اس نے میرا بازو پکڑ لیا۔

ناہید کے لمس نے ایک بار پھر میرے جسم میں سنسنی سی دوڑا دی۔ میں نے آہستگی کے
ساتھ اس کا ہاتھ اپنے بازو سے ہٹا دیا اور بولا۔ ''بتا دوں گا بی بی جی! میں...... میں آپ کو سب
کچھ بتا دوں گا، لیکن پہلے ہمیں کہیں سر چھپانے کی جگہ تو مل جائے۔ ابھی آپ کی زندگی
خطرے میں ہے۔'' اسی وقت دور سے ریل کی سیٹی سنائی دی۔ میری منزل قریب آ رہی تھی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟ تم گاؤں چلو گے نا! ہم وہاں تک پہنچ گئے تو کوئی خطرہ نہیں
رہے گا۔ کیا تم گاؤں کی طرف نہیں چل رہے؟'' ناہید نے حیران ہو کر پوچھا۔

''یہ آپ کی بھول ہے بی بی جی! گاؤں پہنچتے ہی نہ صرف آپ کی زندگی کا چراغ گل
کر دیا جائے گا بلکہ میں بھی زندہ نہیں بچوں گا۔'' میں نے جواب دیا۔

''مگر کیوں شہباز؟...... تم کیا کہہ رہے ہو؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔'' ناہید کے
چہرے سے الجھن کا اظہار ہونے لگا۔

''میرے ایک سوال کا جواب دیں بی بی جی! کیا آپ کو مجھ پر بھروسا ہے؟'' میں نے
اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔

''کیوں نہیں! بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے! تم تو بچپن سے میرے ساتھ رہے
ہو۔ اگر تم پر نہیں تو میں کس پر بھروسا کروں گی؟''

''تو پھر بی بی جی، فوری طور پر مجھ سے کچھ نہ پوچھیں۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ میں آپ سے

کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ بس ذرا ہم خطرے کی حد سے نکل جائیں۔"

"شہباز! کیا تم اب بھی کسی طرح کا خطرہ محسوس کر رہے ہو؟ خیرو کو تم نے جس شخص کا کارندہ بتایا ہے، کہیں تمہیں اس کی طرف سے تو خطرہ نہیں؟"

"نہیں بی بی جی! مجھے غیروں سے نہیں، اپنوں کی طرف سے خطرہ ہے۔"

"پھر...... پھر تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو شہباز؟"

"یہاں سے بہت دور بہاولپور۔" میں نے بتایا۔ "وہاں میرا ایک دوست ارشد رہتا ہے۔ عارضی طور پر ہم اسی کے پاس پناہ لیں گے۔"

"تو کیا وہاں تک اسی جیپ میں چلو گے؟" ناہید نے پوچھا۔

"نہیں بی بی جی! جیپ کو ہم یہیں چھوڑ دیں گے کیوں کہ بائی روڈ مجھے بہاولپور پہنچنے تک کا راستہ نہیں معلوم۔ ابھی ذرا دیر پہلے آپ نے شاید ریل کی سیٹی سنی ہو۔ یہاں قریب ہی ایک ریلوے اسٹیشن ہے۔ بہاولپور تک ہم ریل میں سفر کریں گے۔ ممکن ہے راستے میں مجھے آپ کو سب کچھ بتانے کا موقع مل جائے۔"

میرے ارادے سے آگاہ ہونے کے بعد ناہید کہنے لگی۔ "اگر میرے اور تمہارے لیے گاؤں میں بھی خطرہ ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ مجھے تمہارے ساتھ کہیں بھی جانے پر کوئی اعتراض نہیں شہباز! تم پر مجھے مکمل اعتماد ہے۔"

"بہت بہت شکریہ بی بی جی!" میں اس کے اظہار اعتماد پر خوش ہو گیا۔

☆======☆======☆

اس ریلوے اسٹیشن سے قریبی گاؤں کئی میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ گاؤں اور ریلوے اسٹیشن کے درمیان آمد و رفت کی خاطر تانگے استعمال ہوتے تھے۔ میں نے دانستہ اس ریلوے اسٹیشن سے کچھ پہلے ہی جیپ کو کھڑا کر دیا۔ پھر میں اپنا سوٹ کیس اٹھا کر ناہید کے ساتھ لیے ریلوے اسٹیشن کی طرف بڑھ گیا۔

جب ہم وہاں پہنچے تو پلیٹ فارم پر تقریباً سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وہاں دو تین ہی مسافر بنچوں پر بیٹھے دکھائی دیے۔ میں انکوائری کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا۔ ریلوے کی وردی میں ایک شخص کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ ناہید میرے ساتھ ہی تھی۔

"ذرا سنئے جناب!" میں نے اونگھتے ہوئے شخص کو مخاطب کیا۔

وہ شخص اونگھتے اونگھتے یک دم ہڑبڑا کر جاگ اٹھا اور بولا۔ "کیا ہوا؟...... کہاں......

کہاں آگ لگ گئی؟"

اونگھتے ہوئے وہ یقیناً کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔ یہ سوچ کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی اور میں نے اس سے کہا۔ "آگ تو کہیں نہیں لگی جناب! مجھے تو آپ سے یہ معلوم کرنا ہے کہ یہاں سے بہاولپور کے لیے ٹرین کب ملے گی؟"

اس شخص نے سامنے لگے ہوئے وال کلاک کی طرف نگاہ اٹھائی۔ "اس وقت سوا دو بجنے والے ہیں۔ تمہیں ساڑھے تین بجے ایک پسنجر ٹرین مل سکے گی۔"

"یہاں سے کوئی میل ٹرین......"

"یہاں کوئی میل ٹرین نہیں رکتی۔" وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔

"پسنجر ٹرین کب تک بہاولپور پہنچا دے گی؟" میں نے سوال کیا۔

"کل دوپہر دو بجے تک، اگر راستے میں لیٹ نہ ہوئی۔" جواب ملا۔

مجبوری تھی اس لیے میں نے برابر والے کاؤنٹر سے اسی پسنجر ٹرین کے دو ٹکٹ لے لیے۔ ٹرین آنے میں ابھی ایک گھنٹے سے زیادہ تھا۔ میں اسی سبب ناہید کے ساتھ سیمنٹ سے بنی ہوئی ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ پلیٹ فارم پر جو دو تین مسافر تھے، ان کے اور ہمارے درمیان خاصا فاصلہ تھا۔ وہ ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو نہیں سن سکتے تھے۔ غالباً یہی محسوس کر کے ناہید نے گفتگو چھیڑ دی۔

"میرے اغوا کے بعد مجھے تلاش کرنے کی تو بہت کوشش کی گئی ہوگی؟" ناہید نے پوچھا۔ "ابا جی تو بہت پریشان ہوں گے!"

"ہاں بی بی جی، سبھی پریشان تھے۔ میری تو زندگی تھی کہ اس حادثے میں بچ گیا ورنہ کمالے اور جیدے کے جسم تو گولیوں سے چھلنی ہو گئے تھے۔"

اس پر ناہید نے اظہار افسوس کیا۔ اسے کمالے اور جیدے کی موت کا علم نہیں تھا۔ وہ بولی۔ "میں تو بس گولیاں چلتے ہی جان بچانے کے لیے بھاگ اٹھی تھی۔"

میں نے اس کے استفسار پر پیش آنے والے واقعے کی پوری روداد بیان کر دی، پھر بتایا۔ "ہفتے بھر تک آپ کی تلاش جاری رہی اور پھر ایک دن......"

"پھر کیا ہوا؟ بتاؤ نا چپ کیوں ہو گئے؟" ناہید نے بے چینی سے پوچھا۔

"بی بی جی! کیا آپ یقین کریں گی کہ آپ کو مردہ سمجھ کر گاؤں کے قبرستان میں دفنایا جا چکا ہے؟" پھر میں نے گاؤں کے باہر ایک عورت کی لاش ملنے کا پورا واقعہ سنا دیا۔ ناہید پوری توجہ اور انہماک سے میری بات سنتی رہی۔

''اب میں سمجھی کہ خیرو نے مجھ سے زیورات کیوں اتروا لیے تھے اور دوسرے کپڑے مجھے پہننے کو کیوں دیے گئے تھے! لیکن انہوں نے ایسا کیوں کیا؟''

''اس لیے بی بی جی کہ آپ کی تلاش بند کر دی جائے اور یہی ہوا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''آپ کو اغوا کیا جانا ایک گہری سازش تھی۔''

''پھر تو ابا جی اور سب گاؤں والے اب تک مجھے مردہ ہی سمجھ رہے ہوں گے!''

''گاؤں والے تو خیر آپ کو مردہ ہی سمجھتے ہیں لیکن چوہدری صاحب کو پتا چل گیا ہے کہ آپ زندہ ہیں بی بی جی!''

''لیکن ابا جی کو میرے زندہ ہونے کا کیسے پتا چلا؟''

میں نے اپنے کانوں سے جو بھی سنا تھا، سب کچھ من و عن بیان کر دیا۔ یہی میری غلطی تھی۔ مجھے ابھی ناہید کو یہ سب کچھ نہیں بتانا تھا، مگر منہ سے نکلی بات اور کمان سے نکلا ہوا تیر واپس نہیں آتا۔

''کیا...... کیا واقعی ابا جی نے سردارے اور کالیے کو مجھے قتل...... قتل کر دینے کا حکم ......'' یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے ناہید کی آواز بھرا گئی۔ پھر وہ دوسرے ہی لمحے غیر متوقع طور پر تقریباً چیخ اٹھی۔ ''نہیں!...... نہیں شہباز! میں تو ابا جی کی لاڈلی بیٹی......''

میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ پلیٹ فارم پر موجود مسافر ہماری طرف متوجہ ہو سکتے تھے۔

معاً ایک جھٹکے سے ناہید نے میرا ہاتھ اپنے منہ پر سے ہٹا دیا۔ ''مجھے ساری دنیا کو بتانے دو کہ ایک باپ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔'' ناہید پر ہذیانی کیفیت طاری تھی۔ صورت حال کی نزاکت کو محسوس کر کے میں گھبرا گیا کہ ناہید کو کیسے سنبھالوں!

اس میں کوئی شک نہیں کہ حقیقت جان کر ناہید کو شدید صدمہ پہنچا تھا۔ وہ اسی صدمے کے زیر اثر تھی۔ قدرت شاید مجھے فی الحال کسی نئے امتحان میں ڈالنا نہیں چاہتی تھی۔ ناہید پر اسی لیے گریہ طاری ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ میں نے اسے رونے دیا کہ اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔ کچھ ہی دیر میں اس کی طبیعت سنبھل گئی۔ اپنے آنسو اس نے پونچھ لیے۔

''تو...... تو تم مجھے اسی لیے گاؤں نہیں لے گئے؟'' ناہید نے مجھ سے تصدیق چاہی۔

''ہاں بی بی جی! حقیقت یہی ہے۔'' میں نے جواب دیتے ہوئے اس کی طرف

دیکھا۔ اب اس کا چہرہ پُرسکون تھا۔

کچھ دیر تک ناہید خاموش رہی، پھر اس کی زبان پر وہ سوال آ ہی گیا جس کی مجھے توقع تھی۔ ''تم نے مجھے کس طرح تلاش کر لیا شہباز؟''

''آپ کو شاید میری بات پر یقین نہ آئے۔'' میں بولا۔ ''لیکن اتنا تو آپ بھی جانتی ہوں گی بی بی جی کہ اللہ کے کلام میں بڑی طاقت ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ چوہدری صاحب کے حکم پر سردارے اور کالیا آپ کو قتل کر دیں گے اور میں ہر قیمت پر آپ کو قاتلوں سے بچانا چاہتا تھا۔ اس کی صرف یہی ایک صورت تھی کہ میں ان دونوں سے پہلے آپ تک پہنچ جاؤں۔ میں نے اس کے لیے اللہ کے کلام کا سہارا لیا جس میں مجھے کامیابی ہوئی۔ پھر میں نے آپ کا سراغ لگا لیا۔ سردارے اور کالیے کو آپ کی تلاش میں کل صبح روانہ ہونا تھا۔''

ناہید حیرت سے میری صورت دیکھتی رہی، پھر کہا۔ ''شہباز! میں ابھی تک نہیں سمجھ سکی کہ تم نے کس طرح میرا پتا چلا لیا!''

وہ میری محبت، میری زندگی تھی، اس سے کچھ چھپانا میرے نزدیک جرم کے مترادف تھا۔ سو میں نے اسے اس ڈائری کے بارے میں بتا دیا جس میں مختلف وظائف درج تھے اور جو میرے پاس محفوظ تھی۔ میں نے آخر میں ناہید کو یہ بھی بتایا۔ ''اسی ڈائری میں گمشدہ افراد کو تلاش کرنے کا بھی وظیفہ لکھا تھا۔ آج ہی رات نماز عشاء کے بعد میں نے وہ وظیفہ پڑھا۔'' پھر ناہید کو میں نے بقیہ تفصیلات سے بھی آگاہ کر دیا۔

''یہ...... یہ تو بڑی حیرت انگیز اور پُراسرار بات ہے شہباز! میں نے پہلے کبھی کوئی ایسا واقعہ نہیں سنا۔'' ناہید نے اظہار حیرت کیا۔

''میرے پاس وہ ڈائری موجود ہے بی بی جی! میں آپ کو دکھاؤں گا۔ اس میں اور بھی بہت سے حیران کن وظیفے لکھے ہوئے ہیں۔ کچھ وظیفے تو ایسے ہیں کہ جن پر یقین ہی نہیں آتا، مثلاً عمر میں کمی بیشی کا وظیفہ۔ اس وظیفے کو پڑھ کر آدمی کے اندر ناقابل یقین پُراسرار قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی عمر کے قافلے کو ایک دن سے لے کر ایک سو سال تک کہیں بھی ٹھہرا سکتا ہے۔ بی بی جی! ہے نا یہ حیرت ناک بات!''

''میں...... میں یہ وظیفہ پڑھوں گی شہباز!'' ناہید پُراشتیاق لہجے میں کہنے لگی۔ ''تاکہ میں چھوٹی سی بچی بن جاؤں اور کوئی مجھے نہ پہچان سکے۔''

''مگر بی بی جی، جہاں تک مجھے یاد ہے اس وظیفے کی بڑی سخت شرائط ہیں اور...... اور

پتا ہے بی بی جی، کبھی کبھی وظیفہ الٹا بھی ہو جاتا ہے۔ میں...... میں آپ کو ہرگز کوئی ایسا وظیفہ نہیں پڑھنے دوں گا جس سے خدانخواستہ زندگی خطرے میں پڑ جائے۔'' میں نے کہا، پھر تجویز دی۔ ''اگر ایسا ہی ہوا تو پہلے میں وہ وظیفہ پڑھ کر دیکھوں گا۔''

''اس سے تمہاری زندگی بھی تو خطرے میں پڑ سکتی ہے شہباز! پھر تم مجھے کیوں روک رہے ہو؟''

''اس...... اس لیے بی بی جی کہ...... کہ آپ کی زندگی مجھ...... مجھ سے زیادہ قیمتی ہے۔''

''لیکن کس کے لیے شہباز؟''

اس سوال کے جواب میں بے اختیار میرے منہ سے یہ الفاظ نکل گئے۔ ''میرے لیے بی بی جی!''

ناہید نے اس پر میری طرف بڑی عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ اس کی اور میری نظریں آپس میں ٹکرائیں۔ میں نے پہلی مرتبہ اپنے لیے اس کی آنکھوں میں چاہت کے رنگ دیکھے۔ ذرا توقف سے اس نے پوچھا۔ ''ابھی تم نے بتایا تھا شہباز کہ اگر تمہارا وظیفہ ادھورا رہ جاتا تو اپنی یادداشت کھو بیٹھتے ٹھیک ہے، نا؟''

''ہاں بی بی جی!'' میں نے تصدیق کی۔

''پھر تم نے میری خاطر اتنا بڑا خطرہ کیوں مول لیا شہباز؟''

میں اصل جواب دینے سے گریز کرتے ہوئے بولا۔ ''میں ہر قیمت پر آپ کو قتل ہونے سے بچانا چاہتا تھا۔''

''لیکن کیوں بچانا چاہتے تھے؟ اس کی کوئی تو وجہ ہوگی!''

اس بارے میں مجھے اظہار حقیقت کا حوصلہ نہ ہوا اور جواب میں کہا۔ ''اس لیے کہ آپ میری نظر میں بے گناہ تھیں۔''

''دنیا میں بہت سے لوگ بے گناہ ہوتے ہیں لیکن ان کے لیے کوئی اپنی زندگی داؤ پر نہیں لگاتا۔'' ناہید بولی۔ ''ادھر دیکھو، میری طرف...... میری آنکھوں میں! تم مجھ سے جو بات چھپا رہے ہو، میں...... میں اسے جان چکی ہوں۔'' میں اس سے نظریں چرانے لگا تو وہ کہنے لگی۔ ''اپنی نظریں اوپر اٹھاؤ نا!''

''آپ...... آپ بی بی جی، کیا...... کیا جان چکی ہیں؟'' میں نے اس سے نظریں

ملاتے ہوئے سوال کیا۔

''یہی شہباز کہ تم...... تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔''

''بی...... بی بی جی!'' میری آواز کانپ کر رہ گئی۔ ''میں...... میں کیا آپ...... آپ کے قابل ہوں؟...... آپ کو یہ...... یہ شک کیسے ہوا؟''

''یہ شک نہیں حقیقت ہے شہباز! میں نے تو...... جوانی کی حدود میں قدم رکھتے ہی تمہاری محبت کو محسوس کر لیا تھا۔ تم نے اپنی زبان سے کچھ نہیں کہا، مگر تمہاری آنکھوں نے مجھ سے بہت کچھ کہہ دیا۔ بولو، اقرار کرو شہباز، یہ سچ ہے نا!'' ناہید نے یہ کہتے ہوئے میرا ہاتھ تھام لیا۔

''لیکن میں...... میں تو بی بی جی، زمین ہوں اور...... اور آپ آسمان!'' میرا سارا جسم اس کے لمس کی حرارت سے سنسنا رہا تھا۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے خود کو سنبھال کر میں نے کہا۔ ''بی بی جی! زمین اور آسمان کس طرح مل سکتے ہیں!''

''شہباز! پہلے تم زندگی کی بھیڑ میں اکیلے تھے۔ بچپن ہی میں تمہارے والدین کا انتقال ہو گیا، لیکن...... لیکن میرے اپنے تو جیتے جی مر گئے۔ اب...... اب میں بھی اکیلی رہ گئی ہوں، بالکل اکیلی!...... کیا تم...... تم شہباز، مجھے اکیلا ہی چھوڑ دو گے؟ کیا...... کیا ہم...... ہم ایک نہیں ہو سکتے؟...... بھول جاؤ کہ میں کبھی کسی چوہدری اسلم کی بیٹی تھی اور تم اس کے ایک معمولی کارندے تھے۔ ہمارا ماضی ہمارے پیروں کی زنجیر نہیں بن سکتا!...... اب مجھ میں اور تم میں کوئی فرق نہیں۔ نہ تم زمین ہو، نہ میں آسمان۔ ہم...... ہم ایک ہیں شہباز!...... اور ہمیشہ ایک رہیں گے۔ مجھ سے وعدہ کرو شہباز کہ...... کہ تم میرے...... صرف میرے ہی رہو گے۔'' ناہید کی آواز شدت جذبات سے بھاری ہوتی گئی۔

''ناہید بی بی!'' میرے ہونٹ کانپے۔

''صرف ناہید کہو مجھے!...... کہو ناہید!'' اس نے اصرار کیا۔

''نا...... ناہید!'' میں نے بہ مشکل کہا۔

اس نے میرا ہاتھ اپنے رخسار سے لگا کے آنکھیں بند کر لیں اور گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایک ہی رات میں سب کچھ بدل جائے گا۔ میری زندگی، میری محبت مجھے مل گئی تھی۔ ساری کائنات مجھے رقص کرتی محسوس ہونے لگی۔ میرے چاروں طرف جیسے رنگ ہی رنگ تھے، خوشبو ہی خوشبو تھی۔ اسی عالم میں اچانک میں

چونک اٹھا۔ ایک مسافر کو میں نے گیٹ سے داخل ہوتے دیکھا تھا۔ فوراً ہی میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ ہم جہاں بیٹھے تھے وہاں سے پلیٹ فارم کا گیٹ زیادہ دور نہیں تھا۔ میں نے ہاتھ کھینچا تو ناہید نے چونک کر پوچھا۔ ''کیا ہوا شہباز؟''

کچھ کہے بغیر میں نے قریب آنے والے شخص کی طرف اشارہ کیا اور ناہید سنبھل کر بیٹھ گئی۔ آنے والا ہم پر سرسری سی ایک نظر ڈالتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ میں نے گھڑی میں وقت دیکھا تو سوا تین بجے رہے تھے۔ ٹرین کی آمد میں اب صرف پندرہ منٹ رہ گئے تھے لیکن ہمیں آدھے گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔ ٹرین پندرہ منٹ لیٹ تھی۔ اس اسٹیشن پر ٹرین سے صرف دو مسافر اترے۔ بھیڑ نام کو نہیں تھی۔ ٹرین میں بھی زیادہ افراد سوار نہیں تھے۔ اکثر ڈبے مجھے خالی ہی دکھائی دیے۔ ناہید کے ساتھ میں ایک خالی ڈبے میں بیٹھ گیا۔ سوئچ ڈھونڈ کر میں نے ڈبے کے اس حصے میں روشنی کر دی۔ اپنے سوٹ کیس سے دو چادریں نکال کر میں نے آمنے سامنے کی سیٹوں پر بچھا دیں۔ ان دو چادروں کے سوا میرے پاس اور چادریں نہیں تھیں کہ جو اوڑھنے کے کام آ جاتیں۔ جاتے ہوئے جاڑے تھے اس لیے چادر اوڑھے بغیر بھی گزارہ ہو سکتا تھا۔

ناہید کے اقرار محبت کے باوجود بھی اب تک مجھے ایک حجاب سا تھا۔ بچپن سے اب تک میرے اور اس کے درمیان جو طبقاتی دیوار حائل رہی تھی، وہ ایک دم کیسے گر جاتی! شاید یہی سبب تھا کہ میں نے دو سیٹوں پر چادریں بچھائی تھیں تاکہ ہم دونوں الگ الگ بیٹھ یا لیٹ سکیں۔

''شہباز! ہم ایک جگہ بھی تو بیٹھ سکتے ہیں۔'' ناہید یہ کہتی ہوئی میرے قریب ہی آ بیٹھی۔

''ہاں...... ہاں کیوں نہیں!'' میں جلدی سے بولا۔

''مجھے کچھ خنکی سی محسوس ہو رہی ہے۔ تم نے جو دوسری چادر سامنے والی سیٹ پر بچھائی ہے، اٹھا لو۔ اسے ہم دونوں اوڑھ لیتے ہیں۔'' ناہید نے کہا۔

''ہم...... ہم دونوں ایک...... ایک ہی چادر میں......'' میں ہکلا کر رہ گیا۔

''تو کیا ہوا!'' ناہید نے یہ کہہ کر خود ہی دوسری سیٹ سے چادر گھسیٹ لی۔

جب ناہید اپنے ساتھ ہی مجھے بھی چادر اوڑھانے لگی تو میں بول اٹھا۔ ''مجھے جاڑا نہیں لگ رہا بی بی جی! آپ......''

''پھر وہی بی بی جی!...... میں صرف ناہید ہوں۔ عمر میں تم مجھ سے کچھ بڑے ہی ہو، پھر یہ آپ، آپ کیا کہے جا رہے ہو! ٹھیک طرح بات کرو مجھ سے!''

اب کے بعد ناہید نے میرے انکار کے بعد مجھے چادر اڑھا دی اور مزید میرے قریب آ گئی۔ اس کے جسم کا لمس محسوس کرتے ہی میرے جسم پر چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ میرے لیے اس کے اتنے قریب بیٹھنا ممکن نہیں تھا۔ سو میں تھوڑا سا کھڑکی کی طرف سرک گیا۔

ٹرین وہاں دس منٹ تک کھڑی رہی، پھر میں نے اس کی پہلی سیٹی سنی۔ اب تک ہم دونوں کے سوا اس ڈبے میں کوئی نہیں تھا۔ ٹرین کی اس پہلی سیٹی کے ساتھ ہی مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں نے ایک نئی زندگی میں قدم رکھ دیا ہے اور اپنے ماضی کو پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔ ذرا ہی دیر میں دوسری اور پھر تیسری سیٹی ہوئی اور ٹرین نے آہستہ آہستہ آگے بڑھنا شروع کر دیا۔

''آج ہم ایک نئے سفر کا آغاز کر رہے ہیں شہباز!'' ناہید نے مجھے مخاطب کیا۔

''خدا ہمارا یہ سفر مبارک کرے۔''

''آمین۔'' میں بولا، پھر اس سے پوچھا۔ ''آپ...... آ......'' مزید کچھ کہتے کہتے میں رک گیا۔ اس نے مجھے ''آپ'' کہنے سے منع کیا تھا، سو ہمت کر کے پہلی بار کہا۔ ''تم...... تم ناہید، اس سفر سے مطمئن تو ہو؟ میں...... میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں کبھی اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔''

''تم زبان سے اس بات کا اقرار نہ بھی کرتے شہباز تو مجھے تمہاری وفا پر یقین تھا۔'' ناہید جیسے گنگنائی۔ ''تمہیں پا کر مجھے یوں لگتا ہے کہ سب کچھ مل گیا ہو، جیسے میں نے کچھ نہیں کھویا۔'' پھر اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور میرے ہاتھ کی انگلیوں میں اپنی انگلیاں پھنسا دیں۔

''یہ...... یہ آپ...... تم کیا کر رہی ہو ناہید!'' مجھے کہنا ہی پڑا۔ ''میں...... میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔''

''کیوں، کیا ہوا شہباز! میں سمجھی نہیں تم کیا...... کیا کہنا چاہتے ہو!''

''تمہارا لمس...... مجھے دیوانہ کر دے گا۔ میں خود پر شاید قابو نہیں رکھ سکوں گا۔ مجھے...... مجھے امتحان میں نہ ڈالو ناہید!'' میں نے یہ کہتے ہوئے آہستگی کے ساتھ اپنی انگلیاں اس

کی انگلیوں سے نکال لیں۔ خنکی کے باوجود میرا جسم پسینے میں ڈوب گیا تھا۔

''ارے! یہ تمہیں کیا ہو رہا ہے شہباز! تمہیں تو پسینے آ رہے ہیں۔'' ناہید نے میرے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے حیرت سے کہا۔

''ہاں ناہید! یہ تمہارے لمس کی حرارت کا جادو ہے جس نے میرا یہ حال کر دیا ہے۔ اب......اب میرے اتنے قریب نہ آنا ناہید کہ میرا وجود پگھلنے لگے۔ جب...... جب تم نے میری انگلیوں میں اپنی انگلیاں پھنسا دی تھیں تو...... تو میرے اندر ایک الاؤ سا بھڑک اٹھا تھا۔''

''تم......تم شہباز، مجھے اس قدر چاہتے ہو!'' وہ حیران حیران سی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ ''میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ تمہاری محبت میں اتنی شدت ہوگی۔ اب میں پوری کوشش کروں گی کہ...... کہ تمہیں آزمائش میں نہ ڈالوں۔ اب میں تمہارے اتنے قریب نہیں آؤں گی۔''

میں نے چادر سے اپنے چہرے کا پسینا (یہ لفظ الف ہی سے ہے، اسے ہ سے پسینہ لکھنا غلط ہے۔ مصنف) پونچھ لیا، پھر اس سے بولا۔

''سفر خاصا طویل ہے۔ اگر تم کچھ دیر آرام کر لو تو اچھا ہے۔ مجھے اس چادر کی ضرورت نہیں، تم اسے اوڑھ کر یہیں لیٹ جاؤ۔ میں سامنے والی سیٹ پر بیٹھ جاؤں گا۔ سوٹ کیس کو تم تکیے کی جگہ اپنے سر کے نیچے رکھ لو۔''

''آرام کی ضرورت تو تمہیں بھی ہے شہباز!'' اس نے کہا۔ ''تم نے بھی تو لمحے بھر کو پلکیں نہیں جھپکائیں۔ پہلے تم آرام کر لو، میں بعد میں لیٹ جاؤں گی۔''

''نہیں ناہید!'' میں یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ سوٹ کیس کھڑکی کے قریب ہی سیٹ پر رکھا تھا۔ میں نے کھڑکی بند کر کے سوٹ کیس کو اس طرح رکھ دیا کہ ناہید سے اپنے سر کے نیچے لگا سکے، پھر بولا۔ ''لیٹ جاؤ تم!...... چلو اب ضد نہ کرو!''

وہ میرے اصرار پر چادر اوڑھ کر لیٹ گئی، مگر چہرہ کھلا رہنے دیا۔ میں سامنے والی سیٹ پر کھڑکی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ وہ کھڑکی پہلے ہی سے بند تھی۔

''کہو تو بتی بھی بجھا دوں تاکہ تم آرام سے سو جاؤ۔'' میں نے ناہید کو مخاطب کیا۔

''نہیں۔ اندھیرا ہو گیا تو مجھے تمہارا چہرہ نظر نہیں آئے گا۔'' وہ بڑی محبت سے بولی۔

''تم سو رہی ہو کہ میرا چہرہ دیکھ رہی ہو؟''

''سو بھی جاؤں گی، لیکن سونے سے پہلے تمہارا چہرہ میری نظر میں رہنا چاہئے تاکہ آنکھیں بند بھی ہو جائیں تو تمہی کو دیکھتی رہوں۔''

''ہاں ناہید، بند آنکھیں میں بڑی وسعت ہوتی ہے۔'' میں نے یہ کہتے ہوئے گہرا سانس لیا۔

ٹرین چلنے کی مخصوص آواز نے لوری کا کام دیا۔ ناہید نے آنکھیں بند کر لیں۔ میری آنکھوں میں بھی نیند جال بننے لگی لیکن اسی وقت ٹرین کی رفتار دھیمی ہونے لگی۔ شاید کوئی اسٹیشن قریب آ رہا تھا۔ میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

ذرا ہی دیر میں ٹرین ایک جھٹکے سے رکی تو ناہید بھی جاگ اٹھی۔ اس وقت صبح کے ساڑھے پانچ بجنے والے تھے۔ میں نے اپنی طرف والی کھڑکی کھول کر باہر دیکھا۔ ایک لڑکا ڈبے کے قریب سے آواز لگاتا ہوا گزرنے لگا۔ ''گرم چائے...... گرم......''

''چائے پیو گی ناہید؟'' میں نے پوچھا۔

''تم بھی پیو تو پی لوں گی۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے چائے والے کو آواز دی۔ وہ کھڑکی کے قریب آ گیا تو میں نے اس سے چائے کے دو گلاس لے لیے۔ اس دوران میں ناہید اٹھ کر بیٹھ چکی تھی۔ ایک گلاس میں نے اس کی طرف بڑھا دیا۔ چائے پر گرم ہونے کا محض الزام ہی تھا۔ چند ہی گھونٹ میں گلاس خالی ہو گیا۔ ناہید نے بھی چائے کا گلاس خالی کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ دونوں خالی گلاس میں نے چائے والے کو تھما کر اسے پیسے دے دیے۔ اس سے یہ کہنا فضول ہی تھا کہ چائے ٹھنڈی تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے تک ٹرین اسی اسٹیشن پر کھڑی رہی کیوں کہ اسے آگے جانے کا سگنل نہیں ملا تھا۔ جب ایک میل ٹرین اس اسٹیشن پر رکے بغیر برابر والی پٹڑی سے تیز رفتاری کے ساتھ گزر گئی تو پھر ہماری ٹرین نے رینگنا شروع کیا۔

ایک مرتبہ آنکھ کھل جائے تو دوبارہ مشکل ہی سے لگتی ہے۔ میرے کہنے پر ناہید لیٹ تو گئی مگر سوئی نہیں۔

''ناہید! تمہیں بھوک تو نہیں لگ رہی؟'' میں نے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے پوچھا۔ صبح کے پونے سات بج رہے تھے۔ ناہید نے انکار میں جواب دیا تو میں نے کہا۔ ''معلوم نہیں اب کتنی دیر میں ٹرین کسی اسٹیشن پر رکے گی! بہر حال جہاں بھی رکی ہم ناشتہ کر لیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ ''ویسے بھی ابھی بھوک نہیں، تم فکر نہ کرو

اور تھوڑی دیر کو لیٹ جاؤ!"

میں نے لاکھ منع کیا کہ ناشتا کر کے لیٹ جاؤں گا مگر وہ نہیں مانی۔ اس کے اصرار پر مجھے لیٹنا ہی پڑا۔ وہ میری جگہ سامنے والی سیٹ پر جا بیٹھی تھی۔

آٹھ بجے صبح ٹرین ایک اسٹیشن پر رکی اور ہم نے ناشتا کیا۔ پھر دوپہر کا کھانا بھی ہم نے ٹرین ہی میں کھایا۔ دو بجے دوپہر تک اس ٹرین کو بہاولپور پہنچنا تھا لیکن اپنی سست رفتاری اور جگہ جگہ رکنے کے سبب وہ شام چار بجے بہاولپور پہنچی۔

ریلوے اسٹیشن کی عمارت سے نکل کر میں نے فرید گیٹ کے لیے رکشا کر لیا۔ وہ شہر میرے لیے نیا تھا۔ میں پہلے وہاں کبھی نہیں آیا تھا۔ رکشے والے کو میں نے بتا دیا تھا کہ فرید گیٹ میں کہاں جانا ہے! وہ بازار خاصا پُر ہجوم اور بارونق تھا جہاں رکشا ایک پتلی سی گلی کے سامنے رک گیا۔

"یہی آبادی کوچہ گل حسن کہلاتی ہے۔" رکشے والے نے میرے استفسار پر دائیں جانب ہاتھ اٹھاتے ہوئے بتایا۔

میں یہ دیکھ کر وہیں اتر گیا کہ اس گلی میں رکشے کا داخل ہونا ممکن نہیں تھا۔ کرایہ ادا کر کے میں نے سوٹ کیس اٹھایا اور ناہید کو ساتھ لیے اس گلی میں داخل ہو گیا۔ ارشد کے والد کا نام امجد تھا۔ پتلی پتلی گلیوں میں چکراتا اور پتا پوچھتا ہوا آخر میں، ارشد کے گھر تک پہنچ ہی گیا۔ دروازے پر کئی بار دستک دی تو دس بارہ سال عمر کا ایک لڑکا باہر آیا۔ میں نے اس سے ارشد کے بارے میں پوچھا تو وہ بولا۔ "بھائی جان تو دکان پر گئے ہیں۔"

چہرے ہی سے میں نے اس لڑکے کو پہچان لیا تھا۔ مجھے وہ ارشد کا چھوٹا بھائی ہی معلوم ہوا۔ جب یہ لوگ گاؤں میں رہتے تھے تو یہ لڑکا چھوٹا تھا۔ ارشد کے گھر میں میرا آنا جانا تھا۔ اس کی امی بھی مجھے اچھی طرح پہچانتی تھیں۔ میں نے یہ سوچ کر لڑکے سے کہا۔

"تمہاری امی تو گھر میں ہوں گی نا؟"

"ہاں ہیں۔" لڑکے نے جواب دیا۔

میں نے اپنے گاؤں کا نام بتایا اور بولا۔ "امی سے کہنا کہ ارشد کا دوست شہباز آیا ہے۔"

لڑکا میری بات سن کر گھر میں چلا گیا۔ ذرا سی دیر میں خود ارشد کی امی گھر کے دروازے پر آ گئیں۔ انہوں نے جھانک کر مجھے دیکھا اور پُر مسرت آواز بولیں۔ "ارے تم ہو شہباز بیٹے! آؤ، اندر آ جاؤ اور یہ تمہارے ساتھ کون ہے؟"

"خالہ جی! ان کا نام ناہید ہے اور یہ چوہدری صاحب کی بیٹی ہیں۔" میں نے ارشد کی امی سے ناہید کا تعارف کرایا۔ مجھے جھوٹ بولنے کی ضرورت بھی کیا تھی!

"چوہدری اسمٰعیل کی بیٹی ناہید!" وہ حیرت سے بولیں، پھر کہا۔ "یہ تو ہماری خوش قسمتی ہے کہ چوہدری صاحب کی بیٹی ہمارے گھر آئی ہے۔"

ارشد کی امی ایک طرف ہو گئیں تو ناہید کے ہمراہ میں گھر میں داخل ہو گیا۔

"جا، دکان پر جا کر ارشد کو بتا کہ گاؤں سے اس کا دوست شہباز آیا ہے۔" ارشد کی امی نے لڑکے کو مخاطب کیا، پھر ہمیں ساتھ لیے وہ بڑے سے صحن سے گزر کر ایک کمرے میں آ گئیں جہاں پہلے ہی سے ایک نوجوان لڑکی موجود تھی۔ وہ لڑکی مجھے دیکھ کر سر پر دوپٹا درست کرنے لگی۔

"یہ شاید نزہت ہے خالہ!" میں نے اس لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو ناہید کی ہم عمر تھی۔

"تم نے ٹھیک پہچانا بیٹے یہ نزہت ہی ہے۔" ارشد کی امی نے بتایا، پھر نزہت سے سلام کرنے کے لیے کہا۔

نزہت مجھے اور ناہید کو سلام کر کے شرمائی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ ناہید اور میں اس وقت ایک پلنگ پر بیٹھ چکے تھے۔

"اور سناؤ شہباز بیٹے، گاؤں کیا حال ہے؟ سب ٹھیک تو ہیں؟ تمہیں اچانک ہم لوگوں کی یاد کیسے آ گئی؟" ارشد کی امی نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے، پھر کہنے لگیں۔ "سچ پوچھو بیٹے تو یہاں آ کر بس جانے پر بھی گاؤں کی بہت یاد آتی ہے۔"

"گاؤں میں سب خیریت سے ہیں خالہ! کسی اطلاع کے بغیر اس لیے آ گیا کہ آپ لوگوں کو زیادہ خوشی ہو۔" میں بولا، پھر موضوع گفتگو دانستہ بدل دیا کیوں کہ مجھے اب گاؤں کی باتوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی میں نے پوچھا۔ "کیا ارشد کسی کی دکان پر کام کرتا ہے خالہ؟"

"کسی کی دکان کیوں بیٹا، خود اپنی دکان ہے۔ کالج سے آ کر اپنے باپ کا ہاتھ بٹانے دکان پر چلا جاتا ہے۔ فرید گیٹ کے باہر ہی سڑک پار کر کے کتابوں اور اسٹیشنری کی دکان ہے۔ پچھلے سال ہی یہ دکان خریدی تھی۔ اللہ نے ارشد کے بابا کا ہاتھ پکڑ لیا اور تیری میری نوکری کرنے سے جان چھوٹ گئی۔" ارشد کی امی نے تفصیل سے مجھے آگاہ کیا۔

"یہ تو آپ نے بڑی اچھی خبر سنائی خالہ!" میں نے خوشی کا اظہار کیا۔

"بس بیٹے، یہ سب اللہ کا کرم ہے کہ اس نے روزی کا ذریعہ پیدا کر دیا۔" انہوں نے کہا، پھر نزہت کو آواز دے کر کچھ کھانے پینے کو منگوایا۔

"نہیں خالہ!" میں نے انکار میں سر ہلایا۔ "ہم نے ٹرین میں کھانا کھا لیا تھا۔"

پھر بھی وہ نہیں مانیں اور نزہت سے پھل منگوا کر ہمارے لئے کاٹنے لگیں۔ نزہت سے انہوں نے چائے بنانے کو بھی کہہ دیا تھا۔ سانولی ہونے کے باوجود نزہت کے چہرے پر بڑی کشش تھی، جسم بھی متناسب تھا۔ چند ہی برسوں میں اس نے رنگ و روپ نکال لیا تھا۔ ادھر نزہت چائے بنا کر لائی ادھر ارشد اپنے چھوٹے بھائی سہیل کے ساتھ دکان سے گھر آ گیا۔

"ارے تو شہباز!" ارشد باہیں پھیلائے ہوئے میری طرف بڑھا۔ "تو نے تو اچانک آ کر حیران کر دیا۔"

میں نے اٹھ کر اسے سینے سے لگا لیا اور بولا۔ "تو نے لوٹ کر گاؤں کی خبر ہی نہیں لی، بھلا دیا سب کو! مگر دیکھ لے تیری یاد مجھے یہاں کھینچ لائی۔" ارشد بھی مجھ سے گاؤں کی حویلی میں ملنے آتا رہتا تھا۔ اس کے لیے ناہید اسی سبب اجنبی نہیں تھی۔ ناہید کو دیکھ کر وہ کہنے لگا۔ "اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو چوہدری صاحب کی صاحبزادی ناہید بی بی ہیں۔" پھر اس نے میرے ساتھ پلنگ پر بیٹھتے ہوئے ناہید کو سلام بھی کیا۔

"وعلیکم السلام۔" ناہید نے سلام کا جواب دیا، پھر بولی۔ "آپ کا چہرہ مجھے اسی لیے دیکھا دیکھا لگ رہا ہے کہ شہباز سے ملنے حویلی آتے ہوں گے۔"

"جی ہاں، اس کی وجہ سے تو آپ کی حویلی میں روز ہی آنا جانا رہتا تھا۔" ارشد نے کہا۔

میں نے محسوس کر لیا تھا کہ ناہید کے جسم پر میلے کپڑے دیکھ کر ارشد حیران سا تھا، یہی حیرت مجھے اس کی امی کے چہرے پر بھی نظر آئی تھی۔

فوری طور پر مجھے ایک ہی بہانہ سوجھا۔ میں خود ہی کسی کے کچھ کہے بغیر بولا۔ "راستے میں ناہید بی بی کا سوٹ کیس کوئی اڑا لے گیا۔ کپڑے اور ان کے استعمال کا ضروری سامان اسی میں تھا۔ اب پہلا کام یہ کرنا ہے ارشد کہ ان کے لیے کپڑا خرید کر سلنے کے لیے دینا ہے۔"

توقع کے مطابق ارشد اور اس کی امی دونوں ہی نے اس "حادثے" پر حیرت اور افسوس کا اظہار کیا۔ پھر ارشد کی امی نے فوراً ہی اس مسئلے کا ایک حل نکال لیا۔ وہ بولیں۔

"کپڑا خرید کر تم بھلے سلنے دے دو، لیکن جہاں تک میرا اندازہ ہے نزہت کے کپڑے ناہید بیٹی کے ٹھیک ہی آئیں گے۔ میں پانی گرم کرائے دیتی ہوں، نہا کر ناہید بیٹی، نزہت کا کوئی جوڑا پہن لے گی۔" پھر انہوں نے ناہید کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "بیٹی! تجھے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں؟ یہ میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ تُو بڑے گھر کی بیٹی ہے اور ہم لوگ غریب ہیں۔"

"ارے نہیں خالہ! آپ یہ کیسی باتیں کر رہی ہیں!" ناہید بول اٹھی۔ "نزہت میرے لیے بہن کی طرح ہے، مجھے اس کے کپڑے پہننے پر کیوں اعتراض ہوتا! اللہ کے نزدیک سب برابر ہیں۔ کوئی بڑا چھوٹا نہیں۔ یہ سب اونچ نیچ تو ہم نے پیدا کی ہیں۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو بیٹی!" ارشد کی امی نے کہا، پھر انہوں نے نزہت کو بلا کر پانی گرم کرنے اور کپڑے نکالنے کو کہہ دیا۔ گھر میں ایک ہی غسل خانہ تھا اس لیے پہلے ناہید اور پھر میں نے باری باری نہا کر کپڑے بدل لئے۔ نزہت کے کپڑے ناہید کے جسم پر ٹھیک ہی آئے تھے۔ اگر کچھ تھوڑا بہت فرق ہوگا بھی تو میں نے محسوس نہیں کیا۔ نہا کر کپڑے بدلنے کے بعد وہ کھلی کھلی سی لگ رہی تھی۔

کپڑا تو بہر حال خریدنا ہی تھا۔ میں نے ارشد سے بازار چلنے کو کہا تو ناہید مجھ سے بولی۔ "ذرا ادھر آؤ، میری ایک بات سن لو شہباز!"

ناہید کے ساتھ میں اس کمرے میں آ گیا جہاں میرا سوٹ کیس رکھوا دیا گیا تھا۔ ارشد کمرے سے باہر ہی رہ گیا تھا۔

"ہاں بولو! کیا بات ہے؟" میں نے سوٹ کیس کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا کیوں کہ مجھے اس میں سے کچھ رقم نکالنی تھی۔

"تمہارے پاس میرے کپڑے بنانے کے لیے پیسے بھی ہیں؟" ناہید نے دریافت کیا۔

"اگر پیسے نہ ہوتے تو کپڑا خریدنے کو کہتا ہی کیوں!...... ادھر آؤ، دیکھو!" میں نے اسے سوٹ کیس سے رقم نکال کر دکھائی اور بولا۔ "گاؤں سے میں پوری تیاری کے ساتھ چلا تھا۔ زندگی بھر کی ساری جمع پونجی میں اپنے ساتھ لے آیا ہوں۔ یہ اتنی رقم ہے ناہید کہ ہم دونوں کئی مہینے بڑے آرام اور کسی فکر و تشویش کے بغیر گزارہ کر سکتے ہیں۔"

"اور یہ رقم خرچ ہونے کے بعد؟" ناہید نے سوال کیا۔

"اللہ مالک ہے۔ اس عرصے میں کوئی کام دھندا تو مل ہی جائے گا۔ تم کوئی فکر نہ

کرو۔'' میں نے اسے اطمینان دلایا، پھر کہا۔ ''میرا تو خیال ہے کہ تم بھی بازار ساتھ ہی چلو تاکہ اپنی پسند کا کپڑا اور دیگر ضروری سامان لے سکو، بولو چل رہی ہو ساتھ؟''

''تم کہتے ہو تو چلی چلتی ہوں۔ اس طرح تم مہنگا کپڑا خرید کر فضول خرچی نہ کر سکو گے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ مسکرا دی۔

چلتے وقت میرے کہنے پر اس نے اتارے ہوئے کپڑے بھی ایک شاپنگ بیگ میں درزی کو ناپ دینے کی غرض سے رکھ لئے۔ جو پھٹی ہوئی چادر وہ اوڑھ کر آئی تھی، اس قابل نہیں تھی کہ اس کو اوڑھ کر ہمارے ساتھ چلتی۔ اس نے اسی لیے نزہت ہی کی ایک چادر اوڑھ لی۔

ناہید کو ساتھ لیے ہم دونوں دوست گھر سے نکلے۔ کپڑا خریدتے ہوئے میں نے خاص طور پر یہ بات محسوس کی کہ ناہید اوسط درجے کا کپڑا پسند کر رہی ہے۔ میرے اصرار پر وہ بہ مشکل چار جوڑے بنانے پر آمادہ ہوئی ورنہ تو فی الحال دو ہی جوڑے بنانے کو کہہ رہی تھی۔ دو چادریں بھی میں نے اس کے لیے خرید لیں اور ایک سوٹ کیس بھی تاکہ وہ اس میں اپنے کپڑے رکھ سکے۔ میک اپ وغیرہ کا کچھ سامان بھی اس نے میرے بہ ضد ہونے پر خرید لیا۔ فرید گیٹ ہی میں ایک درزی کو کپڑے سلنے کے لیے دیئے گئے۔ وہ درزی ارشد کا جاننے والا تھا۔ مجھے اس بات کا احساس تھا کہ خواتین کی کچھ ایسی چیزیں بھی ضروری ہوتی ہیں جو وہ مردوں کے ساتھ نہیں خرید سکتیں۔ اسی خیال سے گھر واپس آتے ہی میں نے ناہید کو نزہت کے ساتھ ایک مرتبہ پھر بازار جانے پر مجبور کر دیا۔ وہ بڑی مشکل سے اس پر آمادہ ہوئی تھی۔ اسے میں نے کچھ رقم دے دی تھی، وہ دونوں چلی گئیں تو ارشد مجھے نشست گاہ میں لے گیا۔

''مجھے تجھ سے کچھ بات کرنی ہے۔'' ارشد بولا۔

مجھے کسی ایسی گفتگو کی پہلے ہی توقع تھی، سو سنبھل کر بیٹھ گیا اور کہا۔ ''ہاں بول!''

''اب یہ بتا میری جان کہ اچانک تُو کیسے آ گیا؟ اگر تُو نے مجھے یہ گولی دی کہ میری محبت تجھے یہاں کھینچ لائی ہے تو میں ہرگز اس پر یقین نہیں کروں گا۔ ایسا ہوتا تو تیرے ساتھ ناہید نہ ہوتی۔ مجھے دال میں کچھ کالا کالا نظر آ رہا ہے کہیں تُو چوہدری کی بیٹی کو بھگا کر تو نہیں لایا؟''

ارشد اور اس کے گھر والوں کو بہر حال مجھے اعتماد میں لینا ہی تھا۔ اس سے قطع نظر یہ کہ سچ میں میرے نزدیک بڑی طاقت ہوتی ہے۔ میں نے اسی خیال سے اول تا آخری پوری روداد سنا دی۔ صرف یہ گول کر گیا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو چاہتے بھی ہیں۔ وظیفے

کا بھی نے ذکر نہ کیا۔

''حیرت ہے شہباز کہ دنیا میں ایسے سنگ دل باپ بھی موجود ہیں۔'' ارشد نے چوہدری اسلم پر لعنت ملامت کی۔

''تُو اگر چاہے ارشد تو اپنے گھر والوں کو بھی ان حالات سے آگاہ کر سکتا ہے، مجھے اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔'' میں نے کہہ دیا۔

''سوچنا پڑے گا، معلوم نہیں ابا جی پر اس کا کیا ردعمل ہو! میرا خیال ہے امی کو سب کچھ بتا دینا چاہئے۔ وہی ابا جی سے بات کریں تو اچھا ہے۔''

''ویسے تو میں خود بھی چچا امجد سے بات کر سکتا ہوں، مجھے یقین ہے ارشد کہ جب چچا امجد کو ان واقعات کا علم ہوگا تو انہیں میرے اور ناہید کے یہاں رہنے پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ تیرے تو خیر وہ باپ ہیں مگر میں بھی انہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔'' میں بولا۔

''تجھے آخر ایسی جلدی کیا ہے، ذرا سوچ سمجھ لینے دے۔'' ارشد کہنے لگا۔ پھر اسے جیسے کوئی بات یاد آ گئی اور اس نے وہ بات پوچھ ہی لی جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ ''شہباز! تجھے یہ کیسے پتا چلا کہ ملک مظفر نے ناہید کو اپنے کارندے خیرو کے ساتھ لکھن پور گاؤں میں رکھا ہوا ہے؟''

''دراصل پہلے چوہدری اسلم نے سردارے اور کالے کو ناہید کا صرف پتا چلانے کو کہا تھا۔'' میں نے بات بنائی۔ ''انہی دونوں نے ناہید کا سراغ لگا کر چوہدری اسلم کو بتایا تھا۔ اسی کے بعد چوہدری اسلم نے ناہید کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا۔ میں ان کی ٹوہ میں تھا، سو ساری باتیں چھپ کر سن لی تھیں۔''

ارشد میرے اس جواب سے مطمئن نظر آنے لگا۔ اسی وقت ناہید اور نزہت بازار سے خریداری کر کے لوٹ آئیں۔ انہی دونوں کے پیچھے پیچھے ارشد کے والد بھی گھر آ گئے۔ وہ نشست گاہ کے اندرونی دروازے کے سامنے سے گزرتے ہوئے رکے اور پھر مجھ پر نظر پڑتے ہی اندر آ گئے۔

میں نے اٹھ کر انہیں سلام کیا۔ انہوں نے جواب دے کر بڑی محبت سے مجھے گلے لگا لیا، وہ بڑے شفیق اور نفیس آدمی تھے۔

''ابا جی دکان بند کر کے آ جاتے ہیں تو رات کا کھانا ہم سب ایک ساتھ ہی کھاتے ہیں۔ چلو اٹھو۔'' ارشد مجھ سے بولا۔

چچا امجد کے ساتھ ہی ہم دونوں بھی اندر آ گئے۔ گھر خاصا بڑا تھا، اس لیے مجھے الگ

رہنے کو ایک کمرہ مل گیا جو نشست گاہ کے قریب ہی تھا۔ چچا امجد نے کھانا کھانے کے دورا
میں ناہید کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا اور کہا۔ ''یقیناً ناہید بیٹی سیر و تفریح کی خاطر یہاں آئی
گی۔''

ناہید سر جھکائے کھانا کھاتی رہی۔ میں نے بھی اقرار میں سر ہلا کر وقتی طور پر با
ٹال دی، میں نے جو کچھ ارشد کو بتایا تھا، اس سے ناہید کو بھی آگاہ کرنا ضروری سمجھا۔ جب
سب نے کھانا کھا لیا تو میں اسے اپنے کمرے میں لے آیا۔

''معلوم نہیں ہمیں یہاں کتنے دن رہنا پڑے ناہید!'' میں نے اسے مخاطب کیا
''اس لئے ارشد اور اس کے گھر والوں کو اعتماد میں لینا ضروری ہے۔ تمہارا اس سلسلے میں
کیا مشورہ ہے؟'' میں نے آخر میں دریافت کیا۔

''تو کیا انہیں سب کچھ بتا دو گے؟'' یہ سوال کرتے ہوئے وہ قدرے خوفزدہ سی نظر
آنے لگی۔

''اس میں حرج بھی کیا ہے!'' میں نے اسے سمجھایا۔ ''ارشد کو تو میں نے تمام حالا
بتا بھی دیئے ہیں، صرف دو باتیں مصلحتاً نہیں بتائیں۔''

''وہ کیا؟'' اس نے چونک کر پوچھا۔

''ایک تو وظیفے والی بات......''

''اس نے پوچھا نہیں کہ تم نے میرا سراغ کس طرح لگایا؟'' ناہید بول اٹھی اور میر
بات پوری نہ ہو سکی۔

میں نے اس سلسلے میں جو جواب ارشد کو دیا تھا، اس سے ناہید کو آگاہ کر دیا۔ پھر بولا
''دوسری بات جو میں نے چھپائی ہے، وہ ہماری محبت ہے۔''

''یہ تم نے اچھا کیا شہباز!'' ناہید نے کہا۔ ''ورنہ کیا خبر تمہارا دوست میرے بار
میں جانے کیا سوچتا!''

''تو پھر چچا امجد اور ارشد کی امی کو بھی ساری باتیں بتا دی جائیں؟'' میں نے سوا
کیا۔

''تم اگر اس میں کوئی خطرہ نہیں سمجھتے تو بتا دو۔'' ناہید نے جواب دیا۔ ''ابھی تو ہمیں
اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنا ہے۔ ظاہر ہے ہم زیادہ عرصے تو یہاں نہیں رہ سکتے
ابھی تو کچھ سوچنے سمجھنے کی ہمیں مہلت ہی نہیں ملی۔''

میں نے اس سے اتفاق کیا۔ اس وقت قدموں کی چاپ سنائی دی میں کچھ کہتے کہتے

رک گیا۔ کوئی اسی کمرے کی طرف آ رہا تھا۔ ''میں آ سکتا ہوں اندر؟...... اجازت ہے؟''
کمرے کے باہر ہی سے ارشد نے ہانک لگائی۔ آنے والا وہی تھا۔

''آ جا میرے بھائی! یہاں تجھ سے پردہ کرنے والا کوئی نہیں۔'' میں نے جواب
دیا۔

''شریف اور مہذب لوگ اسی طرح کسی کے کمرے میں اجازت لے کے داخل
ہوتے ہیں۔'' ارشد کمرے میں قدم رکھتے ہوئے دھیرے سے ہنس کر بولا۔ ''میں اس لیے
آیا تھا کہ کل کا پروگرام بنا لیا جائے، کیا ناہید بی بی کی گھمانا پھرانا نہیں؟''

''مجھے کیا خبر کہ یہاں گھومنے پھرنے کی بھی کوئی جگہ ہے!''

''یہاں کے چڑیا گھر کا شمار پاکستان کے بہترین چڑیا گھروں میں ہوتا ہے۔ تم نے
ایسے تندرست و توانا شیر کہیں نہیں دیکھے ہوں گے۔ یہاں چڑیا گھر کے علاوہ نواب صاحب کا
میوزیم بھی دیکھنے کی چیز ہے۔'' ارشد نے بتایا۔ ''یہ چھوٹا سا خوبصورت شہر بڑی تاریخی
حیثیت کا حامل ہے۔''

''مگر تجھے کل کالج بھی جانا ہوگا۔'' میں بولا۔

''ناہید بی بی اور تیری خاطر ایک دن کالج نہیں جاؤں گا۔''

''چل تو پھر ٹھیک ہے، کیوں ناہید بی بی، ٹھیک ہے نا؟'' میں نے ارشد کے سامنے
دانستہ ناہید کے ساتھ بے تکلفی سے گریز کیا تھا۔

ناہید نے بھی اس پر رضامندی ظاہر کر دی تو ارشد خوش ہو گیا۔ ارشد ابھی اس کمرے
ہی میں تھا کہ ناہید نے اس سے نزہت کو بھی ساتھ لے چلنے کے لیے کہا۔

''اس کی اجازت تو آپ کو امی سے لینی پڑے گی ناہید بی بی!'' ارشد نے جواب
دیا۔

''ٹھیک ہے، میں خود خالہ سے پوچھ لوں گی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ منع نہیں کریں
گی۔'' ناہید بولی۔

ناہید کے سونے کا بندوبست اسی کمرے میں کیا گیا تھا جہاں ارشد کی امی اور نزہت
سوتی تھیں۔ ارشد اور اس کے والد، دونوں کے کمرے الگ الگ تھے۔ میں اور ناہید کیوں
کہ گزشتہ رات کے جاگے ہوئے تھے اس لیے خوب گہری نیند سوئے، صبح مجھے ارشد ہی نے
جگایا۔

''تُو نے بھی حد کر دی یار! صبح کے سوا نو بج رہے ہیں مگر تُو اٹھنے کا نام ہی نہیں لے

رہا۔ وہ تمہاری ناہید بی بی ابھی سوکر اٹھی ہیں۔''

''تو کیا ہوگیا!'' میں نے یہ کہتے ہوئے انگڑائی لی۔

''چلنا نہیں ہے کیا!'' ارشد نے کہا۔

نہا دھو کر ناشتہ کرنے اور گھر سے نکلنے میں ہمیں گیارہ بج گئے۔ نزہت بھی ہمارے ساتھ تھی۔ ناہید نے رات ہی کو ارشد کی امی سے اجازت لے لی تھی۔ فرید گیٹ سے نکل کر ہم نے چڑیا گھر جانے کے لیے ایک تانگا کرلیا۔ ناہید میرے ساتھ پیچھے اور نزہت اپنے بھائی کے برابر آگے بیٹھی۔

''میں تمہیں ایک بات بتانا تو بھول ہی گئی شہباز!'' ناہید نے مجھے دھیمی آواز میں مخاطب کیا۔

''ہاں ہاں، کیا بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

ناہید نے مڑ کر ارشد اور نزہت کی طرف دیکھا، پھر سرگوشی کی۔ ''یہاں وہ بات کرنا کچھ مناسب نہیں، چڑیا گھر چل کر بتاؤں گی۔''

میرے دل میں تجسس پیدا ہوا۔ یقیناً وہ کوئی ایسی ہی بات تھی جو ناہید، ارشد اور نزہت کی موجودگی میں کرنا نہیں چاہتی تھی۔ ناہید کے چہرے پر فکرمندی کے علاوہ میں نے ایک بات اور بھی محسوس کی کہ تانگے کے پیچھے ایک اسکوٹر پر سوار دو نوجوانوں کو ناہید بار بار دیکھے جا رہی تھی۔ اسکوٹر کبھی تانگے کے برابر چلنے لگتا اور کبھی پیچھے۔ بہرحال چڑیا گھر تک اسکوٹر پر سوار نوجوان ہمارے ساتھ ساتھ ہی رہے۔ میرے ذہن میں بار بار ایک ہی سوال ضربیں سی لگا رہا تھا کہ ناہید ان نوجوانوں کو کیسے جانتی ہے؟ تانگے سے اتر کر میں نے کرایہ دینا چاہا، مگر ارشد نے مجھے ایسا نہ کرنے دیا۔ پھر اسی نے ٹکٹ خریدے۔ اس دوران میں میری نظر انہی نوجوانوں کی طرف مرکوز رہی۔ اپنا اسکوٹر ایک طرف کھڑا کر کے انہوں نے بھی ٹکٹ خرید لئے تھے۔ اب میرے لیے یہ سمجھنا دشوار نہیں تھا کہ وہ دونوں ہمارا ہی تعاقب کر رہے تھے، مگر کیوں؟ یہ سوچ کر میرا ذہن الجھنے لگا، اسی کے ساتھ ''خطرہ، خطرہ'' کی گردان کرنے لگا۔

ان نوجوانوں کو میں نے اس وقت بھی پیچھے پیچھے ہی آتے دیکھا جب ہم چڑیا گھر میں داخل ہوئے۔ آگے بڑھتے ہوئے اچانک نزہت نے مڑ کر دیکھا تو میں چونک اٹھا۔ مجھے اس کے چہرے پر خوف و ہراس کے آثار نظر آئے۔ اس نے بے اختیار اپنے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی ناہید کا ہاتھ تھام لیا۔ اب میں اس معاملے کی نوعیت کو کچھ کچھ سمجھتا جا رہا تھا۔ وہ

بات جو مجھے ناہید راستے میں بتانے والی تھی، اس کا تعلق شاید نزہت سے تھا۔ پھر ایک موقع پر ناہید کو مجھ سے علیحدگی میں بات کرنے کی مہلت مل ہی گئی۔ اس نے مجھے آواز دے کر ایک طرف تیزی سے بڑھتے ہوئے کہا۔ ''شہباز وہ دیکھو ادھر بن مانس ہے۔'' میں لپک کر اس کے قریب پہنچ گیا تو وہ جلدی سے بولی۔ ''ان دونوں نوجوانوں کو دیکھ رہے ہو تم؟'' ناہید نے ایک جانب مڑ کر خفیف سا اشارہ کیا۔ اسے میں نے بتایا کہ وہ نوجوان فرید گیٹ ہی سے ہمارا تعاقب کر رہے ہیں۔ یہ سن کر ناہید کہنے لگی۔ ''کل جب میں خریداری کرنے نزہت کے ساتھ گئی تھی تو بھی یہ ہمارے پیچھے لگے رہے تھے۔ ان میں سے وہ جو بڑے بڑے بالوں والا ہے، اس نے کل نزہت کو ایک پرچہ بھی دیا تھا اور پھر آگے بڑھ گیا تھا۔ میں دانستہ ایسی بن گئی جیسے کچھ نہ دیکھا ہو۔ نزہت نے اپنی دانست میں مجھ سے نظر بچا کر وہ پرچہ اپنے ہینڈ پرس میں رکھ لیا تھا۔'' ناہید بتاتی رہی۔ ''کل ہی کی طرح آج بھی وہ ہمارے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ شاید بڑے بالوں والے کو اپنے پرچے کا جواب مطلوب ہے۔ میں اب تک نزہت پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ ابھی تو اس نے کوئی پرچہ وغیرہ نہیں پھینکا۔''

''یہ تو واقعی تشویش کی بات ہے۔ نزہت بہرحال میرے دوست کی بہن ہے۔ یہ نوجوان مجھے صورت ہی سے آوارہ و بدکردار دکھائی دے رہے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ نزہت کہیں ان کے جال میں پھنس جائے!'' میں نے کہا۔

ناہید نے کہا۔ ''میں تو سمجھتی ہوں کہ نزہت کو اس نوجوان سے پرچہ لینا ہی نہیں چاہیے تھا۔ اگر اس لفنگے نے پرچہ دیا بھی تھا تو نزہت اسے وہیں پھینک دیتی۔''

''یہ معاملہ ایسا ہے کہ ارشد سے بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ میرا مشورہ ہے کہ تم اپنے طور پر نزہت کو ٹٹولنے کی کوشش کرو۔'' میں بولا۔

اسی وقت ارشد اور نزہت ہمارے قریب آگئے۔

''تم دونوں یہاں ہو اور میں تمہیں وہاں شیروں کے پنجروں کے پاس تلاش کر رہا تھا۔'' ارشد مجھ سے مخاطب ہوا۔

چڑیا گھر کی حدود میں ایک طرف نواب آف بہاولپور کا میوزیم بنا ہوا تھا۔ ہم ادھر قدم اٹھانے لگے۔ ان دونوں نوجوانوں کو میں نے تیزی کے ساتھ اپنے قریب سے گزر کر آگے جاتے ہوئے دیکھا۔ بڑے بالوں والے نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک کیمرا نکال لیا۔ وہ دونوں ہم سے پہلے ہی میوزیم میں داخل ہو چکے تھے۔ ہم نے جیسے ہی اندر قدم رکھا،

روشنی کا جھماکا ہوا۔ بڑے بالوں والے نے بڑی دیدہ دلیری کا ثبوت دیتے ہوئے ہماری تصویر کھینچ لی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ اس کا اصل مقصد نزہت کی تصویر کھینچنا ہوگا۔

تصویر کھینچ کر وہ کیمرا اپنی جیب میں رکھنے والا تھا کہ ارشد اس کی طرف جھپٹا۔

''تُو نے ہماری تصویر کیوں کھینچی؟'' ارشد نے اس کا گریبان پکڑ لیا۔ ''بول!''

''میں نے تمہاری نہیں میوزیم کے گیٹ کی تصویر کھینچی ہے۔ اس وقت تم لوگ اندر آ گئے تو اس میں میرا کیا قصور؟ چھوڑو میرا گریبان!'' اس نوجوان نے جھٹکا دے کر ارشد کی گرفت سے اپنا گریبان چھڑانا چاہا۔ اس دوران میں آگے بڑھ کر میں بھی ان کے قریب پہنچ چکا تھا۔ کیمرا ابھی تک اس نوجوان کے ہاتھ میں تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے کیمرا چھین لیا اور ریل نکالنے لگا۔ عین اسی لمحے پیچھے سے نوجوان کے ساتھی نے کیمرا مجھ سے چھیننا چاہا، مگر کامیاب نہ ہوا۔ میں کیمرے کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا۔

''لگتا ہے تُو اس طرح نہیں مانے گا۔'' وہ کسی درندے کی طرح غرایا اور پھر اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر چاقو نکال لیا۔

کھٹکے سے کھلنے والا چاقو کھولنے میں اس نے دیر نہیں لگائی۔ یہ دیکھتے ہی میں اچھل کر پیچھے ہٹا۔ مجھے خبر نہیں تھی کہ میرے بالکل پیچھے ہی ناہید کھڑی ہوگی۔ میں اس سے ٹکرایا تو وہ اپنے جسم کا توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ گرتے گرتے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ میری توجہ ناہید کی طرف مبذول ہوئی تو چاقو والے نوجوان کو موقع مل گیا۔ اس نے میرے اوپر چھلانگ لگا دی۔

اس اچانک حملے کی وجہ سے میں سنبھل نہ سکا اور زمین پر گر گیا۔ چاقو والا نوجوان اب میرے اوپر سوار تھا۔ میں نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ قریب ہی ارشد اور بڑے بالوں والا ایک دوسرے سے بھڑے ہوئے تھے۔ میوزیم ہال میں اس وقت زیادہ افراد نہیں تھے۔ پھر بھی وہ بیچ بچاؤ کی کوشش کرنے لگے اس عرصے میں کیمرا میرے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا تھا۔

چاقو والے نوجوان کی کلائی کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے میں نے کروٹ لی اور پھر اپنے جسم کی پوری طاقت لگا کر اسے ایک طرف دھکیل دیا۔ خدا جانے وہ کس طرح گرا کہ خود اسی کا چاقو اس کے سینے میں اتر گیا۔ اس کے منہ سے نکلنے والی چیخ بہت ہولناک تھی۔ میں اچھل کر کھڑا ہوا تو اس نوجوان کے سینے کی بائیں جانب چاقو پیوست تھا۔ اس کے سینے سے خون ابلتے دیکھ کر میرے ہوش اڑ گئے۔ میوزیم میں موجود لوگ چیخنے لگے۔ ''خون ہو گیا..... خون ہو گیا!''

بڑے بالوں والا جو ارشد سے بھڑا ہوا تھا، لوگوں نے بیچ بچاؤ کرا کے اسے الگ کر دیا تھا اس نے جو اپنے ساتھی کی یہ حالت دیکھی تو بھاگ اٹھا۔ خطرے کا احساس ہوتے ہی میں نے ناہید کا ہاتھ تھاما اور تیزی سے میوزیم ہال کے گیٹ کی طرف بڑھا۔ ارشد نے بھی یقیناً خطرہ محسوس کر لیا تھا۔ وہ بھی حواس باختہ نزہت کو ساتھ لیے میرے پیچھے لپکا۔ ہال کے باہر موجود چوکیدار اس وقت اپنے ہاتھ میں ڈنڈا تھامے گیٹ سے اندر آ رہا تھا۔

''کیا ہوا؟..... کیا ہوا؟'' چوکیدار نے مجھ سے پوچھا۔

''ابھی ایک نوجوان کسی کو قتل کر کے بھاگا ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں میں نے اسے بھاگتے دیکھا تھا۔'' چوکیدار گھبرا کر پلٹا۔ ''میں اسے پکڑتا ہوں۔''

اسی لمحے مجھے اس کیمرے کا خیال آیا جو ہال ہی میں رہ گیا تھا۔ اس کیمرے کا پولیس کے ہتھے چڑھنا خطرناک ہوتا۔ کیمرے کی ریل میں ہماری ایک تصویر موجود تھی۔ اس تصویر میں ناہید بھی تھی اور میں بھی۔ آگے بڑھتے بڑھتے میں پلٹنے ہی والا تھا کہ ناہید نے سختی سے میرا بازو پکڑ لیا۔

''وہ..... وہ کیمرا..... اس میں.....؟''

''لعنت بھیجو اس پر!'' ناہید نے میری بات کاٹ دی۔ ''جلدی یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو۔''

قتل کی خبر آگ کی طرح سارے چڑیا گھر میں پھیل گئی تھی۔ وہاں موجود افراد تیزی سے گیٹ کی طرف بھاگ رہے تھے ہم نے بھی اس صورت حال سے فائدہ اٹھایا اور لوگوں کی بھیڑ میں شامل ہو کر چڑیا گھر کے باہر آ گئے۔ بڑے بالوں والے نوجوان کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ اس کا اسکوٹر بھی غائب تھا۔ یقیناً وہ اسکوٹر پر بیٹھ کر فرار ہو چکا تھا۔

☆======☆======☆

جو کچھ بھی ہوا، خلاف توقع ہی تھا۔ اس میں ہمارے ارادے کو کوئی دخل نہیں تھا۔ ایک تانگے میں بیٹھ کر ہم فوراً ہی فرید گیٹ کے لیے روانہ ہو گئے۔ راستے بھر میں یہی سوچتا رہا کہ کیمرا وہاں چھوڑ کر ہم سے سخت غلطی ہوئی ہے پولیس کسی نہ کسی طرح سراغ لگاتی ہوئی بڑے بالوں والے تک پہنچ جاتی۔ مقتول بہرحال اس کا دوست تھا۔ کیمرے میں موجود تصویر کے ذریعے بڑے بالوں والا میری نشان دہی کر دیتا۔ وہ نزہت پر ڈورے ڈال رہا تھا۔ اس

لیے اسے ارشد کے گھر کا علم بھی ہوگا۔ ایسی صورت میں پولیس کو مجھ تک پہنچنے میں زیادہ دشواری نہ ہوتی۔ ارشد کا گھر ان حالات میں میرے اور ناہید کے لیے محفوظ نہیں رہا تھا۔

گھر آتے ہی میں نے ارشد کو نشست گاہ میں لے جا کر اس معاملے پر گفتگو ضروری سمجھی۔ ارشد اس غلط فہمی کا شکار تھا کہ قتل میرے ہاتھوں ہوا ہے۔ میں نے اس کی یہ غلط فہمی دور کر دی تو وہ کسی قدر مطمئن نظر آنے لگا میرے ذہن میں جن خدشات نے جنم لیا تھا، ان سے ارشد کو بھی بے خبر نہیں رکھا۔

''پھر؟...... پھر کیا کیا جائے؟'' ارشد نے گھبرا کر سوال کیا۔

''قتل کا الزام اگر آیا بھی تو مجھ پر آئے گا، تجھ پہ نہیں۔'' میں نے اسے سمجھایا۔ ''تجھے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر...... اگر مجھے فوری طور پر کیمرے کا خیال آ جاتا اور وہاں سے میں کیمرا اٹھا لیتا تو کوئی خطرہ نہ ہوتا۔ اب...... اب تو بس ایک ہی صورت ہے۔''

''کیا؟'' ارشد بول اٹھا۔

میں نے ٹھنڈا سانس بھر کے جواب دیا۔ ''یہی کہ میں، ناہید کو ساتھ لے کر جلد از جلد اس شہر سے نکل جاؤں۔''

''لیکن میرے یار، تُو یہاں سے جائے گا کہاں؟'' ارشد نے فکر مند ہو کر پوچھا۔

''اب جہاں بھی تقدیر لے جائے۔ ممکن ہے میرے بارے میں پولیس تجھ سے پوچھ گچھ کرے تو......؟''

''لیکن پولیس مجھ تک کس طرح پہنچ سکتی ہے؟ اسے کیا معلوم کہ میں کہاں رہتا ہوں!''

مجبوراً مجھے ارشد کے اس سوال کا جواب دینا ہی پڑا۔ میں نے جو کچھ کہا تھا، اس کی تصدیق کے لیے ناہید کو بھی نشست گاہ میں بلوا لیا۔

سب کچھ جان کر ارشد کے چہرے پر شدید غصے کے آثار نظر آنے لگے۔ پھر وہ بولا۔

''تو اس بدبخت نے دراصل نزہت کی تصویر کھینچی تھی! میں...... اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا!''

ارشد طیش میں آ گیا۔ ہم اسی کے سبب اصل موضوع گفتگو سے ہٹ گئے۔

میں نے اور ناہید نے بڑی مشکل سے اس کا غصہ ٹھنڈا کیا۔

''ہاں تو میں تجھ سے یہ کہہ رہا تھا ارشد کہ پولیس کی پوچھ گچھ پر تجھے سوچ سمجھ کر بیان دینا ہے۔'' میں نے کہا۔

''تُو ہی بتا دے، کیا بیان دوں؟'' ارشد نے مجھ سے دریافت کیا۔

''اس کمینے بڑے بالوں والے کے بیان کی روشنی میں یہ تو ممکن نہیں کہ تُو مجھے پہچاننے ہی سے انکار کر دے۔ وہ خبیث یہی بیان دے گا کہ جس شخص نے قتل کیا، وہ تیرا دوست ہی تھا۔ میرا مشورہ ہے کہ یہ واقعہ جس طرح پیش آیا ہے۔ تُو اسی طرح پولیس کے سامنے بیان کر دے۔''

''میں تیری بات کا مطلب نہیں سمجھا۔ فائدہ کیا ہوگا اس سے۔'' ارشد کے چہرے سے الجھن کا اظہار ہونے لگا۔

''میں تجھے بتاتا ہوں۔'' میں بولا۔ ''ایک بات یہ سمجھ لے کہ پولیس ایک ہی واقعے کے بارے میں بار بار سوال کرتی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اگر جھوٹا بیان دیا گیا ہے تو کسی بھی مرحلے پر ظاہر ہو جائے۔ جھوٹ بولنے کی صورت میں عموماً آدمی کسی نہ کسی سوال کا جواب دیتے ہوئے اپنے پہلے بیان پر قائم نہیں رہ پاتا، لیکن اس نے اگر سچا بیان دیا ہے تو لاکھ مرتبہ پوچھے جانے پر بھی اس کا جواب ایک ہی ہوگا۔ سمجھ گیا؟''

''ہاں تُو یہ تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' ارشد نے میری تائید کی۔

''اب فرض کر پولیس تجھ تک پہنچ جاتی ہے اور میرے متعلق معلوم کرتی ہے تو تجھے یہی کہنا ہے کہ میں تیرا دوست ہوں۔ میں تجھ سے ملنے بہاولپور آیا تھا اور تُو مجھے اپنے ساتھ چڑیا گھر کی سیر کرانے لے گیا تھا۔ وہاں جو کچھ ہوا پھر تجھے بیان کر دینا ہے، اسی کے ساتھ یہ بھی کہ قتل میرے ہاتھوں نہیں ہوا جس کی تفصیل میں بتا چکا ہوں۔ اس کے باوجود کہ میں قتل کے جھوٹے الزام میں کہیں پھنس نہ جاؤں۔ تیرے گھر سے چلا گیا۔ کہاں؟ ظاہر ہے کہ تجھے معلوم ہی نہیں تُو کیا بتائے گا! اس طرح کم از کم تجھ پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔'' میں نے تفصیل کے ساتھ ساری بات اس کے ذہن میں بٹھا دی۔

''اور اگر پولیس نے ناہید بی بی کے بارے میں سوال کیا تو؟'' ارشد نے پوچھا۔

''ہاں یہ مسئلہ غور طلب ہے۔'' میں چونک اٹھا کیوں کہ اس طرف میرا ذہن ہی نہیں گیا تھا۔ قتل کی عینی شاہد ہونے کے سبب پولیس یقیناً نزہت کا بیان بھی لیتی۔ اس کے علاوہ تصویر میں بھی نزہت کے ساتھ ناہید نظر آتی۔ یہ چھپانا بہر حال مشکل ہو جاتا کہ میں اکیلا ہی بہاولپور آیا تھا۔

مجھے سوچ میں گم دیکھ کر ناہید بول اٹھی۔ ''جب سچا بیان ہی دینا ہے تو پھر میرے بارے میں چھپانے کی کیا ضرورت ہے!''

''یہ بات اخبارات میں بھی آ سکتی ہے ناہید بی بی!'' میں نے کہا۔

''تو آیا کرے۔ اس سے کیا فرق پڑ جائے گا! یہی تو ہوگا کہ چوہدری صاحب کو پتا چل جائے گا، ناہید ابھی زندہ ہے اور وہ اسے قتل کرانے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔'' ناہید کی آواز میں چبھن تھی۔ ''میں ان سے اور ان کے زر خرید قاتلوں سے نہیں ڈرتی۔''

میں نے سوچا، یہ راز تو ایک نہ ایک دن بہر حال کھل ہی جانا ہے کہ ناہید زندہ ہے اور دشمنوں کی قید سے فرار ہو گئی ہے۔ سردارے جیسا گھاگ یہ سراغ تو لگا ہی لیتا۔ پھر یہ معما بھی حل ہو جاتا کہ میں نے حویلی سے کیوں راہِ فرار اختیار کی۔

''تو پھر ٹھیک ہے ارشد!'' میں سوچ کر بولا۔ ''پولیس اگر ناہید بی بی کے بارے میں پوچھے تو بتا دینا کہ یہ بھی میرے ہی ساتھ بہاولپور آئی تھیں۔ باقی ان کے بارے میں تجھ سے میں نے جو باتیں کی تھیں۔ ان کے ذکر کی ضرورت نہیں۔ ہم نے تم لوگوں کو یہی بتایا تھا کہ گھومنے پھرنے بہاولپور آئے تھے۔ ٹھیک ہے، سمجھ گیا؟''

''ہاں سمجھ گیا۔'' ارشد نے گہرا سانس لیا۔ ''مگر اب تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ تُو ناہید بی بی کو لے کر یہاں سے کہاں جائے گا!''

''اللہ کی زمین بہت بڑی ہے میرے یار! ہم کہیں بھی چلے جائیں گے۔ میرے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں اس لیے کہ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔''

''تیرا کہنا غلط نہیں شہباز! مگر یہ دنیا بے گناہوں کو بھی سزا دینے سے نہیں چوکتی۔ اگر تُو میرا کہا مانے تو کچھ دن اسی شہر میں تیرے رہنے کا بندوبست کر سکتا ہوں۔ کوئی ضروری تو نہیں کہ تُو نے جن خطرات اور اندیشوں کا اظہار کیا، وہ درست ہی ثابت ہوں۔ اپنے اور ناہید بی بی کے مستقبل کا کوئی فیصلہ تجھے جلد بازی میں نہیں کرنا چاہئے۔ اس طرح ناہید بی بی کے ساتھ تیرا کہیں جانا خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ لوگ تیری اور ناہید بی بی کی طرف سے طرح طرح کے شکوک و شبہات میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ یہاں تو پھر بھی میں موجود ہوں، کسی اجنبی شہر میں تیرا کون ہوگا۔ میرے دوست!'' ارشد نے حالات و واقعات کی روشنی میں بڑی لجاجت کے ساتھ اپنی تجویز دی۔

اس میں شک نہیں کہ ارشد کی بات بے وزن نہیں تھی۔ ناہید کو میرے ساتھ دیکھ کے کسی کو شک نہ ہو، میں اسی لیے تو اسے لے کر بہاولپور آیا تھا۔ میں نے ناہید کے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات سے یہ اندازہ بھی لگایا کہ ارشد کی تجویز سے وہ بھی متاثر ہوئی ہے۔

مجھے سوچ میں گم دیکھ کر ارشد مزید بولا۔'' میرے ایک دوست کا مکان یہیں فرید گیٹ میں کرائے کے لیے خالی ہے۔ اگر تُو کہے تو میں بات کر لوں؟''

''مگر تُو مالک مکان کو ہمارے بارے میں بتائے گا کیا؟ ظاہر ہے کہ مالک مکان میرے دوست کے والد ہی ہوں گے!'' میں نے پوچھ لیا۔

''اگر ناہید بی بی راضی ہو جائیں تو یہ کوئی مسئلہ نہیں حالات کے پیشِ نظر کچھ جھوٹ تو بولنا ہی پڑے گا۔'' ارشد غالباً کچھ کہتے ہوئے جھجک رہا تھا۔

''تُو ناہید بی بی کی پروا مت کر، تیرے ذہن میں جو کچھ ہے بتا دے۔'' میں بولا۔

''میں کہہ دوں گا کہ گاؤں سے میرا ایک دوست روزگار کی تلاش میں یہاں آیا ہے۔''

''تو اس میں ناہید بی بی کے راضی نہ ہونے کا تجھے خطرہ کیوں ہے؟''

''میں تجھے یہی تو بتانے والا تھا کہ بیچ میں بول اٹھا۔'' ارشد نے کہا۔ ''تیرے ساتھ ناہید بی بی کے رہنے پر ایک ہی صورت میں کسی کو شک نہیں ہوگا۔''

میں اپنے دوست کی بات کچھ کچھ سمجھنے لگا تھا، پھر بھی اس سے وضاحت چاہی۔ ''وہ ہی صورت میں تجھ سے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔''

''میں یہ ظاہر کروں گا کہ میرے دوست کے ساتھ اس...... کی بیوی بھی ہے۔ میں اسی لئے تو ناہید بی بی کے راضی ہونے کی بات کر رہا تھا۔'' ارشد نے آخر کہہ ہی دیا۔

یہ سن کر ناہید کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کے گزر گیا۔ میں سوچنے لگا کہ حالات کے پیشِ نظر ارشد کی تجویز غلط نہیں ہے۔

''میں تو یہ بھی سوچ رہا ہوں شہباز کہ تیرا اور ناہید بی بی کا اصل نام بھی ظاہر نہ کروں۔'' ارشد پھر بولا۔

''اگر ایسا ہی ہے تو میرے گاؤں کا صحیح نام بتانے کی بھی کیا ضرورت ہے!''

''ہمارے کچھ عزیز رشتے دار خان پور میں بھی رہتے ہیں۔ خان پور، ضلع رحیم یار خاں میں ہے۔ میں خان پور کا نام بھی لے سکتا ہوں۔'' ارشد نے کہا۔

''اور مجھے اپنا دوست بتانے کے بجائے رشتے دار بھی ظاہر کر سکتے ہو۔'' میں نے یہ کہہ کر سوالیہ نظروں سے ناہید کو دیکھا۔ ''کیا خیال ہے ناہید بی بی؟''

''تم دونوں دوست جو بھی مناسب سمجھو فیصلہ کر لو۔'' ناہید نے گویا اپنی رضا مندی ظاہر کر دی۔

اسی وقت میرے ذہن میں ایک اور خیال بھی آیا۔ اس طرح میں اور ناہید فوری طور پر پیش آنے والے کسی خطرے سے بچ سکتے تھے۔ پھر اگر ہونے والے قتل کے متعلق اخبارات میں بھی خبریں لگ جاتیں تو ان کا ہم پر کوئی اثر نہ پڑتا۔ مقام اور ناموں کی تبدیلی

یہاں بھی ہمارے کام آسکتی تھی۔ اسی خیال کے تحت میں نے ارشد کو مخاطب کیا۔ ''ارشد! اگر سچ میں تھوڑا سا جھوٹ بھی شامل کر دیا جائے تو چل جاتا ہے۔ پولیس کو بیان دیتے وقت بھی تو میرے اور ناہید بی بی کے کچھ اور نام بتائے جاسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ گاؤں کے بجائے رحیم یار خان یا کسی دوسرے شہر کا نام لیا جاسکتا ہے۔ باقی بیان حقائق ہی پر مبنی ہوگا یوں سمجھ کر تیرا ایک دوست اپنی بیوی کے ساتھ رحیم یار خان سے یہاں سیر کرنے آیا تھا اور اسے یہ واقعہ پیش آگیا۔ پھر وہ دونوں کچھ بتائے بغیر خوفزدہ ہو کر کہیں چلے گئے۔''

''لیکن پولیس ایسی صورت میں رحیم یار خان کا پتا ضرور پوچھے گی۔ پھر پتا غلط ثابت ہونے پر مجھ پہ شک کرے گی۔ ذرا سوچنے دے! ابھی تو ہمارے پاس وقت ہے۔'' ارشد یہ کہہ کر کچھ دیر خاموش رہا، پھر بولا، ''میرا خیال ہے شہباز کہ گاؤں کا نام بدلنے کی ضرورت نہیں۔ صرف ناموں کی تبدیلی ہی کافی ہے۔ یہ میں اس لیے بھی کہہ رہا ہوں کہ ہمارا گاؤں یہاں سے بہت دور ہے۔ پولیس اتنی فرض شناس نہیں کہ سرگودھا ضلع کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں جا کر پوچھ گچھ کرتی پھرے۔ بس ذرا اس معاملے میں خاص طور پر نزہت کو سمجھا پڑے گا کیوں کہ پولیس اس کا بیان ضرور لے گی۔''

''نزہت کے علاوہ اپنی امی اور چچا امجد کو بھی اعتماد میں لینا ہوگا۔'' میں نے رائے دی۔ ''پولیس ان سے بھی تیرے اور نزہت کے بیان کی تصدیق کرسکتی ہے۔''

''پھر تو انہیں پوری بات بتانی ہوگی۔''

''تو اس میں حرج بھی کیا ہے!''

ارشد نے اقرار میں سر ہلا دیا، پھر مجھ سے معلوم کیا۔ ''تو میں جاؤں مکان کی بات کرنے؟''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے رضامندی ظاہر کر دی۔ ''ہاں اپنے گھر والوں کو یہ نہ بتا کہ ہم دونوں اسی شہر میں ہیں۔ مکان کا معاملہ ہم راز ہی رکھیں تو اچھا ہے۔ نزہت اور خالہ سے میں بات کیے لیتا ہوں۔ چچا امجد سے بعد میں بھی بات ہوسکتی ہے۔ یا تیرا مشورہ ہو میں یہ ذمے داری خالہ میں پر ڈال دوں!''

ارشد نے میری رائے سے اتفاق کیا۔ ''امی ہی ابا جی سے بات کرلیں تو اچھا ہے میں تو کہتا ہوں کہ ان سے کچھ چھپانے کی ضرورت بھی نہیں۔ اس طرح بہت سے مسئلے حل ہو جائیں گے۔ پولیس کے پوچھ گچھ کرنے پر امی یا ابا جی کون سا یہ بتا دیں گے کہ تم دونوں یہیں ہو! فوری طور پر تم لوگوں کو چار پائیاں، برتن اور گھریلو استعمال کا خاصا سامان نہیں

خریدنا پڑے گا۔ اس کے علاوہ نزہت اور امی بھی ناہید بی بی سے جا کر ملتی جلتی رہیں گی اور انہیں تنہائی کا احساس نہیں ہوگا۔''

میرے نزدیک ارشد کی بات مناسب ہی تھی۔ اس کے گھر والوں پر اعتماد کیا جاسکتا تھا۔ اس سے یہ بات بھی سچ ثابت ہو جاتی کہ ارشد سے ہماری رشتے داری ہے۔ پھر محلے پڑوس والے بھی ہم پر شک نہ کرتے۔ میں نے اسی لیے ارشد کی بات مان لی اور بولا۔ ''خالہ کو میں، ناہید بی بی کی بپتا بھی سنائے دیتا ہوں ورنہ وہ یہ سوال بھی کرسکتی ہیں کہ ہم کرائے پر مکان لے کر یہیں بہاولپور میں کیوں رہ رہے ہیں، گاؤں واپس کیوں نہیں چلے جاتے؟ ویسے بھی یہاں رہنے کی صورت میں انہیں یہ باتیں بتانی ہی تھیں۔''

یہ سنتے ہی ارشد اٹھ کھڑا ہوا۔ میں اور ناہید گھر میں داخل ہوئے تو پتا چلا کہ چڑیا گھر میں جو واقعہ پیش آیا تھا، اپنی ماں کو نزہت بتا چکی تھی۔ ارشد کی امی کے چہرے پر اسی لیے ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ارشد کا چھوٹا بھائی اسکول گیا ہوا تھا۔ چچا امجد دکان پر تھے۔ گھر میں نزہت اور خالہ ہی تھیں۔ خالہ مجھے دیکھتے ہی بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگیں۔ ''اب کیا ہوگا شہباز بیٹے؟ یہ تو بہت برا ہوا۔ نزہت نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔''

''آپ فکر نہ کریں خالہ! انشاء اللہ کچھ نہیں ہوگا۔'' میں نے انہیں تسلی دی۔ ''جو بھی ہوا اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں۔''

''وہ تو خیر نزہت مجھے بتا چکی ہے کہ اس لفنگے کا چاقو خود ہی اس کے سینے میں اتر گیا تھا۔ تم نے تو اپنی جان بچانے کے لیے اسے اپنے اوپر سے دھکیلا تھا۔''

یہ سن کر میرے دل کو ڈھارس بندھی کہ کم از کم نزہت میری بے گناہی کی عینی شاہد تھی۔ میں نے اسی لیے نزہت سے کہا۔ ''اگر خدانخواستہ پولیس کے سامنے بیان دینا پڑے تو تم وہی بتانا جو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ اسی نے چاقو نکالا تھا۔''

''جی...... جی ہاں۔'' نزہت کہنے لگی۔

ارشد سے گفتگو کر کے میں نے اس معاملے سے نمٹنے کی جو تدبیر سوچی تھی، خالہ کو بھی بلا جھجک بتا دی۔ اس پر انہوں نے وہی سوال کیا جو میرے لیے غیر متوقع نہیں تھا۔ میں نے انہیں جواب دیا۔ ''بات دراصل یہ ہے خالہ کہ ہم گاؤں بھی واپس نہیں جاسکتے۔ ارشد کو تو میں ساری بات بتا چکا ہوں، لیکن آپ کو بھی بتانا ضروری ہے۔ ناہید بی بی کے ساتھ اتنا بڑا ظلم ہوا ہے کہ آپ بھی سن کر حیرت زدہ رہ جائیں گی۔'' پھر میں نے ناہید پر گزرا ہوا واقعہ مختصراً بیان کر دیا۔

پورا اندوہ ناک واقعہ سن کر خالہ گنگ سی ہو کر رہ گئیں، پھر بولیں۔ ''شہباز بیٹے! تم نے ناہید بیٹی کی جان بچا کر بہت بڑی نیکی کی ہے۔ اللہ تمہیں اس کا اجر دے گا۔ ہائے ہائے کیا زمانہ آ لگا ہے! سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ کوئی باپ اتنا پتھر دل بھی ہو سکتا ہے۔''

''خالہ! آپ سے میں نے جو باتیں کی ہیں، چچا امجد کو بھی بتا دیجئے گا۔ میں خود انہیں بتاتا، مگر اس وقت وہ دکان پر ہیں میں آپ کو بتا ہی چکا ہوں کہ ارشد مکان کی بات کرنے گیا ہے۔ ہم جتنی جلدی یہاں سے چلے جائیں اچھا ہے۔'' میں بولا۔

''شہباز بیٹے! خود کو اکیلا نہ سمجھنا، ہم تمہارے ساتھ ہیں۔'' خالہ نے مجھے دلاسا دیا۔ ''تمہیں جس چیز کی ضرورت ہو، بلا جھجک یہاں سے اٹھا کر لے جانا، گھر گرہستی کی سو چیزیں ہوتی ہیں، کیا کیا خریدتے پھرو گے!...... ہاں یہ ضرور بتا دو کہ خدانہ کرے پولیس پوچھ گچھ کرنے آئے تو تم دونوں کے کیا نام لیے جائیں۔''

فوری طور پر میرے ذہن میں جو دو نام آئے، میں نے بتا دیئے۔ ''سعید اور نبیلہ۔''

''یہ معاملہ میں نے ارشد پر چھوڑ دیا تھا۔ مالک مکان کو وہ جو نام بھی بتا کر آئے گا، معلوم ہو جائیں گے۔'' میں نے جواب دیا۔

خالہ سے گفتگو کرتے ہوئے مجھے خاصی دیر ہو گئی کیوں کہ انہیں ناہید کی بپتا بھی سنانی پڑی تھی۔ ارشد مکان کی چابی لے کر ہی لوٹا۔ ایک مہینے کا پیشگی کرایہ بھی وہ اپنے پاس سے ادا کر آیا تھا۔ میں نے اسے وہ رقم دینی چاہی، مگر وہ لینے پر آمادہ نہ ہوا۔

''شہباز! تُو نے امی سے بات کر لی؟'' ارشد نے مجھ سے دریافت کیا۔

اس پر خالہ خود ہی بول اٹھیں۔ ''شہباز بیٹے نے مجھ سے کچھ نہیں چھپایا اور ارشد! تُو یہ بتا مالک مکان کو ان کے کیا نام بتائے ہیں؟''

''اشرف اور عندلیب'' ارشد نے بتایا

''پولیس کو ہمارے نام سعید اور نبیلہ بتانے ہیں۔ میں نے خالہ اور نزہت کو یہی نام بتائے ہیں۔ تجھے بھی یہ دونوں نام اپنے ذہن میں رکھنے ہیں ارشد!'' میں نے تاکید کی۔ پھر ہم اسی روز دوپہر تک کرائے کے مکان میں منتقل ہو گئے۔ ارشد اور اس کے گھر والوں نے ہمارا بہت ساتھ دیا۔ خالہ اور نزہت نے ناہید کے ساتھ مل کر پورے گھر کی صفائی کر ڈالی۔ اس عرصے میں ارشد اور میں سامان ڈھو ڈھو کر وہاں پہنچاتے رہے۔ چارپائیاں، برتن بھاڑے، بستر، گھر کے لیے دیگر ضروری اشیاء وغیرہ ہمیں کچھ بھی خریدنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ کوچہ حسن سے وہ مکان زیادہ دور نہیں تھا اس لیے کوئی دشواری نہ ہوئی۔

ہم دونوں کے لیے دوپہر کا کھانا بھی خالہ ہی نے ارشد کے ہاتھ بھجوا دیا۔ وہ پہلے ہی ناہید سے کہہ چکی تھیں کہ دو تین دن تک اسے کھانا پکانے کی ضرورت نہیں۔ انہوں نے اتنے خلوص اور اصرار کے ساتھ یہ بات کی تھی کہ ہم انکار نہ کر سکے۔

جب ہم نے دوپہر کا کھانا بھی کھا لیا تو میں، ناہید سے مخاطب ہوا۔ ''ارشد اور اس کے گھر والوں نے واقعی محبت کا حق ادا کر دیا۔ اتنا تو اپنے عزیز رشتے دار بھی نہیں کرتے۔ اب تم سب سے پہلے تو باورچی خانے میں جا کر یہ دیکھو کہ کس کس چیز کی اور ضرورت ہے بلکہ میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں اور سامان ایک پرچے پر لکھتا جاتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ایک تو گیس کا چولہا لینا پڑے گا۔ اس کے علاوہ......''

''چلو وہیں چل کر دیکھ لیتے ہیں نا!'' ناہید بول اٹھی، پھر کہنے لگی۔ ''شہباز اب تو واقعی ایسا لگ رہا ہے جیسے ہم نے اپنی زندگی کے نئے سفر کا آغاز کر دیا ہو۔ مجھے تو اصل خوشی یہ ہے کہ میرے ہم سفر تم ہو۔ آج ہم دنیا دکھاوے کے لیے ایک دوسرے جیون ساتھی بنے ہیں تو وہ دن بھی انشاء اللہ جلد آئے گا جب ہمیں اپنے اس خواب کی تعبیر مل جائے گی۔''

میں بھی ناہید کے خیال کی تائید کرتا ہوا اس کے ساتھ ساتھ باورچی خانے میں آ گیا۔ وہ مجھے سامان لکھوانے لگی۔ جب اس نے باورچی خانے کے لیے ضروری سامان لکھوا دیا تو میں نے اس سے کہا۔ ''اب مہینے کا سودا بھی لکھوا دو، میرا مطلب ہے آٹا دالیں وغیرہ۔''

''مجھے اس کا کوئی تجربہ تو نہیں، پھر بھی لکھتے جاؤ!'' وہ بولی۔ ''جو چیز کم پڑی پھر منگوا لوں گی۔''

دو الگ الگ پرچوں پر تمام سامان اور مہینے کا سودا لکھ کر میں گھر سے نکل گیا۔ یہ سارا سامان اور سودا فرید گیٹ ہی سے مل سکتا تھا۔ میں آتے جاتے بازار دیکھ چکا تھا۔ ابھی میں گھر سے کچھ دور ہی آیا تھا کہ چونک اٹھا۔ سامنے سے میں نے ایک رکشا آتے دیکھا۔ میں نے اس رکشے میں بڑے بالوں والے اسی نوجوان کو دیکھا جس سے چڑیا گھر کے میوزیم میں جھگڑا ہوا تھا۔ رکشے میں اس کے ساتھ ایک سوٹ کیس بھی تھا میں ایک شخص کی آڑ میں ہو گیا تا کہ اس کی نظر مجھ پر نہ پڑے۔ اس سے میں نے دو باتوں کا اندازہ لگایا۔ ایک تو یہ کہ وہ نوجوان وہیں کہیں فرید گیٹ میں رہتا ہوگا، دوسرے یہ کہ وہ اس شہر سے راہِ فرار اختیار کر رہا ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو اس کے ساتھ سوٹ کیس کا کوئی جواز نہیں تھا۔

رکشا بھیڑ میں گم ہو گیا تو میں بازار سے سامان خریدنے لگا۔ دو تین پھیروں میں

مطلوبہ سامان اور سودا میں نے اپنے گھر پہنچا دیا۔ اس میں مجھے شام ہوگئی۔ ناہید کے سا[illegible]
سامان اور سودا باورچی خانے میں رکھوانے، گیس کا چولہا لگانے کی غرض سے میں [illegible]
مصروف رہا۔ مغرب کے بعد ارشد بھی آگیا۔ اس وقت تک ہم کام سے فارغ ہو چکے تھے

تین کمروں کا وہ چھوٹا سا گھر ہم دو افراد کی ضروریات کے لئے کافی تھا۔ ایک کمر[illegible]
میں ارشد نے میز اور تین چار کرسیاں لا کر ڈال دی تھیں۔ اس کمرے کو گویا ہم نے نش[illegible]
گاہ بنا لیا تھا۔ گھر کے بقیہ دو کمرے الگ لگ میرے اور ناہید کے استعمال میں تھے۔ [illegible]
والوں کی نظر میں ہم میاں بیوی سہی لیکن ارشد اور اس کے گھر والے تو ہماری حقیقت [illegible]
واقف تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہم نے الگ الگ کمروں میں چارپائیاں بچھائی تھیں۔ میرا سو[illegible]
کیس ایک کمرے میں اور ناہید کا سوٹ کیس نیز ضروریات کا دیگر سامان دوسرے کمر[illegible]
میں تھا۔ ارشد کی آمد پر ہم نشست گاہ میں آبیٹھے تو میں نے اسے مخاطب کیا۔ ''تیرے [illegible]
ایک خوش خبری ہے ارشد!''

''وہ کیا؟'' ارشد نے چونک کر پوچھا۔

میں نے اسے بڑے بالوں والے مفرور نوجوان کے بارے میں بتا دیا۔ ناہید [illegible]
لیے بھی یہ خبر نئی تھی۔ وہ اسی لیے حیرت سے بولی۔ ''تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟''

''ہم دونوں ہی کیوں کہ گھر کے کام کاج میں لگے ہوئے تھے اس لیے میں نے سو[illegible]
بعد میں بتا دوں گا۔ اب ارشد بھی آگیا تو مجھے یہ بات یاد آگئی۔'' میں نے وضاحت کی۔

''یہ بہت اچھا ہوا۔'' ارشد نے اطمینان کا اظہار کیا۔

''ہاں۔ پولیس اب تیرے گھر تک نہیں پہنچ سکے گی۔'' میں بولا۔

''لیکن وہ کیمرا تو پولیس کے ہتھے چڑھ گیا ہو گیا جس میں ہماری ایک تصویر مو[illegible]
ہے۔'' یہ کہتے ہوئے ارشد کے لہجے میں کسی قدر فکرمندی تھی۔

''ممکن ہے اس کیمرے سے اور بھی تصویریں کھینچی گئی ہوں اور پولیس ہماری تص[illegible]
کوئی اہمت نہ دے۔'' میں نے قیاس آرائی کی۔

''خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔'' ارشد کہنے لگا۔ ''اب دیکھنا یہ ہے کہ کل کے اخبار
میں اس قتل کی کیا تفصیل شائع ہوتی ہے!''

''جو ہو گا، دیکھا جائے گا اللہ مالک ہے۔'' میں نے ارشد کو دلا سا دے کر نا
مخاطب کیا۔ ''کیا خیال ہے ناہید بی بی، ارشد کو چائے پلائی جائے؟''

''کیوں نہیں!'' ناہید یہ کہتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ارے نہیں، آپ رہنے دیں۔ مجھے چائے پینے کی خواہش بالکل نہیں ہے۔'' ارشد
نے اصرار کر کے ناہید کو روک لیا۔ پھر اچانک اس نے پوچھا۔ ''ناہید بی بی! گھر میں چولہا تو
ہے نہیں، پھر آپ چائے کیسے بنا تیں! پھر چائے بنانے کے لیے دوسری چیزوں......''

''تیری اطلاع کے لیے سب سامان آچکا ہے گھر میں۔'' میں بول اٹھا۔ ''آ چل!
تجھے اپنے باورچی خانے کی سیر کراتے ہیں۔''

''کیا واقعی!'' ارشد نے اظہار حیرت کیا اور ہمارے ساتھ اٹھنے لگا۔

ناہید اور میں، ارشد کو اپنے ساتھ باورچی خانے میں لے آئے۔ میں نے بتایا۔
''دوپہر کو تیرے جانے کے بعد ہی میں سامان اور سودا لینے چلا گیا تھا۔ اسی وقت تو وہ کمینہ
مجھے ایک رکشے میں بیٹھ کر جاتا دکھائی دیا تھا۔ خیر اس پر لعنت بھیج! خالہ سے تجھے یہ کہنا ہے کہ
کل سے کھانا نہ بھجیں۔''

''کیا واقعی!'' ارشد نے اظہر رحیرت کیا اور ہمارے ساتھ اٹھنے لگا۔

''دو چار دن بعد بھی تو باورچی خانہ سنبھالنا ہی ہے تو پھر کل ہی سے سہی۔'' ناہید
بولی۔ ''آپ لوگوں کو ہماری وجہ سے ویسے ہی اتنی پریشانی اٹھانی پڑی ہے۔''

''آپ ہمارے گھر میں ایک ہی رات تو رہی ہیں۔ حالات ہی نے اچانک ایسی
نوعیت اختیار کر لی کہ دوسرے دن آپ کو اس مکان میں منتقل ہونا پڑا۔ ہمیں تو آپ کی
خدمت کا موقع ہی نہیں مل سکا۔ اگر یہ مجبوری آڑے نہ آجاتی تو ہم ہرگز آپ کو الگ نہ رہنے
دیتے۔'' ارشد کی آواز سے خلوص کا اظہار ہو رہا تھا۔ چند لمحے توقف کے بعد وہ پھر بولا۔
''میرا خیال ہے کہ میں اپنا کھانا بھی یہیں لے آتا ہوں۔ ہم تینوں ساتھ ہی کھانا کھالیں
گے۔ جب میں گھر سے چلا تھا تو امی روٹیاں ڈال رہی تھیں۔''

پھر ارشد اپنے گھر سے کھانا لے آیا اور ہم نے ساتھ کھانا کھایا۔ ناہید نے چائے بنالی
اور ہم نشست گاہ میں آبیٹھے۔ دیر تک ارشد سے گپ شپ کرتا رہا۔ وہ جب گیا تو رات کے
ساڑھے نو بج رہے تھے۔ میں جا کر گھر کا صدر دروازہ لگا آیا۔

وہ پہلی رات تھی جو ناہید اس گھر میں میرے ساتھ تنہا گزارنے والی تھی۔ یہ سوچ کر
مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔

''شہباز! میں الگ کمرے میں نہیں سوؤں گی۔'' ناہید نے مجھے مخاطب کیا۔ ''یا تو تم
اپنی چارپائی میرے کمرے میں اٹھا لاؤ یا پھر میں تمہارے......''

''لیکن کیوں؟'' میں نے سوال کیا، پھر سمجھانے لگا۔ ''صبح ارشد یا اس کے گھر والوں

میں سے کوئی آ گیا تو ہمیں ایک ہی کمرے میں سوتے دیکھ کر کیا سوچے گا!''

''صبح اٹھتے ہی ہم دوسرے کمرے میں چارپائی ڈال دیں گے۔ پھر تو انہیں مع نہیں ہوگا کہ ہم نے ایک ہی کمرے میں رات گزاری ہے!'' ناہید نے فوراً حل پیش کر د

''مگر یہ تو بتادو کہ اس کی ضرورت کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے الگ کمرے میں نیند نہیں آئے گی۔'' ناہید نے جواب دیا۔

''لکھن پور میں بھی تو تم الگ ہی کمرے میں سوتی تھیں!''

''وہ حالات اور تھے شہباز! لیکن اب تو حالات بدل چکے ہیں۔ میں مجبور نہیں آز ہوں۔''

ناہید کے اصرار پر مجھے اس کی بات ماننی ہی پڑی۔ میں اس کی چارپائی اور بستر ا کمرے میں اٹھا لایا۔ اس پر وہ خوش نظر آنے لگی۔ اس نے اپنی چارپائی میری چارپائی قریب ہی بچھوائی تھی۔ میں نے اپنا بستر درست کرتے ہوئے پوچھا۔ ''اب تو مطمئن ہو تم سکون سے سو جاؤ گی؟''

''ہاں۔'' اس نے اظہار اطمینان کیا۔ ''اب تو میں بہت آرام اور بے فکری سوؤں گی کیوں کہ تم جو میرے پاس ہو۔'' پھر اچانک چونک کر وہ کہنے لگی۔ ''شہباز! تم مجھ سے ایک ڈائری کا ذکر کیا تھا جس میں مختلف وظیفے لکھے ہوئے ہیں، وہ ڈائری تو دکھاؤ۔''

''دکھاتا ہوں۔'' میں یہ کہہ کر اٹھا اور کمرے میں دیوار کے قریب رکھے ہوئے ا سوٹ کیس کی طرف بڑھا۔ سوٹ کیس کھول میں نے ڈائری نکالی اور پھر ناہید کی چارپائی اس کے قریب بیٹھ گیا۔ ڈائری کا وہ ورق اب تک مڑا ہوا تھا جس کے ایک صفحے پر ''وظیفہ تلاش گمشدہ'' درج تھا۔ پہلے میں نے وہی صفحہ ناہید کو کھول کر دکھایا اور بولا۔ ''یہی وظیفہ پڑھ کر میں نے تمہارا سراغ لگایا تھا۔ یہ وظیفہ میری زندگی میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔''

''میں سمجھتی ہوں شہباز!'' اس نے مجھ سے ڈائری لیتے ہوئے کہا۔ ''تم اگر یہ وظیفہ نہ پڑھتے تو ہم دونوں کبھی نہ ملتے اور میں آج تمہارے ساتھ نہ ہوتی۔'' وہ کہہ کر ڈائری کے اوراق پلٹنے لگی۔ ''مجھے تو پہلے وہ وظیفہ دکھاؤ شہباز کہ جسے پڑھ کر عمر کم یا زیادہ کی جا سکتی ہے۔''

''لاؤ مجھے دو ڈائری، میں وظیفہ تلاش کرتا ہوں۔'' میں بولا تو اس نے ڈائری مجھے دے دی۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں نے اس سے معلوم کیا۔

''ناہید! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ تمہیں اسی خاص وظیفے سے اتنی دلچسپی

کیوں ہے؟''

''اس کی کئی وجوہ ہیں شہباز!'' اس نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔ ''فرض کرو ہم دونوں یہ وظیفہ پڑھ کر اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو دنیا کی نظروں سے چھپنا ہمارے لیے بہت آسان ہو جائے گا۔ ظاہر ہے کہ عمر کی کمی یا بیشی کے ساتھ ہمارے جسموں اور چہروں میں بھی تبدیلی آجائے گی۔ مثلاً تم اپنی موجودہ عمر کی بجائے چالیس برس کے ہو جاؤ تو بھلا کون تمہیں پہچان سکے گا! یہی صورت میرے ساتھ بھی پیش آ سکتی ہے۔ اس طرح ہم آئندہ پیش آنے والے ہر خطرے کا بڑی آسانی سے مقابلہ کر سکتے ہیں۔ پھر ہمیں دنیا کی اس بھیڑ میں کوئی تلاش نہیں کر سکے گا۔''

ناہید کی ان باتوں نے مجھے سوچ کی ایک نئی راہ دکھا دی۔ مجھے اس وظیفے کی تفصیلات اور شرائط زیادہ یاد نہیں تھیں۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد مجھے مطلوبہ وظیفہ مل گیا۔ میں نے بلند آواز میں سرخی کے نیچے لکھی ہوئی عبارت پڑھنی شروع کر دی۔ ''اس وظیفے کو پڑھنے کی مدت اکیس دن ہے۔ وظیفہ پڑھنے والے کے لیے یہ لازمی ہے کہ اکیس دن کے دوران میں اس سے ایک وقت کی نماز بھی قضا نہ ہو۔ وظیفہ پڑھنے کی مدت میں بالکل پاک صاف رہنا ہے۔ روزانہ رات کو زوال کا وقت گزرنے سے نماز فجر تک ایک ہی مقام پر بیٹھ کر وظیفہ پڑھنا ہے۔ جس کمرے میں وظیفہ پڑھا جائے وہاں ایک چراغ کی روشنی کے سوا کوئی اور روشنی نہیں ہونی چاہیے۔ وظیفہ پڑھتے ہوئے چراغ کی طرف نظر ہونی ضروری ہے، کسی اور طرف نہیں دیکھنا، جس طرح کہ نماز پڑھتے ہوئے اِدھر اُدھر نہیں دیکھتے۔''

''یہ تو زیادہ کڑی شرائط نہیں ہیں شہباز!'' ناہید بول اٹھی۔

''ابھی سنتی تو جاؤ، آگے اور بہت کچھ لکھا ہے جسے سن کر شاید تمہارا ارادہ بدل جائے۔'' میں نے آگے لکھی ہوئی عبارت پر نظر ڈالتے ہوئے بتایا۔

''تم پڑھو تو سہی انشاء اللہ میرا ارادہ نہیں بدلے گا۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولی۔

''تو سنو! وظیفہ پڑھنے والے کو تیسری ہی رات سے طرح طرح کی بھیانک شکلیں اور ایسے خوفناک مناظر دکھائی دے سکتے ہیں کہ اس کی حرکت قلب بند ہو جائے...... یعنی یوں سمجھو کہ زندگی داؤ پر لگ سکتی ہے۔ بولو بقیہ عبارت پڑھوں کہ اتنا ہی کافی ہے؟''

''مجھے ڈراؤ مت! پوری عبارت پڑھ کر سناؤ، اس کے بعد ہی کوئی فیصلہ ہو سکتا ہے۔'' ناہید نے اصرار کیا۔

اب میرے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ میں ناہید کی بات ٹال دیتا اس لیے وظیفے کے

بارے میں بقیہ عبارت پڑھ کر اسے سنانے لگا۔ ''تو سنو! لکھا ہے کہ جن افراد کا دل کمزور وہ ہرگز وظیفہ نہ پڑھیں۔ اس سے ان کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ سات راتیں گ جانے پر بھیانک شکلوں کے ساتھ ساتھ انتہائی ڈراؤنی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں گ کبھی تیز آندھی نیز طوفان کے جھکڑ چلتے محسوس ہوں گے اور کبھی کوئی درندہ دہشت نا آواز نکال کر وظیفہ پڑھنے والے پر حملہ آور ہوتا نظر آئے گا۔ کبھی ایسا لگے گا کہ زلز آ گیا ہے اور مکان زمین بوس ہونے والا ہے۔ وظیفے پر عمل کرنے والا اگر جائے نماز اٹھ گیا یا اس نے خوفزدہ ہو کر پڑھنا چھوڑ دیا تو اس کا زندہ بچنا ناممکن ہے۔ وظیفہ پڑھت ہوئے جو بھی وہ دیکھے یا سنے اسے فریب نظر اور فریب سماعت ہی سمجھے۔ انیسویں، بیسو اور اکیسویں راتیں بہت کٹھن ثابت ہو سکتی ہیں۔ ان آخری تین راتوں میں عامل کو بہ محتاط اور چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔ اسے باطل قوتوں کے کسی بھی فریب کا شکار نہیں ہونا وظیفے کی تکمیل کے بعد آخری روز صبح وہ اسم سنائی دے گا جسے تین مرتبہ دہرانے پر عامل ا اصل عمر کم یا زیادہ کر سکتا ہے۔ اس کا عرصہ ایک دن سے ایک سو سال تک ہے۔ ایسا کر کے لیے عامل کو صرف یہ سوچنا پڑے گا کہ وہ عمر کی کس منزل پر قیام کرنا چاہتا ہے! جسم تبدیلی کے ساتھ عامل کے ذہن پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ یعنی اس کا ذہن بالغ ہی ر گا۔ خواہ وہ ایک دن کا بچہ ہی کیوں نہ بن جائے۔ وہ جتنے عرصے بھی چاہے عمر کی کسی منزل ٹھہرنے پر قادر ہوگا۔ پھر جب چاہے گا اپنی اصل عمر کی طرف لوٹ سکے گا۔ اس کے لی اسے صرف اسم دہرانے کی ضرورت پڑے گی۔ اس وظیفے کو کوئی مرد بھی پڑھ سکتا ہے او عورت بھی، لیکن ان کا بالغ ہونا لازمی ہے۔ وظیفے کے الفاظ مندرجہ ذیل ہیں جنہیں مقرر وقت میں عامل کو پڑھتے رہنا ہے۔'' میں نے اعراب کے ساتھ لکھے ہوئے وہ الفاظ بھی پڑھے، پھر ناہید سے پوچھا۔ ''اب کہو، کیا کہتی ہو؟ وظیفہ خطرناک ہے؟''

''ہاں خطرناک تو ہے۔'' ناہید نے اعتراف کیا، پھر بولی۔ ''لیکن یہ بھی تو سوچ شہباز کہ کوئی بھی شے آسانی سے حاصل نہیں ہوتی۔''

''مگر ناہید، اس وظیفے کو تو پڑھنے سے جان بھی جا سکتی ہے۔'' میں نے اسے سمجھایا۔

''اور وظیفہ کامیاب ہونے کی صورت میں کتنی بڑی پُراسرار قوت حاصل ہو جائے گی، اس پر بھی تو غور کرو۔''

''زندگی بہت قیمتی ہوتی ہے ناہید! اسے محض کسی وظیفے کی خاطر داؤ پر نہیں لگایا جا سکتا۔''

''پھر تم نے ایسا کیوں کیا شہباز؟ کسی کی یادداشت گم ہو جانے کا مطلب بھی تو موت سے کم نہیں۔''

''وہ مجبوری تھی ناہید! میرے پاس تمہارا سراغ لگانے کے لیے اور کوئی راستہ نہیں تھا ورنہ میں ہرگز وظیفے کا سہارا نہ لیتا۔ اس ڈائری میں اور بھی وظائف درج ہیں جن کی شرائط اتنی کڑی نہیں ہیں۔ اگر تمہیں ایسا ہی شوق ہے تو کوئی اور وظیفہ پڑھ کر دیکھ لو۔''

''اچھا لاؤ، ڈائری مجھے دکھاؤ!'' ناہید نے ڈائری لینے کے لیے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔

میں نے اسے ڈائری دے دی۔ وہ بڑے اشتیاق سے ڈائری کا مطالعہ کرنے لگی۔ مجھے اس کے چہرے کا رنگ متغیر نظر آیا تو میں نے وجہ پوچھی۔

''یہ دیکھو شہباز!'' اس نے ڈائری میرے سامنے کر دی۔ ''اس وظیفے کی مدت صرف تین دن ہے اور کوئی خاص خطرہ بھی نہیں۔''

''وظیفہ حصول دولت'' میں نے دھیمی آواز میں صفحے کے اوپر لکھی عبارت پڑھی، پھر اس کی تفصیل پر نظر ڈال کر بولا۔ ''یہ تم نے کیسے کہہ دیا کہ کوئی خطرہ نہیں؟...... اس میں صاف صاف لکھا ہے کہ اگر وظیفے کی شرائط پوری نہ ہوئیں یا مکمل نہ ہو سکا تو بھاری مالی نقصان کا امکان ہے۔''

''اسی صورت میں نقصان ہوگا جب وظیفہ ادھورا رہ گیا۔ یہ پڑھو۔ لکھا ہے اللہ پڑھنے والے کی غیب سے مدد کرے گا پہلے میں یہی وظیفہ کل سے پڑھنا شروع کرتی ہوں تاکہ آئندہ مالی مشکلات کا تو سامنا نہ کرنا پڑے۔'' ناہید کے لہجے سے خوشی چھلک رہی تھی۔

اس وظیفے کو پڑھنے میں زندگی کو کوئی خطرہ نہیں تھا اس لیے میں نے ناہید کی بات مان لی۔ وظیفہ بعد نماز عشاء صرف ایک گھنٹہ روزانہ پڑھا جانا تھا۔

دوسرے دن صبح آٹھ بجے کے قریب ارشد آ گیا۔ میں اس سے پہلے ہی ناہید کی چارپائی اور بستر اس کے کمرے میں ڈال آیا تھا۔ ارشد کے ہاتھ میں ایک مقامی اخبار دیکھ کر میں ٹھٹک گیا اور اس سے دریافت کیا۔ ''کل کے قتل کی خبر کیا اخبار میں چھپ گئی؟''

''ہاں۔'' اس نے بتایا۔ ''پہلے ہی صفحے پر مقتول کی تصویر اور خبر موجود ہے۔'' پھر اس نے اخبار میری طرف بڑھا دیا۔

ارشد سے اخبار لے کر میں نے پہلے صفحے پر نظر ڈالی مطلوبہ خبر تلاش کرنے میں مجھے دشواری نہ ہوئی۔

خبر کے ساتھ چھپی ہوئی تصویر کا میں نے بہ غور جائزہ لیا۔ تصویر میں وہ چاقو بھی صاف دکھائی دے رہا تھا جو دستے تک مقتول کے سینے میں پیوست تھا۔ خبر کی سرخی یہ تھی۔
''چڑیا گھر میں ایک نوجوان کو پُراسرار طور پر قتل کر دیا گیا، قاتل فرار ہونے میں کامیاب'' ذیلی سرخی میں یہ چھپا تھا کہ لاش کے قریب ہی ایک کیمرا پایا گیا ہے جسے پولیس نے اپنے قبضے میں لے لیا ہے۔ خبر کی تفصیل کے مطابق نوجوان کو شناخت کر لیا گیا تھا۔ مقتول کا نام عبدالجبار تھا۔ مرنے والے کے لباس کی جیبوں سے دیگر چیزوں کے علاوہ اس کا شناختی کارڈ بھی ملا تھا۔ پولیس شناختی کارڈ میں درج پتے پر پہنچی تو معلوم ہوا کہ مقتول کل صبح اپنے ایک دوست ندیم کے ساتھ کہیں گیا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ بڑے بالوں والے نوجوان کا نام ندیم ہے۔ مقتول کے ورثاء ندیم کا پتا نہیں بتا سکے تھے۔ پولیس ندیم کی تلاش میں تھی۔ اخبار نے مزید سنسنی خیز انکشافات کی توقع ظاہر کی تھی۔ جو پولیس انسپکٹر اس کیس کی تفتیش کر رہا تھا، اس کا خیال تھا کہ دونوں دوستوں کے درمیان کسی بات پر جھگڑے کی وجہ سے یہ قتل ہوا ہے۔ چڑیا گھر میں واقع میوزیم کے چوکیدار نے بھی یہی بیان دیا تھا کہ اس نے بڑے بالوں والے ایک نوجوان کو ہال سے نکل کر بھاگتے دیکھا تھا۔ مقتول کے گھر والوں نے ندیم کا جو حلیہ بتایا، وہ چوکیدار کے بیان کردہ حلیے سے ملتا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ فرار ہونے والا نوجوان ندیم ہی تھا۔ مقتول عبدالجبار کے دوستوں سے بھی ندیم کے متعلق پولیس پوچھ گچھ کر رہی تھی۔ پوری خبر پڑھ کر میں نے اخبار ایک طرف رکھ دیا تو ناہید اخبار اٹھا کر پڑھنے لگی۔

''ارشد! اس خبر کو پڑھ کر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ پولیس، ندیم ہی کو عبدالجبار کا قاتل سمجھ رہی ہے۔'' میں نے ارشد کو مخاطب کیا۔
''اچھا ہے اگر وہ حرامزادہ اس کیس میں پھنس جائے۔'' ارشد برا سا منہ بنا کر بولا۔
''اس کی حرامزدگی کی وجہ سے تو یہ سب کچھ ہوا ہے۔''
''اور میرا خیال ہے کہ وہ جب تک پولیس کے ہتھے نہ چڑھے اچھا ہے۔''
''تجھے اس کمینے سے کیوں ہمدردی ہو رہی ہے۔''
''غلط نہ سمجھ ارشد!'' میں نے کہا۔ ''مجھے اس سے کیوں ہمدردی ہونے لگی! مجھ کو تو تیرا اور اپنا خیال ہے۔ جب تک وہ پکڑا نہیں جاتا، ہم بھی محفوظ ہیں۔ پولیس نے اسے پکڑ لیا تو وہ تیری نشاندہی کر دے گا اور بتائے گا کہ عبدالجبار کو تیرے ایک دوست نے قتل کیا ہے۔ اب تیری سمجھ میں کچھ آیا!''

''ہاں وہ قتل کے الزام سے بچنے کی خاطر ایسا کر سکتا ہے۔'' ارشد نے میری بات سے اتفاق کیا۔ ''مگر اس کیمرے سے کھینچی جانے والی تصویر ہمارے لیے مشکل ضرور پیدا کر سکتی ہے۔ خیر دیکھا جائے گا۔'' پھر ارشد اس طرح چونکا جیسے اسے کوئی بات یاد آ گئی ہو۔ اسی کے ساتھ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔
''کیوں، کیا ہوا؟ کیا چل دیا؟'' میں نے اس سے پوچھا۔
''تجھے اخبار دکھانے کی جلدی میں یہ تو میں بھول ہی گیا کہ امی نے مجھ سے ناشتہ لے جانے کے لیے کہا تھا۔ میں ابھی آیا۔'' ارشد نے بتایا۔
میرے روکنے کے باوجود وہ نہیں رکا۔ اس عرصے میں ناہید بھی خبر پڑھ چکی تھی میں نے اس کی رائے معلوم کی۔ ''تمہارا کیا خیال، پولیس ندیم کو ڈھونڈ لے گی؟''
''مقتول کے دوسرے دوستوں سے پوچھ گچھ کرنے پر پولیس کو ندیم کے گھر کا پتہ چل سکتا ہے، ہاں یہ ضرور ممکن ہے کہ وہ فوری طور پر نہ پکڑا جائے تمہارے بیان کے مطابق وہ اس شہر سے فرار ہو چکا ہے۔ ممکن ہے ندیم نے اپنے گھر والوں کو بھی پیش آنے والے واقعے سے آگاہ نہ کیا ہو۔'' ناہید نے خیال آرائی کی۔
''ممکن تو یہ بھی ہے کہ ندیم یہاں سے فرار ہو کر جہاں گیا ہے، اس کے متعلق بھی گھر والوں کو سچ نہ بتایا ہو۔''
''اگر اس نے واقعی ایسا کیا ہے تو یہ ہمارے حق میں اور بھی بہتر ہے۔ اس طرح پولیس اسے تلاش نہیں کر سکے گی۔''
ارشد کی واپسی تک ہم اس موضوع پر گفتگو کرتے رہے۔
''میں نے ابھی ناشتہ نہیں کیا تھا اس لیے تم لوگوں کے ساتھ ہی ناشتہ کروں گا۔ اپنے لیے بھی میں ناشتا لے کر آیا ہوں۔'' ارشد بھی یہ کہتے ہوئے ہمارے ساتھ ناشتہ کرنے لگا۔ وہ جلدی جلدی ہاتھ چلانے لگا تو میں سمجھا کہ اسے شاید کالج پہنچنا ہے۔ میں نے اس سے اپنے خیال کی تصدیق چاہی تو وہ بتانے لگا۔ ''نو بجے بینک کھلتے ہی مجھے دس دس ہزار روپے کے دو پرائز بانڈ خریدنے ہیں۔ ابا جی نے آج خاص طور پر تاکید کی ہے کیونکہ کل میں تم لوگوں کو چڑیا گھر لے جانے کی وجہ سے بانڈ خریدنا بھول گیا تھا۔ آج تک کسی بانڈ پر انعام نہیں نکلا، مگر ابا جی پابندی کے ساتھ ہر مہینے بانڈ خریدتے ہیں۔ تین دن کے بعد دس ہزار والے پرائز بانڈ کی قرعہ اندازی ہونے والی ہے۔ اگر آج پرائز بانڈ نہ خریدے تو کل ملنا بہت مشکل ہیں۔ لوگ عام طور پر اسی وقت بانڈ خریدتے ہیں جب قرعہ اندازی میں چار چھ

دن باقی رہ جاتے ہیں۔"

"تین دن" میں بڑبڑایا مجھے یاد آیا کہ ناہید حصول دولت کے لیے جو وظیفہ آج رات سے شروع کرنے والی ہے، اس کی مدت بھی تین ہی دن ہے۔ میں نے دس ہزار کے بانڈ پر ارشد سے پہلے انعام کے بارے میں دریافت کیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ میں نے پہلے کبھی کوئی پرائز بانڈ نہیں خریدا تھا۔ مجھے اس کے بارے میں کچھ خبر نہیں تھی، لیکن ارشد یقیناً تفصیلات سے واقف تھا۔

"کیوں، کیا تجھے بھی پرائز بانڈ خریدنے کی بیماری ہے؟" ارشد ہنس کر کہنے لگا۔

"مجھے تو کم از کم شیخ چلی بننے کا کوئی شوق نہیں۔"

"تو کیا تیرے خیال میں چچا امجد خدانخواستہ......"

"ابے نہیں! مطلب نہیں تھا میری بات کا!" ارشد نے میری بات کاٹ دی۔ "میں تو تجھے شیخ چلی کہہ رہا تھا۔"

"اچھا بکواس نہ کر اور میں نے جو پوچھا ہے اس کا جواب دے!" میں نے زور دے کر کہا۔

"تو اگر بے ہوش نہ ہو تو بتادوں کہ دس ہزار کے پرائز بانڈ پر پہلا انعام ایک کروڑ پچیس لاکھ روپے ہے۔" ارشد نے بتایا۔

"سوا کروڑ روپے!" میں ناقابل یقین انداز میں بولا۔ "کہیں تو بے پر کی تو نہیں اڑا رہا!"

"نہیں پیارے، یہ بے پر کی نہیں پردار ہے میں آج ہی تجھے کارڈ لاکر دکھادوں گا جس پر ہر رقم کے بانڈ کی انعامی رقوم چھپی ہوتی ہیں۔"

"اچھا تو پھر ایک منٹ ٹھہر!" میں یہ کہہ کر تیزی سے اپنے سوٹ کیس کی طرف بڑھا۔ میرے اندازے کے مطابق اس میں اتنی رقم ہونی چاہیے تھی میں نے جلدی سے سوٹ کیس کھولا اور اس میں سے رقم نکال کر گننے لگا۔ ان میں سے دس ہزار روپے الگ کرنے کے باوجود دو ہزار تین سو کچھ روپے بچ گئے۔ میں نے سوچا، وظیفہ مجھے نہیں بلکہ ناہید کو پڑھنا ہے اس لئے یہ رقم اس کے ہاتھ میں دے دی۔

"میں کیا کروں ان روپوں کا؟" ناہید نے حیران ہو کر پوچھا۔

"یوں سمجھ لیں ناہید بی بی کہ میں یہ رقم آپ کو قرض حسنہ کے طور پر دے رہا ہوں۔ تین دن کے بعد آپ ہی رقم مجھے واپس کردیجئے گا۔ آپ اس رقم سے دس ہزار روپے کا ایک

پرائز بانڈ ارشد سے منگوالیجئے۔ اگر خدانخواستہ انعام نہ بھی نکلا تو کسی بھی وقت پرائز بانڈ کیش کرایا جاسکتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"تیرا یہ ٹوٹکا میری سمجھ میں تو نہیں آیا کہ ناہید بی بی کو یہ رقم ادھار دے کر کیوں پرائز بانڈ خریدوانا چاہتا ہے۔ تو خود بھی......"

"بس کر!" میں بول اٹھا۔ "یہ باتیں تیرے سمجھنے کی نہیں ہیں۔"

ناہید غالباً اس کی وجہ سمجھ گئی کہ میں نے اسی کو رقم کیوں قرض دی ہے! میں نے اسے معنی خیز انداز میں سر ہلاتے دیکھا تھا۔ اس نے وہ رقم ارشد کو پرائز بانڈ خریدنے کے لیے دے دی۔ نو بجنے میں تقریباً بارہ تیرہ منٹ رہ گئے تھے ارشد اسی لیے چلا گیا۔

ارشد کے جاتے ہی میں نے وضاحت کردی۔ "حصول دولت کے لیے وظیفہ کیوں کہ تم پڑھ رہی ہو اس لیے میرے خیال سے رقم تمہاری ہونی چاہیے تھی۔ اللہ تعالیٰ غیب سے مدد کرنے کے لیے کوئی ذریعہ تو بناتا ہی ہے ورنہ یہ بات سامنے نہ آتی۔"

"جب تم نے مجھے پرائز بانڈ منگوانے کے لیے کہا تھا تو میں اس وقت تمہاری بات کا مطلب سمجھ گئی تھی۔" ناہید نے بتایا۔

ارشد دس ہزار روپے والا پرائز بانڈ لاکر دے گیا تو میرے کہنے پر اسے ناہید نے اپنے سوٹ کیس میں رکھ لیا۔ پھر اسی رات سے ناہید نے وظیفہ پڑھنا شروع کردیا۔ اسی کے ساتھ وظیفے کی ایک شرط کے مطابق وہ پابندی سے پانچوں وقت کی نماز بھی پڑھنے لگی تھی۔ تیسرے دن وظیفہ مکمل ہوگیا۔

مجھے معلوم نہیں تھا کہ ارشد نے خریدے جانے والے تینوں پرائز بانڈ کے نمبر اپنے پاس نوٹ کر لئے تھے۔ ان میں سے دو پرائز بانڈ چچا امجد کے تھے چوتھے روز دس ہزار روپے والے پرائز بانڈ کی قرعہ اندازی کا نتیجہ نکل آیا۔ جب ارشد چھپا ہوا ایک پرچہ ہاتھ میں لئے گھر کے اندر داخل ہوا تو اس کے چہرے کی رنگت بدلی ہوئی تھی کچھ دیر تو وہ بول ہی نہ سکا۔ میں نے یہ دیکھ کر اسے جھنجھوڑا۔ "کچھ پھوٹ تو سہی منہ سے آخر کیا ہوا؟"

"وہ......وہ ناہید بی بی......سوا کروڑ روپے......نمبر......پرائز......پہلا انعام...... میں نے نمبر اپنے پاس لکھ لئے تھے۔"

بظاہر ارشد کی باتوں میں کوئی ربط نہیں تھا، مگر میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے!

"ناہید بی بی! آپ اپنے سوٹ کیس سے پرائز بانڈ نکال کر لے آئیں۔" میں نے ناہید کو مخاطب کیا۔ "شاید آپ کا پہلا انعام نکل آیا ہے۔" تبھی مجھے ارشد کے حواس گم نظر

آ رہے ہیں اس سے بات ہی نہیں کی جا رہی۔"

ناہید اپنے کمرے میں جا کر سوٹ کیس سے پرائز بانڈ نکال لائی۔ میں نے ارشد کے ہاتھ سے چھپا ہوا پرچہ لے لیا جس بانڈ پر سوا کروڑ روپے کا پہلا انعام ملا تھا اس کے اور میرے ہاتھ میں موجود پرائز بانڈ کے نمبر ایک ہی تھے یہ دیکھتے ہی میرے دل کی دھڑکنوں میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔

"یہ...... یہ دیکھیں نمبر...... ایک ہیں...... بالکل ایک!" میں نے ناہید کی طرف دیکھ کر بہ مشکل کہا۔ "ہم دولت...... دولت مند ہو گئے۔"

ناہید نے میرے ہاتھ سے پرائز بانڈ لے لیا اور خود بھی نمبر ملا کر دیکھے۔ اسے غالباً وظیفے کی کامیابی پر یقین تھا۔ وہ اسی لیے ارشد اور میری طرح بے قابو نہیں ہوئی۔ اس نے پرائز بانڈ مجھے تھمایا اور بولی۔ "پہلے میں دو نفل شکرانے کے پڑھ لوں۔"

ارشد بھی اب خاصی حد تک خود پر قابو پا چکا تھا۔ ذرا ہی دیر بعد وہ مجھ سے کہنے لگا۔ "یار شہباز، یہ تو واقعی کمال ہو گیا!"

"جب اللہ تعالیٰ کسی کی مدد کرتا ہے تو اسی طرح غیب سے نوازتا ہے۔" میں بولا۔

"میں ابھی امی اور نزہت کو یہ خوشخبری جا کر سناتا ہوں۔" ارشد کھڑا ہو گیا۔

"ٹھہرو!" میں نے اسے اپنی جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر دیا۔ "گھر میں خالی ہاتھ نہیں، مٹھائی لے کر داخل ہونا!"

میرے اصرار پر اس نے نوٹ لے لیا اور چلا گیا۔

☆======☆======☆

اب تک مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں دولت مند بن چکا ہوں۔ حصول دولت کا وظیفہ کامیاب رہا تھا میرے ذہن میں دور دور تک یہ خیال نہیں تھا اتنی بڑی خوشخبری کے بعد اسی روز مجھے ایک ایسی خبر بھی ملے گی کہ میرے ہوش اڑ جائیں گے۔ یہ خبر لانے والا بھی ارشد ہی تھا۔ اس کے ہاتھ میں اسی روز شائع ہونے والا ایک اخبار تھا۔ پہلے ہی صفحے پر شائع ہونے والی جس خبر کی نشاندہی ارشد نے کی، اسے پڑھ کر میں خالی خالی سی نظروں سے کبھی ارشد اور کبھی ناہید کو دیکھنے لگا۔ خبر کی تفصیل کے ساتھ ہی ایک تصویر اور پولیس کی طرف سے ایک اعلان بھی چھپا تھا۔

آخر کار وہی ہوا جس کا مجھے خطرہ تھا اخبار میں چھپنے والی خبر کے مطابق مقتول نوجوان عبدالجبار کی لاش کے قریب جو کیمرہ پولیس کو ملا تھا اس سے صرف ایک ہی تصویر کھینچی گئی تھی

جہاں عبدالجبار کا قتل ہوا تھا۔ چہروں کے علاوہ تصویر میں اردگرد کا ماحول بھی نظر آ رہا تھا اصل تشویش کا سبب پولیس کا یہ اعلان تھا کہ تصویر میں جو افراد موجود ہیں، انہیں کوئی جانتا ہو یا کسی کو وہ کہیں نظر آئیں تو فوراً پولیس کو مطلع کیا جائے اگر وہ افراد خود تصویر دیکھیں تو بلا تاخیر پولیس سے رابطہ کریں اگر ان افراد نے ایسا نہ کیا تو انہیں عبدالجبار کے قتل میں ملوث تصور کیا جائے گا۔ خبر پڑھ کر یہ بھی معلوم ہوا کہ مقتول کے دوست ندیم کے گھر کا پتہ بھی چل گیا ہے۔ ندیم کے گھر والوں نے پولیس کو بتایا تھا کہ وہ لاہور گھومنے گیا ہوا ہے۔ لاہور میں ندیم کہاں ٹھہرا ہوگا، پولیس کو وہ اس سے آگاہ نہیں کر سکے۔ مقامی پولیس اس سلسلے میں لاہور کی پولیس سے رابطہ قائم کرنے والی تھی۔ تصویر کی اشاعت کے بعد اب ندیم کے زیر حراست آنے یا نہ آنے سے ہمارے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اب تو اس معاملے نے ایک اور ہی نوعیت اختیار کر لی تھی۔

کچھ دیر خاموش رہ کر ارشد نے مجھے مخاطب کیا۔ "تم دونوں کو تو خیر اس شہر میں کوئی نہیں پہچانتا لیکن مجھے لوگ جانتے ہیں، انہی جاننے والوں میں سے کوئی نہ کوئی پولیس کو میرے بارے میں مطلع کر سکتا ہے میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا شہباز کہ اب کیا کیا جائے!"

"اعلان کے مطابق اگر تُو نے خود پولیس سے رابطہ قائم نہ کیا تو پولیس تجھ پر قتل کا شبہ کر سکتی ہے۔ ان حالات میں بہتر یہی ہے میرے دوست کہ تُو خود ہی نزہت کے ساتھ پولیس کے سامنے پیش ہو جا۔" میں نے ارشد کو مشورہ دیا۔ "تُو اگر خود پیش نہ ہوا تو بھی کسی نہ کسی ذریعے سے پولیس کو تیرا سراغ مل جائے گا۔"

ارشد کچھ زیادہ ہی گھبرایا ہوا تھا اس کی گھبراہٹ فطری تھی کیونکہ یہ ایک قتل کا معاملہ تھا وہ مجھ سے پوچھنے لگا۔ "لیکن پولیس کو میں کیا بیان دوں گا؟"

"وہی جو میں تجھے پہلے بتا چکا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "صرف میرا اور ناہید بی بی کا نام صحیح نہیں بتانا ہے باقی تمام واقعہ جس طرح پیش آیا ہے۔ بیان کر دینا ہے۔"

"تمہارے کیا فرضی نام سوچے تھے مجھے تو اب وہ بھی یاد نہیں رہے یہی نام نزہت امی اور ابا جی کو بھی بتانے ہیں۔" ارشد بولا۔

"سعید اور نبیلہ" میں نے اسے یاد دلایا۔ "اور سن، احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ تُو اپنے چھوٹے بھائی سہیل کو بھی یہ نام بتا دے۔ پولیس والے اس سے بھی ہم دونوں کے متعلق پوچھ گچھ کر سکتے ہیں ہمیں کسی بھی امکان کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔"

"ایک مسئلہ اور بھی ہے شہباز!" ارشد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "امی کسی صورت

نزہت کو میرے ساتھ پولیس اسٹیشن بھیجنے پر آمادہ نہیں ہوں گی۔"

"اس کا بس ایک حل ہے کہ پولیس خود گھر آ کر نزہت کا بیان لینے پر راضی ہو جائے۔ میرا خیال ہے کہ پولیس کو اس پر اعتراض نہیں ہوگا۔ تجھے بہرحال تھانے جانا پڑے گا۔" میں نے اپنی رائے ظاہر کی، پھر دریافت کیا۔"پولیس کے محکمے میں کوئی جان پہچان والا نہیں؟"

"ممکن ہے ابا جی کا کوئی جاننے پہچاننے والا نکل آئے۔ میں معلوم کرتا ہوں ابا جی سے۔" ارشد یہ کہتے ہوئے اٹھا۔

"ہاں مناسب بھی یہی ہے کہ تُو تھانے جانے سے پہلے چچا امجد کو ساری بات سے آگاہ کر دے۔"

ارشد نے اقرار میں سر ہلایا اور اخبار لے کر چلا گیا اس کے جاتے ہی ناہید مجھ سے بولی۔"شہباز! ان حالات میں اب تمہارا گھر سے نکلنا خطرے سے خالی نہیں رہا۔"

"مگر روزانہ کا سودا وغیرہ لانے کے لیے تو جانا ہی پڑے گا۔" میں نے مجبوری بیان کی۔

"اس کا یہ بندوبست بھی تو ہو سکتا ہے کہ ارشد یا اس کا چھوٹا بھائی سہیل سودا لا دیا کرے۔"

"ہاں یہ ممکن تو ہے۔" میں نے ناہید کی تجویز سے اتفاق کیا۔ پھر اچانک مجھے یہ خیال آیا کہ اخبارات میں اس تصویر کی اشاعت ناہید اور میرے لیے کتنا بڑا خطرہ بن سکتی ہے! میرے چہرے سے پریشانی کے اظہار پر ناہید نے اس کی وجہ پوچھی تو میں طویل سانس لے کر بولا۔"بات ہی پریشانی کی ہے اب تک اس طرف میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا یہ تصویر تمہارے والد چوہدری صاحب کی نظر سے بھی گزر سکتی ہے۔ اس طرح انہیں معلوم ہو جائے گا کہ ہم دونوں یہاں بہاولپور میں ہیں پھر تم خود ہی سوچ سکتی ہو کہ وہ کیا کر سکتے ہیں!"

میری بات سن کر ناہید کا چہرہ بھی دھواں دھواں ہو گیا وہ بہ مشکل اتنا ہی کہہ سکی۔"یہ...... یہ تو بہت برا ہوا شہباز! اگر...... اگر ہم پولیس سے بھی بچ گئے تو...... تو سردارے اور کالیے جیسے خطرناک کارندوں سے کس طرح اپنی جان بچائیں گے؟"

"پھر...... پھر تو ناہید، ہمارا اس شہر میں مزید ایک دن بھی رہنا انتہائی خطرناک ہے۔ ہمیں جلد از جلد یہاں سے فرار ہو جانا چاہئے کیا خبر اب تک چوہدری صاحب نے اپنے زرخرید سفاک قاتلوں کو بہاولپور روانہ کر دیا ہو!" میں نے پیش آنے والے خطرے کی سنگینی

سے ناہید کو آگاہ کیا۔

"مگر...... مگر شہباز، ہم یہاں سے جائیں گے کہاں؟" ناہید فکرمند سی ہو کر پوچھنے لگی۔

"کہیں بھی کسی نئے اور اجنبی شہر میں۔" میں نے جواب دیا۔"جہاں کوئی ہمارا جاننے پہچاننے والا نہ ہو۔"

کچھ دیر ناہید خاموش رہی، پھر بولی۔"تم ٹھیک کہتے ہو شہباز! جتنی جلد ممکن ہو ہمیں اس شہر سے نکل جانا چاہئے۔ ہم نے جتنی دیر بھی کی ہمارے لیے خطرہ بڑھتا جائے گا۔ میں تو کہتی ہوں ہمیں زیادہ سامان بھی اپنے ساتھ لے جانے کی ضرورت نہیں۔ دونوں سوٹ کیسوں میں جتنا ضروری سامان آ سکے، کافی ہے۔ رہا روپوں کا مسئلہ تو بانڈ کی انعام رقم ہم کسی بھی شہر میں جا کے حاصل کر سکتے ہیں۔"

مزید گفتگو کر کے ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ بہاولپور میں اب ہمارا قیام خطرے سے خالی نہیں۔ میرا دوست ارشد خود پولیس کے چکر میں پھنس گیا تھا۔ مجھے یہ اندیشہ بھی تھا کہ کہیں پولیس اسے عبدالجبار کو قتل کرنے کے شبہے میں پکڑ نہ لے۔ ضروری نہیں تھا کہ پولیس اس کے بیان پر یقین ہی کر لیتی۔

ناہید سے جب میں نے ان باتوں کا اظہار کیا تو وہ اور بھی فکرمند ہو گئی اس نے مجھے مشورہ دیا ان حالات میں تو ارشد کے گھر والوں سے ملنے کی بھی ضرورت نہیں ورنہ وہ یہ پوچھیں گے کہ ہم کہاں جا رہے ہیں! خاموشی کے ساتھ ہم یہاں سے چلتے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ جلدی جلدی ضروری سامان سمیٹنے لگی۔

ہم گھر سے نکلنے کے لیے پوری تیاری کر چکے تھے کہ معاً دروازے پر دستک ہوئی۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا کہ آنے والا کون ہو سکتا ہے! اس کی وجہ یہ تھی کہ ارشد تو تھانے گیا تھا ہمت کر کے میں دروازے تک پہنچا اور ایک جھری سے باہر جھانک کر دیکھا پھر میں نے دروازہ کھولنے میں دیر نہیں کی۔ آنے والے ارشد کے والد چچا امجد تھے ان کے چہرے پر مجھے ہوائیاں اڑتی نظر آئیں۔ انہیں گھر تک پہنچانے کے لیے ارشد کا چھوٹا بھائی سہیل بھی ساتھ آیا تھا چچا امجد نے اسے واپس بھیج دیا۔

سہیل واپسی کے لیے مڑ گیا تو چچا امجد نے اندر قدم رکھتے ہی مجھ سے گھر کا دروازہ بند کر لینے کو کہا۔

چچا امجد کو ساتھ لے کر میں نشست گاہ میں آ گیا اور ان سے دریافت کیا۔"چچا! کیا

بات ہے آپ کچھ گھبرائے ہوئے لگ رہے ہیں؟''

''ارشد کو پولیس نے پوچھ گچھ کے لیے تھانے میں روک لیا ہے۔'' چچا امجد نے بتایا۔

''لیڈی پولیس بھیج کر انہوں نے نزہت کو بھی تھانے بلوا لیا ہے اور اس کا بیان لے رہے ہیں۔ مجھے فوراً تھانے واپس جانا ہے۔ میں تمہیں صرف اتنا بتانے آیا ہوں شہباز بیٹے کہ تم اب اس گھر سے باہر نہ نکلنا۔''

''چچا! موجودہ حالات میں ہمارا یہاں رکنا خطرناک ہے۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ..... فی الحال لاہور چلے جائیں۔'' میں نے مصلحتاً جھوٹ بول دیا۔ ''گھر کو تالا لگا کر ہم چابی چچی کو دے جائیں گے تاکہ یہاں جو سامان ہے، اسے وہ قبضے میں لے سکیں۔ آپ اگر کچھ دیر نہ آتے تو ہم جا چکے ہوتے۔ ہم بس نکلنے ہی والے تھے۔''

''اس وقت تمہارا کوچہ گل حسن جانا بھی ٹھیک نہیں۔ اگر تم نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو تالا چابی مجھے دے دو!'' چچا امجد جلدی سے بولے۔

میں نے فوراً ان کے کہنے پر عمل کیا، پھر دونوں سوٹ کیس اٹھائے اور ناہید کو ساتھ لیے گھر سے نکل آیا۔ ہم نے اس طرح چادریں اوڑھ رکھی تھیں کہ چہرے نظر نہ آئیں۔ اس گلی سے باہر آتے ہی مجھے ایک خالی رکشا نظر آیا۔ میں نے اسے روک لیا۔ رکشے میں سوٹ کیس رکھ کر میں اور ناہید بھی بیٹھ گئے۔ پھر ہم ریلوے اسٹیشن روانہ ہو گئے۔ مجھے یقین تھا کہ چوہدری اسلم کے کارندے بہاولپور آ کر پہلے چچا امجد ہی سے ملتے۔ اول تو یہ بھی مشکل تھا کہ چچا امجد انہیں بتا دیتے کہ ہم لاہور گئے ہیں، پھر بھی دھونس دھمکی دینے پر مجبوراً انہیں زبان کھولنی ہی پڑتی تو ان کارندوں کو صحیح جواب نہ ملتا۔ میں اسی لیے مطمئن تھا۔

اب تک میں کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ مجھے کہاں جانا چاہیے! ناہید کو بھی اسی سبب کچھ خبر نہیں تھی، لیکن اسے جاننے کا تجسس ضرور تھا۔ راستے میں مجھ سے اس نے دریافت کیا۔ ''شہباز! ہمیں جانا کہاں ہے، تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا!''

ناہید کی آواز دھیمی سی تھی، پھر بھی اسے میں نے خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا۔ احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ راستے میں یہ گفتگو نہ ہو۔ ناہید اسی لیے ریلوے اسٹیشن تک پہنچنے سے پہلے چپ رہی۔ کسی سے میں نے سنا تھا کہ کراچی شہر انسانوں کا جنگل ہے۔ وہاں کسی کو تلاش کرنا آسان نہیں ہوتا۔

مجھے پہلا خیال کراچی ہی کا آیا۔ اپنے خیال کا اظہار میں نے ناہید سے کیا تو وہ بولی۔ ''مگر ہم وہاں پہنچ کر رہیں گے کہاں؟ وہاں تو شاید تمہارا کوئی جاننے والا بھی نہیں ہوگا۔''

''نہ سہی کوئی جاننے والا، اس سے کیا فرق پڑتا ہے!'' میں نے کہا۔ ''میرے خیال میں تو یہ اچھا ہی ہے۔ عارضی طور پر ہم کسی ہوٹل میں رہ سکتے ہیں۔''

میں نے پلیٹ فارم پر ایک خالی بینچ دیکھ کر دونوں سوٹ کیس رکھ دیے اور ناہید کو وہاں بٹھا دیا۔

''ٹرین کے بارے میں معلوم کر کے میں ابھی آتا ہوں۔'' میں ناہید سے مخاطب ہوا اور تیز قدمی سے ایک طرف بڑھ گیا۔

انکوائری پر پوچھنے سے پتا چلا کہ گھنٹے بھر بعد کراچی کے لیے ایک ٹرین مل سکتی ہے۔ میں نے اسی ٹرین کے دو ٹکٹ لے لیے۔ دانستہ میں نے فرسٹ کلاس کے ٹکٹ خریدے تھے تاکہ بھیڑ بھاڑ سے بچا جا سکے۔ اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ اسی روز اخبارات میں ہماری تصویر چھپی تھی۔ کوئی ہمیں پہچان بھی سکتا تھا۔ مجھے اس پر قدرے اطمینان ہوا کہ ٹرین کے انتظار میں ہمیں وہاں زیادہ دیر نہیں رکنا تھا۔ اس وقت ساڑھے گیارہ بج رہے تھے اور ٹرین کو ساڑھے بارہ بجے آنا تھا۔ میں نے یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ ٹرین کراچی کب پہنچے گی! اس ٹرین کو رات ایک بجے کراچی پہنچنا تھا۔ کراچی شہر میرے لیے قطعی اجنبی تھا۔ کسی اجنبی شہر میں رات کے وقت پہنچنا مناسب نہیں تھا۔ بہاولپور سے اگر فوری طور پر ہمارا فرار ضروری نہ ہوتا تو میں ہرگز اس ٹرین میں سفر نہ کرتا۔

ٹرین کی آمد تک ہم بہت محتاط اور چوکنا رہے۔ وہ ایک گھنٹا گزارنا بہرحال ہمارے لیے کسی امتحان سے کم نہیں تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا رہا جیسے میں سولی پر لٹکا ہوں۔ غالباً ایسی ہی کیفیت ناہید کی تھی۔

ٹرین کے رکتے ہی ہم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ناہید نے اصرار کر کے اپنا سوٹ کیس خود اٹھا لیا تھا کیوں کہ وہ زیادہ وزنی نہیں تھا۔ ہم ٹرین کے جس ڈبے میں سوار ہوئے وہ تقریباً خالی ہی تھا۔ میرا یہ اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا کہ فرسٹ کلاس میں بھیڑ نہیں ہوگی۔ ہم اطمینان سے ڈبے کے ایک ایسے حصے میں بیٹھ گئے جہاں آس پاس ہمارے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ ٹرین جب تھوڑی دیر تک رک کر وہاں سے روانہ ہوئی تو میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ میں اور ناہید خطرے کی حدود سے ایک مرتبہ پھر نکل آئے تھے۔ ٹرین کو وہاں سے چلے چند ہی منٹ ہوئے تھے کہ ڈائننگ کار کا ایک ویٹر کھانے کے لیے پوچھنے آ گیا۔ میں نے اس سے کھانا لانے کے لیے کہہ دیا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر ہم آرام دہ نشستوں پر لیٹ گئے۔ ہم نے آمنے سامنے والی سیٹوں پر چادریں بچھالی تھیں اور سوٹ

کیسوں کو تکیوں کی جگہ سر کے نیچے رکھ لیا تھا۔

ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف کروٹ لیے ہوئے تھے کہ ناہید نے دھیمی آواز میں پوچھا۔ ''شہباز! کیا وہاں ہوٹل میں بھی فرضی نام ہی بتاؤ گے؟''

''میرے خیال میں اس کی ضرورت نہیں۔ وہ کوئی گاؤں تو ہے نہیں، پاکستان کا سے بڑا شہر ہے۔ میرے اور تمہارے ناموں کے وہاں نہ جانے کتنے لوگ ہوں پھر ہمارے سوا کسی کو یہ معلوم نہیں کہ ہم کہاں گئے ہیں! ہاں ایک بات البتہ ضروری۔

جو بات میرے ذہن میں آئی، اسے کہتے ہوئے میں ذرا سا جھجکا۔

''کہو نا، کیا ضروری بات ہے؟'' مجھے چپ دیکھ کر ناہید بول اٹھی۔

''ہمیں وہاں بہاولپور ہی کی طرح خود کو شادی شدہ ظاہر کرنا پڑے گا۔'' میں نے ہی دیا۔

''تو کیا ہوا، تم یہ بات کہتے ہوئے رک کیوں گئے تھے؟''

''اس لیے کہ...... کہ ابھی ہم...... ہمارے درمیان یہ مقدس رشتہ قائم نہیں ہوا نا!''

''وہ...... وہ دن بھی انشاء اللہ جلد ہی آ جائے گا شہباز کہ...... کہ جب ہم ہمیشہ لیے ایک ہو جائیں گے۔'' ناہید جذباتی نظر آنے لگی۔

''ناہید! ہم ایک تو اب بھی ہیں، ہاں دنیا کی نظر میں نہیں۔''

ایسی ہی خوشگوار باتیں کرتے اور مستقبل کے حسین خواب دیکھتے ہوئے وہ سفر بڑ آرام سے کٹ گیا۔ رات کا کھانا بھی ہم نے اسی دوران میں کھا لیا تھا۔ وہ ٹرین کرا کینٹ ریلوے اسٹیشن تک ہی جاتی تھی۔ ہمیں اس لیے وہیں اترنا پڑا۔ وہاں مجھے رات وقت بھی بڑی رونق نظر آئی۔

میں نے ایک قلی سے کسی اچھے ہوٹل کے بارے میں معلوم کیا۔

''گل ای کوئی نئیں بادشاہو!...... لاؤ یہ سوٹ کیس مجھے دو، میں تمہیں ہوٹل تک دیتا ہوں۔'' قلی نے سوٹ کیس لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ مسئلہ اتنی آسانی سے حل ہو جائے گا۔ پھر بھی میں نے قلی سے پوچھ ہی لیا۔

''کتنی دور جانا پڑے گا؟''

''او جی بس نال ای جانا ہے، سٹیشن سے زیادہ دور نہیں۔'' قلی نے جواب دیا۔

میں مطمئن ہو گیا قلی کو دونوں سوٹ کیس دے دیے۔ وہ چلا تو ہم دونوں اس پیچھے پیچھے ہو لیے۔ اسٹیشن کی عمارت سے نکل کر وہ بائیں جانب مڑ گیا۔ وہاں بھی مجھے و

محسوس نہیں ہوئی حالانکہ رات کا ڈیڑھ بجنے والا تھا۔ پیدل ہی قلی ایک طرف بڑھتا رہا۔ ذرا ہی دور چل کر مجھے کئی ہوٹلوں کے بورڈ نظر آئے۔ قلی کے ساتھ ہی ایک ہوٹل میں داخل ہو گئے۔ وہاں تک سوٹ کیس لانے کے قلی نے پچاس روپے مانگے تو میں حیران رہ گیا۔

''پچاس روپے؟...... اتنے سے فاصلے کے!'' میں قلی سے مخاطب ہوا۔

''اور کیا جی! یہ کراچی ہے، کوئی چھوٹا موٹا شہر نئیں! گل آئی سمجھ!'' قلی منہ بنا کر بولا۔

پچاس روپے سے وہ ایک پیسا کم لینے پر آمادہ نہ ہوا۔ بہر حال میں نے اسے پچاس روپے دے کر جان چھڑائی۔

قلی چلا گیا تو میں کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھے ہوئے اُدھیڑ عمر شخص کی طرف متوجہ ہوا۔

''ہمیں ایک کمرا چاہیے جناب!''

''مل جائے گا۔'' وہ شخص بولا۔ ''ڈبل روم نا؟''

''جی...... جی ہاں۔''

''ایک سو ستر روپے روز کرایہ ہے ڈبل روم کا۔ کتنے دن رہنا ہے آپ کو؟'' اس نے کرایہ بتا کر پوچھا۔

''کم سے کم بھی ہفتہ بھر تو لگ ہی جائے گا۔'' میں نے بتایا۔ ایک دن کا کرایہ سن کر میرے ہوش اڑ گئے تھے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ کرایہ اتنا زیادہ ہوگا۔

میں نے سوٹ کیس سے تمام رقم نکال کر اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لی تھی جو اب دو ہزار روپے سے کچھ کم ہی رہ گئی تھی۔

اس شخص نے موٹا سا ایک رجسٹر کھول لیا اور مجھ سے بولا۔ ''اپنا شناختی کارڈ دیجیے۔''

''شناختی کارڈ!'' میں نے اظہارِ حیرت کیا۔ ''اس کی کیا ضرورت ہے جناب؟''

''ضرورت ہے جبھی تو مانگ رہا ہوں۔ شناختی کارڈ دکھائے بغیر ہم کسی کو اپنے ہوٹل میں نہیں ٹھہراتے۔'' اس شخص نے جواب دیا۔

سوٹ کیس میں میرا شناختی کارڈ موجود تھا۔ میں نے اس میں سے شناختی کارڈ نکال کر اس شخص کو دیتے ہوئے سوچا، غلط نام پتا لکھوانا ممکن ہی نہیں تھا۔ ایک ہزار روپے بھی میں نے دے دیے۔

اس شخص نے مجھ سے مزید کوئی سوال کیے بغیر رجسٹر میں نام پتا لکھنا شروع کر دیا۔

''ان کا نام اور آپ کے ساتھ رشتہ؟'' اس نے لکھتے لکھتے سر اٹھا کر مجھ سے معلوم کیا۔

''ناہید ہے ان کا نام اور یہ میری بیوی ہیں۔'' میں نے بلا جھجک بتا دیا۔

"ظاہر ہے کہ آپ اپنے گاؤں سے گھومنے پھرنے کے لیے کراچی آئے ہوں گے یا کسی کام دھندے کی تلاش میں آتے ہیں؟"

"کیا یہ بھی رجسٹر میں لکھنا ہے؟" میں حیرت سے بولا۔

"جی ہاں، ہمیں یہ بھی لکھنا پڑتا ہے۔"

"فی الحال تو گھومنے پھرنے ہی کا ارادہ ہے، کوئی کام دھندا مل گیا تو الگ بات ہے۔"

"تو پھر میں سیر و تفریح ہی لکھ دیتا ہوں۔" اس نے کہا۔

میرے لیے کسی ہوٹل میں قیام کا یہ پہلا موقع تھا اس لیے میں ان باتوں سے واقف نہیں تھا۔ ضروری اندراجات کے بعد اس نے میرا شناختی کارڈ واپس کر دیا۔ خیریت یہ ہوئی کہ اس نے ناہید کا شناختی کارڈ نہیں مانگا ورنہ میرے لیے مسئلہ ہو جاتا۔ ناہید کے پاس اس شناختی کارڈ نہیں تھا۔ اس شخص نے گھنٹی بجا کر ایک ویٹر کو بلایا اور میری طرف ایک چابی بڑھا دی۔ کی رنگ میں پلاسٹک کے ایک گول ٹکڑے پر کمرے کا نمبر بارہ لکھا ہوا تھا۔

"انہیں بارہ نمبر کمرے میں پہنچا دو۔" اس شخص نے ویٹر کو مخاطب کیا۔ "لائٹیں وغیرہ اور باتھ روم چیک کر لینا!"

"اچھا جی!" ویٹر نے یہ کہہ کر دونوں سوٹ کیس اٹھا لیے۔

میں اور ناہید اس ویٹر کے پیچھے چل دیے۔ بارہ نمبر کمرا گراؤنڈ فلور ہی پر تھا۔ ویٹر ہمیں اس کمرے تک لے آیا اور مجھ سے کمرے کا تالا کھولنے کے لیے کہا۔ میں نے آگے بڑھ کر تالا کھول دیا۔ دروازے کی چوکھٹ پر بھی بارہ نمبر لکھا ہوا تھا۔ ویٹر نے اندر داخل ہو کر بتی جلائی اور ہمارے سوٹ کیس ایک طرف دیوار سے لگا کر رکھ دیے۔ پھر وہ باتھ روم میں گھس گیا اور اس کا بلب جلا دیا۔ باتھ روم کی بتی بجھا کر وہ باہر آتے ہوئے بولا۔ "صابن اور تولیا میں ابھی دے جاؤں گا جناب! سیدھے ہاتھ والا نل گرم پانی کے لیے اور الٹے ہاتھ ٹھنڈے پانی کے لیے ہے۔ اندر بالٹی اور ڈونگا موجود ہے۔"

پھر ویٹر چلا گیا اور میں کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ وہاں دو بیڈ الگ الگ لگے ہوئے تھے جن پر صاف ستھرے بستر تھے۔ کمبل اور چادریں بھی مجھے نظر آئیں۔ ایک میز اور دو کرسیاں بھی وہاں تھیں۔ ذرا دیر میں ویٹر واپس آ کر دھلے ہوئے دو تولیے اور صابن باتھ روم میں رکھ گیا۔

میں نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تو ناہید ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے مجھ سے

کہنے لگی۔ "شہباز! ہوٹل میں رہنا تو ہمیں بہت مہنگا پڑے گا۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے ناہید!" میں نے اس سے اتفاق کیا۔ "لیکن فی الحال سر چھپانے کے لیے ہمیں کوئی جگہ تو چاہیے تھی۔ ایک ہفتے کے اندر اندر انشاء اللہ کسی مکان کا بندوبست ہو جائے گا۔ پھر ہم اس ہوٹل کو چھوڑ دیں گے۔ تم فکر نہ کرو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اس وقت تو ہم منہ ہاتھ دھو کر سو جاتے ہیں، کل کچھ سوچیں گے۔"

ناہید نے اقرار میں سر ہلایا اور پھر میرے کہنے پر پہلے وہی باتھ روم میں گھس گئی۔ کچھ دیر میں وہ منہ دھو کر نکلی تو میں اندر چلا گیا۔

بہاولپور سے ہم اتنی عجلت میں فرار ہوئے تھے کہ ناہید کے جو کپڑے درزی کو سلنے دیے تھے، وہ بھی وہیں چھوڑنے پڑے۔ ناہید کے پاس نزہت کا بس وہی ایک جوڑا تھا جو پہنے ہوئے تھی۔ سب سے پہلے مجھے اس کے لیے کپڑوں کا بندوبست ہی کرنا تھا۔

باتھ روم سے نکل کر میں نے ناہید سے پوچھا۔ "بتی بجھا دوں؟"

"ہاں بجھا دو۔" اس نے جواب دیا۔

بتی بجھا کر میں بستر پر لیٹ گیا۔ اس نئے شہر میں یہ میری پہلی رات تھی۔ کچھ دیر کروٹیں بدل کر آخر مجھے نیند آ ہی گئی۔

☆======☆======☆

معلوم نہیں اس وقت رات ہی تھی یا صبح ہو چکی تھی کہ جب اچانک کمرے کے دراز ے پر دستک ہوئی۔ میری آنکھ کھل گئی۔ مگر ناہید سوتی رہی۔ غنودہ ذہن سے یہ سوچتے ہوئے کہ دستک دینے والا کون ہو سکتا ہے، میں دروازے تک پہنچا۔ دستک دینے والے نے شاید میرے قدموں کی چاپ سن لی تھی اسی لیے اب خاموشی چھا گئی۔ کمرے کی بتی میں پہلے جلا چکا تھا۔ پھر جیسے ہی میں نے دروازہ کھولا، ایک دراز قد شخص تیزی سے اندر داخل ہوا۔ دوسرے ہی لمحے مجھے اس کے ہاتھ میں خطرناک کھلونا نظر آیا۔ اس کے ریوالور کا رخ میرے سینے کی طرف تھا۔

''اگر تم مرنا نہیں چاہتے تو ہاتھ اٹھا کر خاموشی سے ایک طرف کھڑے ہو جاؤ!'' دراز قد شخص کسی سانپ کی طرح پھنکارا۔

میں نے فوراً اپنے دونوں ہاتھ اٹھا دیئے۔ اس کے اور میرے درمیان صرف چند فٹ کا فاصلہ تھا۔ معلوم نہیں وہ کون تھا اور میرے کمرے میں کیوں گھس آیا تھا! اس وقت غیر ضروری بہادری دکھانا اپنی موت کو دعوت دینا ہی ہوتا کیوں کہ میں غیر مسلح تھا۔

اس شخص نے بہ عجلت مڑ کر اندر سے کمرے کا دروازہ بند کیا اور پھر دھیمی لیکن سخت آواز میں مجھے دوسرا حکم دیا۔ ''اپنے بیڈ کے قریب سے ہٹ جاؤ!''

میں آہستگی سے الٹے قدموں پیچھے ہٹتا ہوا اس جگہ تک پہنچ گیا جہاں ناہید اپنے بیڈ پر بے خبر سو رہی تھی۔ اس نے سر تک کمبل اوڑھ رکھا تھا۔ میرا نشانہ لئے ہوئے وہ دراز شخص قدم بہ قدم آگے بڑھا۔ پھر اسے میں نے اپنے بیڈ کے قریب پہنچ کر رکتے دیکھا۔ وہ مجھ پر نظر جمائے ہوئے جھکا اور میرا تکیہ اٹھا لیا۔ تکیے کا غلاف اتار کر اس نے ایک طرف پھینک دیا اور اسے ٹٹول کر دیکھنے لگا۔ میرے بیڈ پر موجود کمبل اور گدے پر بچھی ہوئی چادر بھی اس نے اٹھا کر نیچے ڈال دی۔ میں حیرت سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اتنا اندازہ مجھے بہرحال ہو گیا تھا کہ اسے کسی چیز کی تلاش ہے۔ گدے کو بھی اس نے بیڈ سے اٹھایا اور گہری نظر سے بیڈ کا

جائزہ لیا۔ ایک ہاتھ سے اس نے فوم کے گدے کو بھی الٹ پلٹ کر اور ٹٹول کر دیکھا۔

''اسے اٹھاؤ جو اب تک پڑی سو رہی ہے۔'' اس نے اچانک مجھے مخاطب کیا۔

میں چونک اٹھا کیونکہ ناہید کا چہرہ کمبل میں چھپا ہوا تھا۔ میرے لیے یہ بات حیران کن ہی تھی کہ اسے کیسے پتہ چل گیا، دوسرے بیڈ پر سونے والی کوئی عورت ہے!

''جلدی جگاؤ اسے! میرے پاس وقت کم ہے۔'' وہ دوبارہ سخت آواز میں بولا۔

میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ ناہید کو جگا دیتا۔ سو میں نے ایسا ہی کیا۔ ناہید نے کمرے میں ایک مسلح شخص کو دیکھا تو اس کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ چکی تھی۔ ریوالور والا گھوم کر بیڈ کے پیچھے آ گیا۔

''اے لڑکی! بیڈ سے اٹھو!'' دراز قد شخص نے اس مرتبہ ناہید کو حکم دیا۔ پھر وہ مجھ سے بولا۔ ''اب اپنے بیڈ کے پاس جا کر کھڑے ہو جاؤ!''

اب میری پشت اس اجنبی کی طرف تھی۔ ناہید کا جسم شاید خوف کی زیادتی کے سبب شل ہو گیا تھا۔ وہ غالباً اسی لئے فوراً بیڈ سے نہ اٹھ سکی۔

''نہیں اٹھے گی تو؟'' اجنبی کی غراہٹ سنائی دی۔ اس کے ساتھ ''تڑاخ'' کی آواز آئی، اجنبی نے یقیناً ناہید پر ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔

ناہید کے منہ سے ہلکی سے چیخ نکل گئی، میں تیزی سے پلٹا، میری آنکھوں نے جو منظر دیکھا، اسے دیکھ کر میرا خون کھول اٹھا، اجنبی نے ناہید کے سر کے بال اپنے بائیں ہاتھ کی مٹھی میں جکڑ رکھے تھے اور جھٹکا دے کر اسے بستر سے اٹھا رہا تھا پھر تو جیسے میں اپنے ہوش میں نہ رہا، یہ بھلا کیسے ممکن تھا کہ کوئی میرے سامنے ناہید پر تشدد کرتا رہتا اور میں برداشت کر لیتا!

پلٹتے ہی میں نے اچھل کر اس کے دائیں ہاتھ پر لات ماری، میرے پیر کی بھرپور ضرب اس کی کلائی پر پڑی تھی۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل کر دیوار سے ٹکرایا اور نیچے گرا۔ وہ بیڈ کی دوسری طرف تھا۔ میں نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ اس نے ناہید کے بال چھوڑ دیئے تھے۔ اسے اپنے ساتھ لیے میں فرش پر آ رہا۔ پھر میں نے اسے سنبھلنے کی مہلت نہیں دی۔ میرے ہاتھ تیزی سے چلنے لگے۔ میرا ایک گھونسا اس کی کنپٹی پر پڑا تو وہ ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ اس میں میرے ارادے کا کوئی دخل نہیں تھا۔ اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ میں اٹھ کر کھڑا ہی ہوا تھا کہ چونک اٹھا۔

دروازے پر کوئی دستک دے رہا تھا۔ دستک دینے والا، دراز قد شخص کا کوئی ساتھی بھی ہو سکتا ہے، یہ خیال آتے ہی میں نے جھپٹ کر دیوار کے قریب پڑا ہوا ریوالور اٹھا لیا۔

اب میں کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھا۔

''ناہید! تم باتھ روم میں جاؤ اور اندر سے دروازہ بند کر لو۔'' دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے ناہید کے قریب رک کر سرگوشی کی۔

''اور...... اور تم...... تم شہباز؟'' ناہید کی آواز جیسے آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھی۔

''میری فکر نہ کرو! جو بھی ہوگا، میں بھگت لوں گا، تم جاؤ!'' میں نے اس کا بازو پکڑا اور خود اسے باتھ روم کے دروازے تک لے گیا'' چلو دیر نہ کرو!''

باتھ روم کا دروازہ کھول کر ناہید اندر چلی گئی اور پھر اس نے میری ہدایت پر عمل کرنے میں دیر نہیں کی۔ اس نے اندر سے باتھ روم کا دروازہ بند کر لیا۔ اس عرصے میں مزید دو مرتبہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے دروازے پر دستک دی جا چکی تھی۔ میں لپک کر کمرے کے دروازے تک پہنچا۔ اسی لمحے پھر دستک دی گئی۔

دروازے کھولنے سے پہلے میں نے ریوالور والا ہاتھ اپنے کرتے کی نچلی دائیں جیب میں ڈال لیا تا کہ باہر موجود شخص کو میرے پاس ریوالور نظر نہ آسکے۔

سیدھے ہاتھ کو میں کرتے کی جیب ہی میں ڈالے رہا اور بائیں ہاتھ سے دروازہ کھول دیا۔

اپنے سامنے ایک حسین و جوان عورت کو کھڑے دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ وہ ہلکے نیلے رنگ کی ساڑھی باندھے ہوئی تھی۔

''آپ خیریت سے تو ہیں؟'' اس عورت نے مجھے مخاطب کیا۔ اس کی آواز بھی اسی کی طرح حسین تھی۔

''جی...... جی ہاں، مگر آپ......؟''

''دراصل میں باتھ روم جانے کے لیے اٹھی تھی کہ مجھے کچھ ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے آپ کے کمرے میں کوئی زبردستی گھس آیا ہے۔'' وہ میری بات پوری سننے سے پہلے ہی بول اٹھی۔ ''میرا کمرا یہ سامنے والا ہے، میں اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر جب راہداری میں آئی تو آپ کے کمرے کی لائٹ جلتے دیکھی۔ پھر ذرا ہی دیر میں مجھے کسی عورت کی ہلکی سی چیخ سنائی دی۔ یہ چیخ بھی آپ ہی کے کمرے سے آئی تھی۔ میں نے جلدی سے اپنے کمرے میں جا کر ارشاد کو جگا دیا۔ ارشاد میرے شوہر ہیں۔ انہوں نے مجھے اس معاملے میں پڑنے سے منع کیا، مگر میرا دل نہ مانا، میں دوبارہ آپ کے کمرے کے دروازے پر آگئی، لائٹ اب تک جل رہی تھی مگر اندر خاموشی تھی۔ میں نے ہمت کر کے دروازے پر دستک دی کہ آپ کی

خیریت......''

عورت کی بات ابھی ادھوری تھی کہ سامنے والے کمرے کا دروازہ کھلا اور گٹھے ہوئے جسم ایک شخص باہر آگیا۔

''پروین!'' اس شخص نے عورت کو آواز دی، پھر پوچھا۔ ''کچھ پتہ چلا؟'' یہ کہتا ہوا وہ بھی عورت کے قریب آکھڑا ہوا۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ شخص کھلے ہوئے دروازے سے میرے کمرے کا جائزہ لے رہا تھا، معاً میں نے اسے چونکتے دیکھا۔

''وہ...... وہ شاید ادھر کسی کی لاش پڑی ہے، پیر...... پیر نظر آرہے ہیں۔'' اس شخص نے عورت کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کیا۔

''نن...... نہیں'' عورت غیر یقینی انداز میں بولی۔

''وہ مرا نہیں صرف بے ہوش ہوا ہے، آپ...... آپ لوگ خود دیکھ لیں۔'' اپنی صفائی میں یہ الفاظ بے اختیار میری زبان پر آگئے۔

وہ دونوں عورت اور مرد مزید کچھ کہے بغیر میرے کمرے میں آگئے، میں نے یہ سوچ کر کہ کہیں کوئی اور میرے کمرے میں نہ آجائے، اندر سے دروازہ بند کر دیا۔

مرد نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''یہ آپ نے دروازہ کیوں بند کر دیا؟''

''محض احتیاطاً۔'' میں نے وجہ بتائی۔ ''آپ مطمئن رہیں، میں کوئی غلط آدمی نہیں ہوں۔''

''وہ تو خیر آپ کے چہرے ہی سے معلوم ہو رہا ہے۔'' مرد نے کہا۔ ''لگتا ہے آپ بلاوجہ کسی مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔'' پھر وہ آگے بڑھ کر زمین پر پڑے ہوئے بے ہوش دراز قد شخص تک پہنچ گیا اور جھک کر اسے دیکھا، پھر جیسے اسے کچھ یاد آگیا اور وہ عورت سے مخاطب ہوا۔ ''یہاں تو مجھے اس شریف آدمی کے سوا کوئی لڑکی یا عورت نظر نہیں آرہی۔ تم تو کہہ رہی تھیں پروین کہ تمہیں کوئی نسوانی چیخ سنائی دی تھی!''

اب تک میں سمجھ چکا تھا کہ ان دونوں کا تعلق دراز قد شخص سے نہیں ہے۔ وہ محض انسانی ہمدردی کی بنیاد پر اس معاملے میں پڑ گئے تھے۔ اسی خیال میں بول اٹھا۔ ''میری بیوی بھی ساتھ ہے۔ دروازے پر دستک سن کر میں نے اسے باتھ روم میں بھیج دیا تھا۔ معاف کیجیے گا، میں دروازے پر دستک سن کر یہ سمجھا تھا کہ کوئی اسی غنڈے کا ساتھی ہوگا۔ اب میری یہ غلط فہمی دور ہو گئی ہے س لیے......'' میں اپنا جملہ نامکمل چھوڑ کر تیزی سے باتھ روم کی طرف

بڑھا اور ناہید کو آواز دی۔ ''باہر آجاؤ!''

ناہید باتھ روم کا دروازہ کھول کر باہر آگئی۔

''کمرے کو دیکھ کر تو ایسا لگ رہا ہے کہ یہاں خاصی ہنگامہ آرائی ہوئی ہے۔'' م نے اظہار خیال کیا۔ پھر اس نے مجھ سے سوال کیا۔ ''ہوا کیا تھا؟ یہ شخص جو فرش پر بے ہو پڑا ہے کیا اس سے آپ کی کوئی دشمنی ہے؟''

''بالکل نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میرے لیے تو یہ قطعی اجنبی ہے۔'' اس کے بعد میں نے مختصراً پیش آنے والے واقعہ بیان کر دیا۔

''پھر تو ہمیں ان لوگوں کی مدد کرنی چاہئے۔'' عورت نے مرد کو مخاطب کیا، اس کے لہجے میں ہمدردی کا اظہار ہو رہا تھا۔

''لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں پروین؟ زیادہ سے زیادہ ہم ہوٹل والوں کو اس واقعے سے آگاہ کر سکتے ہیں، ہوٹل والے پولیس کو بلوا لیں گے جو اس غنڈے کو گرفتار کر کے......''

''نہیں ارشاد!'' عورت بول اٹھی۔ ''پولیس آگئی تو ان دونوں بے گناہ میاں بیوی کو بھی ناحق پریشان کرے گی، ممکن ہے ان سے رشوت وصول کرنے کے لیے پولیس انہیں بھی پکڑ کر تھانے لے جائے، اگر ان بے چاروں کی مدد ہی کرنی ہے تو کوئی اور تدبیر سوچو۔''

''یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو پروین! یقیناً پولیس ان لوگوں کو تنگ کر سکتی ہے، لیکن اس بے ہوش غنڈے کا کیا کیا جائے!'' مرد یہ کہہ کر سوچ میں پڑ گیا، عورت جس کا نام پروین تھا اسی کو ارشاد کہہ رہی تھی، ان دونوں ہی کے نام مجھے معلوم ہو چکے تھے۔

اس معاملے میں پولیس کی مداخلت میرے اور ناہید کے لیے بھی کسی طرح سودمند نہ ہوتی۔ پولیس اگر مجھ سے یہی ثبوت مانگ لیتی کہ ناہید میری بیوی ہے تو میں کیا جواب دیتا! میں نے بھی اس لیے پروین کے خیال سے اتفاق ضروری سمجھا۔

''آپ کی بیگم صاحبہ نے درست اندیشے کا اظہار کیا ہے جناب!'' میں نے کہا۔ ''ہم پولیس کے چکر میں پھنسنا نہیں چاہتے۔''

''پھر تو ایک ہی راستہ ہے کہ آپ دونوں یہ ہوٹل چھوڑ دیں۔'' ارشاد کہنے لگا۔ ''اس طرح آپ پولیس سے محفوظ رہ سکتے ہیں، ویسے بھی آپ یہاں خطرے ہی میں رہیں گے۔'' پھر میرے سوال کرنے سے پہلے ہی اس نے وضاحت کر دی۔ ''اس بے ہوش غنڈے کے دوسرے ساتھی بھی یہاں آسکتے ہیں۔''

''تو پھر کیا ہونا چاہئے ارشاد؟ جلدی سوچو۔'' پروین بولی۔ ''اس غنڈے کو ہوش بھی آسکتا ہے۔''

''ہاں پہلے اس کا بندوبست ضروری ہے۔'' ارشاد نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔

''ایسا کیوں نہ کریں ارشاد کہ اسے اٹھا کر ہم اپنے کمرے میں لے جائیں! پھر اس کے ہاتھ پیر باندھ کر منہ میں کپڑا ٹھونس دیں، اس کے بعد یہ ہوش میں آبھی گیا تو ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہوگا، ہم اسے کبھی بھی بیڈ کے نیچے ڈال دیں گے۔'' پروین نے تجویز پیش کی۔

''اس کی طرف سے مطمئن ہو کر کچھ سوچ سکتے ہیں۔'' میں نے یہ سن کر سوچا کہ ارشاد پرائی بلا اپنے سر لینے پر آمادہ نہیں ہوگا، مگر میرا خیال غلط نکلا، وہ راضی ہو گیا۔

ارشاد اور میں نے بے ہوش دراز قد شخص کو اٹھایا، پروین نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا، ارشاد کے کمرے کا دروازہ پہلے ہی سے کھلا ہوا تھا، پروین اپنے ساتھ ہی ناہید کو بھی اسی کمرے میں لے آئی۔ ارشاد نے کہیں سے ایک ریشمی ڈوری نکالی اور بے ہوش غنڈے کے ہاتھ پیر باندھ دیئے۔ اس کے ساتھ ہی ارشاد نے ایک کپڑا کس کے اس کے منہ پر باندھ دیا۔ کمرے میں موجود ایک بیڈ کے نیچے اس غنڈے کو اٹھا کر ڈال دیا گیا، میں نے بھی اس میں ارشاد کا ہاتھ بٹایا۔

''کیا خیال ہے ارشاد صاحب، اس شخص کا ریوالور بھی اسی کی جیب میں رکھ دیا جائے؟'' میں نے ارشاد سے مشورہ طلب کیا۔

''تو کیا ریوالور آپ کے پاس ہے؟'' ارشاد نے حیرت سے پوچھا۔

''جی ہاں، جب پروین صاحبہ نے میرے کمرے کے دروازے پر دستک دی تھی تو میں نے اس کے ہاتھ سے گرا ہوا ریوالور اٹھا لیا تھا۔'' میں نے بتایا اور اپنے کرتے کی جیب سے ریوالور نکال کر دکھایا۔ ''یہ رہا وہ ریوالور، اب آپ ہی بتائیے اس کا کیا کیا جائے؟''

''تم لوگ باتیں کرتے رہنا۔'' پروین نے گفتگو میں مداخلت کی۔ ''میں ابھی آتی ہوں ارشاد!''

''کہاں جا رہی ہو؟'' ارشاد نے دریافت کیا۔

''تم نے ان کے کمرے کی حالت نہیں دیکھی کیا! اگر انہیں ہوٹل چھوڑنا پڑا تو......''

''سمجھ گیا میں، تم جاؤ۔'' ارشاد بول اٹھا۔

پروین فوراً کمرے سے چلی گئی، جاتے ہوئے وہ دروازہ بھیڑ گئی تھی۔

''آپ تو سمجھ گئے ارشاد صاحب لیکن میں کچھ نہیں سمجھا، پروین صاحبہ ہمارے کمرے میں کیوں گئی ہیں؟'' میں نے معلوم کیا۔

"دراصل جب کوئی شخص ہوٹل سے کمرا چھوڑ کر جاتا ہے تو ہوٹل والے کمرے کو چیک کرتے ہیں، آپ کے کمرے کی جو حالت ہے اسے اسی حالت میں چھوڑنا ہوٹل والوں کو شک میں مبتلا کرنا ہے! آپ کے ذہن میں شاید یہ بات نہیں آئی ہوگی۔" ارشاد نے مجھے بتایا۔

"جی ہاں۔" میں نے اعتراف کرلیا، اسے یہ بتانا ضروری نہیں سمجھا کہ کسی ہوٹل میں قیام کا میرے لئے یہ پہلا موقع ہے۔

ریوالور ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا، ارشاد نے اسے مجھ سے لے کر اپنے تکیے کے نیچے رکھ دیا۔

"اس ریوالور کے بارے میں پھر سوچیں گے۔" ارشاد کہنے لگا۔ "پہلے تو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ہوٹل آپ کو چھوڑنا ہے یا نہیں! میں تو آپ کو اپنی رائے بتا ہی چکا ہوں، میرے خیال میں تو آپ لوگوں کے لیے اس ہوٹل کو چھوڑ دینا ہی بہتر ہوگا۔"

"بات دراصل یہ ہے کہ ارشاد صاحب کہ...... کہ ہم پہلی مرتبہ کراچی آئے ہیں۔" میں نے کسی قدر جھجکتے ہوئے کہہ ہی دیا۔ "ہمیں تو یہاں کے راستے تک معلوم نہیں، آج ہی رات تو ہم یہاں آئے ہیں، اس ہوٹل تک بھی ہمیں ایک قلی نے پہنچادیا تھا ورنہ تو رات پلیٹ فارم ہی پر گزارنی پڑتی، آس پاس یہاں جو اور ہوٹل ہیں، ان میں ٹھہرنا شاید مناسب نہیں ہوگا، خاص طور پر اس واقعے کے بعد ہوش میں آکر اس غنڈے اور اس کے ساتھیوں نے ہم سے انتقام لینے کی خاطر ہمیں تلاش کیا تو اردگرد کے ہوٹل ضرور دیکھیں گے، اگر کسی دوسرے ہوٹل میں منتقل ہونا ہے تو اسے یہاں سے دور......"

"میں سمجھ گیا۔" ارشاد نے میری بات کاٹ دی۔ "آپ تو مجھے خاصے دور اندیش معلوم ہوتے ہیں، پروین کو آجانے دیں پھر خود ہمیں بھی یہ سوچنا پڑے گا کہ ہم کیا کریں! اب بے ہوش غنڈے سے ہمیں بھی تو اپنی جان چھڑانی پڑے گی۔"

"ہم لوگوں کی وجہ سے آپ بھی ناحق مصیبت میں پھنس گئے۔" ناہید پہلی بار بولی وہ بیڈ کے قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔

"وہ آدمی ہی کیا جو آڑے وقت پر کسی کے کام نہ آئے۔" ارشاد نے پُرخلوص آواز میں کہا۔

ابھی یہی گفتگو جاری تھی کہ پروین کمرے میں لوٹ آئی اور بتایا۔ "میں نے کمرے کی حالت ٹھیک کردی ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ ناہید کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"میرا خیال ہے کہ اب احتیاط کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ہمیں جو گفتگو کرنی ہے یہاں

نہ کریں، بے ہوش غنڈے کو کسی وقت بھی ہوش آسکتا ہے۔" ارشاد بولا۔ "یہ اچھا نہیں ہوگا کہ ہوش میں آکے وہ بھی ہماری باتیں سن لے۔ آپ کے کمرے میں چلیں؟" ارشاد نے میری طرف سوالیہ نظریں اٹھائیں۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں!" میں نے جواب دینے میں دیر نہیں کی۔ "بالکل چلئے!" یہ کہتے ہی میں اٹھ کھڑا ہوا، ناہید نے بھی میری تقلید کی۔

"آپ لوگ چلیں، میں ابھی باتھ روم سے ہوکر آئی۔" پروین بولی

ارشاد کے ساتھ میں اور ناہید واپس اپنے کمرے میں آگئے۔ کمرے میں گھستے ہی میری نظر اپنے بستر پر پڑی، گدا، تکیہ، کمبل وغیرہ مجھے سب ترتیب سے رکھے نظر آئے۔ پروین نے ناہید کے بستر کی شکنیں بھی درست کردی تھیں، میں اور ناہید بیڈ پر بیٹھ گئے، ارشاد نے کرسی سنبھال لی۔

"پروین کے آنے ہی پر بات کرنی ٹھیک رہے گی تاکہ وہ بھی اپنا مشورہ دے سکے۔" ارشاد نے کہا۔

میں نے اقرار میں سر ہلا دیا، گھڑی میں وقت دیکھنے پر پتا چلا کہ صبح کے سوا پانچ بجنے والے تھے، اس کا مطلب یہی تھا کہ مجھے اور ناہید کو زیادہ دیر سونے کا موقع نہیں ملا تھا۔ میں نے یوں ہی وقت گزاری کے لیے ارشاد سے پوچھ لیا۔ "ہماری طرح آپ کے لیے تو کراچی شہر اجنبی نہیں؟"

"جی نہیں، ہم پہلے بھی یہاں آتے رہے ہیں۔" ارشاد نے بتایا، پھر بولا۔ "آپ لوگوں سے تو اب تک تعارف ہوا ہی نہیں۔"

"ابھی اس کی مہلت ہی ہمیں کہاں ملی تھی ارشاد صاحب!" میں نے یہ کہہ کر اپنا اور ناہید کا نام بتادیا۔

پروین کو آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ اس کے ہاتھ میں مجھے کمرے کی چابی بھی نظر آئی، خود وہ بھی کہنے لگی۔ "بہ طور احتیاط میں کمرے کو مقفل کر آئی ہوں، اس لیے بھی کہ اس غنڈے کو ہوش آگیا ہے، وہ ناک سے غوں غوں کی آوازیں نکال رہا تھا۔"

"کہیں کوئی اس کی آوازیں سن کر متوجہ نہ ہوجائے!" میں نے اندیشے کا اظہار کیا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" ارشاد نے کہا، پھر پروین سے کمرے کی چابی لے کر بولا۔ "میں اس کی کنپٹی سہلا کر ابھی آتا ہوں۔"

ارشاد چلا گیا تو پروین نے مجھ سے پوچھا۔ "کیا فیصلہ کیا آپ لوگوں نے؟"

’’آپ کی آمد کا انتظار تھا اور اب......‘‘

’’ارشاد کی واپسی کا انتظار کرنا پڑے گا۔‘‘ پروین نے مسکراتے ہوئے میری بات مکمل کر دی۔

میں نے پروین سے بھی اپنا اور ناہید کا تعارف کرایا، پھر اس کی غیر موجودگی میں جو باتیں میرے اور ارشاد کے درمیان ہوئی تھیں ان سے بھی اسے آگاہ کر دیا۔

’’شہباز صاحب! میں تو سمجھتی ہوں کہ ہمیں بھی آپ لوگوں کے ساتھ ہی یہ ہوٹل چھوڑنا ہوگا۔‘‘ پروین بولی۔

’’یہ تو اور بھی اچھا رہے گا کہ ہم لوگ کسی ایک ہی ہوٹل میں رہیں۔‘‘ ناہید کہنے لگی ’’آپ کو تو شہباز نے ابھی بتا ہی دیا ہے کہ ہم اس شہر میں نئے ہیں۔‘‘

اسی وقت ارشاد واپس آ گیا اور بولا۔ ’’اب اسے جلد ہوش نہیں آئے گا، میں نے اس کی کنپٹی پر ذرا ٹھیک ٹھاک قسم کی ضرب لگائی ہے۔‘‘

’’مار تو نہیں دیا اسے؟‘‘ پروین نے چونک کر معلوم کیا۔

’’اب میں اتنا اناڑی بھی نہیں ہوں، ناک پر ہاتھ رکھ کر دیکھ لیا تھا، سانس لے رہا تھا وہ۔‘‘

’’اچھا اس پر خاک ڈالو اور یہ بتاؤ کہ اب کیا کرنا ہے!‘‘ پروین نے فوراً ہی اصل موضوع گفتگو چھیڑ دیا۔

’’پہلے تو شہباز صاحب سے پوچھنا ہے کہ ان کا کیا ارادہ ہے؟‘‘ ارشاد نے پروین کے قریب دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے میری طرف اشارہ کیا۔

’’مجھے آپ دونوں پر پورا بھروسہ ہے کہ جو مشورہ دیں گے ہمارے لیے بہتر ہوگا کیوں ناہید!‘‘ میں نے یہ کہہ کر مشورہ طلب انداز میں ناہید کی طرف دیکھا۔

’’تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو شہباز! میرا بھی یہی خیال ہے۔‘‘ ناہید نے میری تائید کی۔

مزید کچھ دیر گفتگو اور مشورے کے بعد یہی طے ہوا کہ اس ہوٹل کو چھوڑ دیا جائے ارشاد اور پروین بھی ہمارے ہی ساتھ اس ہوٹل سے چلنے پر آمادہ ہو گئے۔

’’آپ دونوں کاؤنٹر پر چل کر حساب وغیرہ کریں، ہم بھی آپ کے پیچھے پیچھے اپنا سامان لے آتے ہیں۔‘‘ ارشاد نے اٹھتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔

’’اور وہ غنڈا جو آپ کے کمرے میں بیڈ کے نیچے بے ہوش پڑا ہے، اس کا کیا ہوگا؟‘‘ میں نے پوچھ لیا۔

’’وہ بدستور وہیں بے ہوش پڑا رہے گا، ویٹر کمرا چیک کرتے ہوئے بیڈ کے نیچے جھانک کر نہیں دیکھتے۔ احتیاطاً میں خود اپنی موجودگی میں کمرا چیک کراؤں گا۔‘‘ ارشاد نے میرے سوال کا جواب دیا۔ ’’آپ اس سلسلے میں فکرمند نہ ہوں۔‘‘ پھر ارشاد اپنے ساتھ پروین کو لے کر کمرے سے نکل گیا۔

’’شہباز! اگر یہ شریف اور ہمدرد لوگ نہ مل جاتے تو نہ جانے کیا ہوتا!‘‘ ناہید یہ کہتے ہوئے اٹھی۔

’’بس اللہ ہی ہر مصیبت سے بچانے والا ہے، وہی کسی نہ کسی کو ذریعہ بنا دیتا ہے۔‘‘

میں نے طویل سانس لیا اور سوٹ کیس سے کپڑے نکال کر باتھ روم میں بدلنے چلا گیا، ناہید کے پاس کیوں کہ ایک ہی جوڑا تھا اس لیے مجبوری تھی۔ اسے وہی جوڑا پہن کر ساتھ چلنا پڑا۔ اپنے دونوں سوٹ کیس اٹھائے ہم کمرے سے نکل آئے اور اسے مقفل کر دیا۔ ہم کاؤنٹر پر پہنچے تو ادھیڑ عمر شخص اونگھ رہا تھا۔ سامنے ہی پڑے ہوئے ایک صوفے پر وہی ویٹر سکڑا، سمٹا چادر اوڑھے لیٹا تھا جس نے ہمیں کمرے تک پہنچایا تھا۔ ہوٹل کا دروازہ نیم وا تھا، میں نے اونگھتے ہوئے شخص کو آواز دی۔ ’’سنیے جناب!‘‘

وہ شخص ہڑبڑا کر سیدھا بیٹھ گیا اور بولا۔ ’’جی؟‘‘

’’ہم ہوٹل چھوڑ کر جا رہے ہیں، حساب کر لیجیے، میں نے ایک ہزار روپے ایڈوانس جمع کرائے تھے۔‘‘

’’لیکن آپ تو ایک ہفتے تک رہنے کو کہہ رہے تھے!‘‘

’’ہاں پہلے یہی ارادہ تھا، مگر ڈائری میں ایک عزیز کا پتہ مل گیا، اب ہم وہاں رہیں گے۔‘‘ مجھے فوری طور پر یہی بہانہ سوجھ سکا۔

’’آپ کی مرضی۔‘‘ اس نے یہ کہہ کر ویٹر کو آواز دی، دو تین آوازیں دینے پر ویٹر اٹھا۔ اس شخص نے مجھ سے چابی لے کر ویٹر کو تھما دی۔ ’’کمرا چیک کر لو۔‘‘

ویٹر گیا ہی تھا کہ پروین اور ارشاد بھی اپنے اپنے سوٹ کیس اٹھائے آ گئے، ارشاد کے کاندھے سے ایک بڑا ایئر بیگ بھی لٹک رہا تھا۔

’’کیا آپ لوگ بھی جا رہے ہیں؟‘‘ کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شخص نے رجسٹر میں کچھ لکھتے لکھتے سر اٹھا کر ارشاد سے پوچھا۔

’’جی ہاں۔‘‘ ارشاد نے جواب دیا۔ ’’لیکن پہلے آپ ان سے حساب کتاب کر لیں۔‘‘

اس شخص نے اثبات میں سر ہلا کر ایک دراز کھینچی اور ایک سو ستر روپے کاٹ کر آٹھ تیس روپے میری طرف بڑھا دیئے، میں نے نوٹ گن کر جیب میں رکھ لئے، ویٹر لوٹ اور چابی کاؤنٹر پر رکھی تو ارشاد اس سے اپنا کمرا چیک کرانے کے لیے بولا۔

''آپ تو جناب، آتے جاتے ہی رہتے ہیں، مگر خیر چلئے۔'' ویٹر یہ کہہ کر ارشاد ساتھ چل دیا۔

میں یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ ارشاد اور پروین کے ساتھ جا رہا ہوں اس لئے سو کیس اٹھا کر ناہید کو ساتھ چلنے کا اشارہ کیا، پروین بھی اسی طرح اجنبی بنی ہوئی کھڑی، جیسے ہم دونوں کو نہ جانتی ہو، میں ہوٹل کے دروازے سے نکل کر ذرا دور آ کھڑا ہوا اور سو کیس زمین پر رکھ دیے۔ اب مجھے ارشاد اور پروین کے ہوٹل سے نکلنے کا انتظار، اس ا شہر میں انہی کو ہماری رہنمائی کرنی تھی۔ ان دونوں کی آمد میں زیادہ دیر نہ لگی، کچھ ہی فا پر دو تین ٹیکسیاں کھڑی تھیں، ہم چاروں ان کی طرف قدم بڑھانے لگے۔

ایک ٹیکسی والے سے ارشاد ہی نے بات کی، میں صرف لفظ ''صدر'' سن سکا، ٹیکسی ڈگی میں چاروں سوٹ کیس رکھ دیئے گئے، ایئر بیگ کو ارشاد اپنے کاندھے ہی پر لٹکا رہا، پچھلی سیٹ پر میرے ساتھ ناہید اور پروین بیٹھ گئیں، ارشاد آگے ڈرائیور کی برابر سیٹ پر بیٹھا اور ٹیکسی چل پڑی، اس وقت صبح کے چھ بج رہے تھے، میں ٹیکسی سے باہر کا نظ کرنے لگا، اتنی بڑی بڑی سڑکیں میں نے پہلی بار دیکھی تھیں۔

وہ سفر زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا، تقریباً پندرہ منٹ بعد ہی ٹیکسی ایک ہوٹل سامنے رک گئی، میں نے دیکھا وہ ہوٹل کئی منزلہ تھا، ہوٹل کی سیڑھیوں اور پھر راہداری بھی مجھے کارپٹ بچھا ہوا نظر آیا، جب ہم ہوٹل کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے تو اسی وقت باوردی پورٹروں نے ہمارے ہاتھوں سے سوٹ کیس لے لئے تھے۔ ناہید اور میں دونوں ہی اطراف کا جائزہ لے رہے تھے۔

اس ہوٹل کی زیب و زینت اور رکھ رکھاؤ دیکھ کر میرے لیے یہ سمجھنا دشوار نہ ہوا کہ مہنگا ہوٹل ہے مگر میں خاموش رہا۔ اس وقت تک میں نے کراچی کے بڑے ہوٹل نہیں د تھے اس لیے اسی ہوٹل کو بڑا سمجھ رہا تھا۔ ارشاد سے اس سلسلے میں کچھ کہنا میں نے ضر خیال نہ کیا۔ کاؤنٹر کے سامنے دیوار سے لگے ہوئے آرام دہ صوفے پڑے تھے، پروین وہاں اپنے ساتھ ناہید کو بٹھا لیا۔ ارشاد کے قریب میں کاؤنٹر پر کھڑا تھا۔ اپنا شناختی کارڈ نے پہلے ہی سوٹ کیس سے نکل کر قمیض کی اوپری جیب میں رکھ لیا تھا۔ اس ہوٹل کے

روم کا کرایہ میری توقع سے کہیں زیادہ، یعنی ساڑھے تین سو روپے یومیہ تھا۔ ارشاد نے مجھ سے شناختی کارڈ لے کر کاؤنٹر پر موجود مستعد نوجوان کی طرف بڑھا دیا، اپنا شناختی کارڈ وہ پہلے دے چکا تھا۔

''ایک ہفتے کے لیے دو ڈبل بیڈ روم بک کر دیجئے۔ دونوں روم ساتھ ساتھ ہونے چاہئیں۔'' ارشاد نے نوجوان کو مخاطب کیا۔

''ذرا دیکھنے دیجئے، میرا خیال ہے کہ تیسری منزل پر آپ کو برابر برابر ڈبل روم مل سکتے ہیں۔'' نوجوان نے چارٹ نکال کر اس پر نظریں دوڑائیں۔

''جی ہاں...... یہ ڈبل روم تین سو سات اور تین سو آٹھ آپ لوگوں کے لیے ٹھیک رہیں گے۔'' نوجوان نے بال پین سے چارٹ پر نشان لگایا۔ ''لفٹ موجود ہے جناب! آپ لوگوں کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔''

ارشاد نے مجھ سے کچھ پوچھے بغیر رضامندی ظاہر کر دی۔ پھر جب وہ اپنا پرس جیب سے نکال کر ایڈوانس پےمنٹ کرنے لگا تو میں نے اپنے پاس موجود رقم اس کی طرف بڑھا دی جو اس نے یہ کہہ کر نہیں لی کہ بعد میں حساب ہو جائے گا۔

میں نے دیکھا کہ ارشاد نے ہزار ہزار روپے کے پانچ نوٹ بہ طور ایڈوانس دیئے تھے۔ اصولی طور پر اس میں سے ڈھائی ہزار روپے مجھے ادا کرنے چاہئیں تھے لیکن میرے پاس تو پورے دو ہزار بھی نہیں تھے۔ کاؤنٹر پر اندراجات کے بعد ہوٹل کے پورٹر ہمارا سامان اٹھا کر ساتھ چلنے لگے، کچھ ہی فاصلے پر بائیں جانب اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں تھیں، انہی کے قریب دو لفٹوں کے دروازے نظر آ رہے تھے۔ ان لفٹوں میں سے ایک کے ذریعے ہم چاروں ان دونوں پورٹروں کے ساتھ ہوٹل کی تیسری منزل پر پہنچ گئے۔

راستے ہی میں ارشاد نے تین سو سات نمبر کے کمرے کی چابی میرے حوالے کر دی۔ اس ہوٹل کے مقابلے میں مجھے وہ ہوٹل کباڑ خانہ معلوم ہوا جہاں رات کے چند گھنٹے گزارے تھے۔ برابر برابر موجود کمروں کے سامنے رک کر پورٹروں نے ہم سے چابیاں لے لیں اور خود ہی کمروں کے دروازے کھولے۔

ناہید کے ساتھ میں اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔ کمرا بہت صاف ستھرا تھا۔ اس کے درمیان بڑا سا ڈبل بیڈ بچھا ہوا تھا۔ بیڈ سے ذرا فاصلے پر ایک گول میز اور چار کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ مجھے وہاں لکڑی کی ایک خوبصورت الماری بھی نظر آئی۔ بیڈ کے برابر ہی ایک تپائی پر ٹیلی فون سیٹ بھی رکھا ہوا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی دائیں جانب واش روم کا

دروازہ تھا۔ اس کے مقابل وارڈ روب تھا جہاں خالی ہینگر ٹنگے ہوئے تھے، نیچے جو
رکھنے کے لیے جگہ بنی ہوئی تھی، وہاں دو جوڑی چپلیں رکھی تھیں۔ پورٹر نے ہمارے سو
کیس لکڑی کی الماری کے پاس رکھ دیئے۔

اس وقت میری نگاہ سامنے دیوار پر پڑی جہاں مجھے ایک دروازہ دکھائی د
دروازے کی چٹخنی کھول دی۔ ارشاد دروازہ کھول کر میرے کمرے میں آ گیا۔ پورٹر ا
کمرے سے گیا نہیں تھا۔ اسے ارشاد نے دس روپے کا نوٹ دیا اور وہ ''تھینک یو'' کہ
کمرے سے چلا گیا۔ اسی دوران میں پروین بھی درمیانی دروازے سے وہیں آ گئی۔

''کیا یہاں ہوٹل کے پورٹروں وغیرہ کو بھی پیسے دینے پڑتے ہیں؟'' میں نے پو
چھ لیا۔

''یہ ضروری تو نہیں لیکن اخلاقاً ایسا کرنا پڑتا ہے، بڑے ہوٹلوں میں اس کو ٹپ ک
ہیں۔'' ارشاد نے بتایا۔

''اچھا'' میں نے اثبات میں سر ہلا دی۔

''یہ جو درمیانی دروازہ ہے، اسے دونوں طرف سے بند کیا جا سکتا ہے۔'' ارشاد ک
لگا۔ ''ہم لوگ چاہیں تو اسے کھلا رکھیں یا چاہیں تو بند کر لیں، یہ ہماری مرضی پر ہے، دو
زیادہ افراد اگر ایک ساتھ رہنا چاہیں تو ہوٹل والوں نے ان کے لیے یہ بندوبست کر
ہے، اگر ایسا نہ ہو تو درمیانی دروازہ بند رکھ کر دو الگ الگ بیڈ روم بھی یہاں ٹھہرنے والو
دیئے جا سکتے ہیں۔''

''ارشاد! یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔'' پروین نے اپنے شوہر کو مخاطب کیا۔ ''مجھ
بھوک لگ رہی ہے، پہلے ناشتے کے لیے کچھ منگواؤ۔''

''آپ لوگ بیٹھیے تو سہی!'' میں بولا حالانکہ خود بھی کھڑا ہوا تھا۔

''میرا خیال ہے پروین، یہ لوگ بھی ناشتہ کرنا چاہتے ہوں گے، ہم سب ایک
ساتھ ناشتہ کر لیتے ہیں۔'' یہ کہہ کر ارشاد اٹھا اور فون پر روم سروس سے رابطہ کر کے کمر
بتایا اور پھر چار افراد کے لیے ناشتے کا آرڈر دے دیا۔

پھر ہم سبھی گول میز کے گرد آرام دہ کرسیوں پر بیٹھ گئے، ہر چند کہ کمرے میں مو
ڈبل بیڈ خاصا بڑا تھا، ناہید کے ساتھ میں اس پر نہایت آرام سے سو سکتا تھا، پھر بھی مجھے
دیکھ کر الجھن سی ہوئی، میرے لیے یہ تصور بڑا عجیب سا تھا کہ مجھے اور ناہید کو اسی ایک بیڈ
ساتھ سونا تھا۔

''ارشاد صاحب، مجھے آپ سے ایک بات کہنی تھی۔'' میں کسی قدر جھجکتے ہوئے بولا۔
''دراصل میرے پاس فی الحال رقم کم ہے، مجھے پہلے سے اندازہ نہیں تھا کہ...... کہ آپ ہمیں
کسی ایسے...... ایسے ہوٹل میں لے آئیں گے جس کے اخراجات اتنے زیادہ......''

''آپ کے پاس اگر تھوڑی رقم ہے تو کوئی بات نہیں۔'' ارشاد بول اٹھا۔ ''میں نے تو
آپ سے رقم کا مطالبہ ابھی نہیں کیا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن......''

اسی وقت ناہید نے میری بات کاٹ دی اور ارشاد سے کہنے لگی۔ ''شہباز کی مراد نقد
رقم سے تھی ورنہ تو خدانخواستہ رقم کا کوئی مسئلہ نہیں ہے، ہمارے پاس دس ہزار روپے والا ایک
ایسا پرائز بانڈ موجود ہے جس پر گزشتہ روز ہی پہلے انعام یعنی سوا کروڑ روپے کا اعلان ہوا
ہے۔''

''جی؟'' ارشاد اور پروین بہ یک وقت ناقابل یقین لہجے میں بولے، ان کے
چہروں پر شدید حیرت کے آثار تھے۔

ناہید نے یقیناً خجالت سے بچنے کے لیے ان دونوں کو یہ بات بتائی تھی، لیکن میرے
خیال میں یہ کچھ اچھا نہیں ہوا تھا، ان دونوں میاں بیوی نے ہر چند اب تک ہمارے ساتھ
نہایت ہمدردی اور خلوص کا اظہار کیا تھا لیکن وہ بہرحال اجنبی ہی تھے۔ ایک نئے شہر میں
ہمیں اتنی جلدی کسی پر اعتماد نہیں کرنا چاہیئے تھا، مگر اب کیا ہو سکتا تھا! میں نے یہی سوچ کر
ناہید کی تائید میں کہا۔ ''آپ نے جو کچھ سنا وہ قطعی درست ہے۔ یہ پرائز بانڈ کیش کرانے
کے بعد ہمارے لئے واقعی رقم کی کمی مسئلہ نہیں رہے گا۔''

میری اس تائید اور وضاحت کے باوجود ان دونوں کے چہروں سے حیرت ہی کا
اظہار ہوتا رہا، شاید انہیں ابھی ہماری بات پر یقین نہیں آیا تھا۔

کچھ دیر تک کمرے میں خاموشی چھائی رہی، پھر ارشاد بولا۔ ''کیا آپ یہ پرائز بانڈ
کیش کرانا چاہتے ہیں۔''

ظاہر ہے کیش تو کرانا ہی ہوگا ورنہ ہم اپنے اخراجات کیسے برداشت کریں گے!''
میں نے جواب دیا۔

''آپ نے بتایا تھا کہ پہلی مرتبہ اس شہر میں آئے ہیں۔ پھر ظاہر ہے کہ یہاں آپ کا
کوئی بینک اکاؤنٹ بھی نہیں ہوگا۔'' ارشاد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''میں تو سمجھ رہا تھا کہ پرائز بانڈ کسی بھی بینک سے کیش کرایا جا سکتا ہے، اس کے

لیے بینک اکاؤنٹ کی ضرورت نہیں ہوگی، مگر آپ کہہ رہے ہیں......"

"آپ غالباً میری بات کا مطلب نہیں سمجھے شہباز صاحب! میرے کہنے کا مقصد کہ اتنی بڑی رقم ساتھ رکھنا کسی بھی طرح مناسب نہیں۔ یہ رقم بینک ہی میں محفوظ رہ سکتی۔ جس کے لیے آپ کا اکاؤنٹ کھلوانا ضروری ہے۔" ارشاد نے وضاحت کی۔

میں نے اس کے خیال سے اتفاق کیا کیوں کہ وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا، آخری اسی۔ میں نے پوچھا۔ "پھر آپ ہی کوئی مشورہ دیں، کیا کیا جائے؟"

"آپ اگر کہیں تو میں یہاں ایک بینک میں اکاؤنٹ کھلوا سکتا ہوں۔" ارشاد پیشکش کی۔

"وہ کیسے؟" میں نے معلوم کیا۔

اسی لمحے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی اور ارشاد کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"شاید ویٹر ناشتہ لے آیا ہے۔" پروین بولی، پھر بلند آواز میں کہا۔ "دروازہ کھلا ہے، آجاؤ؟"

دروازہ کھول کر اندر آنے والا ایک باوردی ویٹر ہی تھا۔ ناشتہ کرتے ہوئے ار مجھے بتانے لگا۔ "اس شہر میں ہمارا آنا جانا لگا ہی رہتا ہے اس لیے میں نے یہاں بیَ اکاؤنٹ کھلوا رکھا ہے، وہیں میں آپ کا اکاؤنٹ کھلوا دوں گا، وہ بینک یہیں صدر میں۔ ابھی تو خیر بینک کھلنے میں دیر ہے۔"

طے پایا کچھ دیر آرام کر لیا جائے، سو وہ دونوں اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے، و برتن اٹھا لے گیا، ہم نے درمیانی دروازے بند کر لیا۔

"ناہید! اب تک قدرت ہمارا ساتھ دے رہی ہے، پھر بھی ہمیں محتاط و چوکنا چاہئے۔" میں نے ناہید سے اپنے خدشات کا اظہار کر ہی دیا۔ "عموماً دنیا میں اتنے ہم اور پُر خلوص لوگ نہیں ملتے جتنے یہ دونوں میاں بیوی ثابت ہو رہے ہیں۔"

ناہید مجھے تسلی دینے لگی کہ اللہ پر بھروسہ رکھوں، کچھ نہیں ہوگا، پونے نو بجے ارشاد پروین آگئے، ارشاد کے ہاتھ میں ایک بریف کیس نظر آیا جو غالباً اس کے سوٹ کیس میں ارشاد اپنی بیوی سے مخاطب ہوا۔ "پروین! تم ان کے پاس ہی رہنا! ممکن ہے واپسی میں ہو جائے...... بینک سے بھی پہلے مجھے حمزہ خان سے ملنے ڈیفنس جانا ہے۔" پھر وہ مجھ بولا۔ "معاف کیجئے گا شہباز صاحب! مجھے اپنے دوست حمزہ خان کی امانت آج ہی صبح ا پہنچانی ہے اس لیے پہلے ہم وہیں چلیں گے بینک تو ایک بجے تک کھلے گا، آپ نے پرائز

رکھ لیا ہے؟"

"جی ہاں!" میں نے کوٹ کی اندرونی جیب سے پرائز بانڈ نکال کر دکھایا۔ پھر اسے واپس رکھتے ہوئے کہا۔ "میں ذرا واش روم ہو کر ابھی آیا۔"

واش روم میں داخل ہو کر میں نے دروازہ اندر سے بند کیا اور تیزی سے اس کا جائزہ لیا، کچھ ہی دیر میں جب میں واش روم سے نکلا تو میرے اندر پیدا ہونے والا وقتی اضطراب ختم ہو چکا تھا، ناہید کو "خدا حافظ" کہہ کر میں، ارشاد کے ساتھ ہو لیا۔

"اپنے دوست کو فون کر کے میں نے گاڑی بھیجنے کو کہہ دیا تھا۔" ہوٹل سے نکلتے ہوئے ارشاد نے بتایا۔

اس لمحے سفید رنگ کی ایک شیراڈ نے ہارن دیا کار کے جاپانی نوجوان نے ہمارے لیے پچھلا دروازہ کھول دیا۔

"تھینک یو۔" کہتا ہوا ارشاد گاڑی میں بیٹھ گیا، میں نے بھی اس کی تقلید کی، ڈرائیور اپنی سیٹ پر آ بیٹھا اور کار چل دی، سفر شروع ہو گیا۔

کار جب ڈیفنس کے علاقے میں داخل ہوئی تو مجھے یوں لگا جیسے کسی اور ملک میں آ گیا ہوں، میرے ایک سوال کے جواب میں ارشاد نے بتایا کہ یہ علاقہ کروڑ پتی لوگوں کا ہے، میں نے پوچھا۔ "پھر تو آپ کے دوست حمزہ خان بھی کروڑ پتی ہوں گے؟"

"حمزہ خان کو صرف کروڑ پتی کہنا کافی نہیں، وہ اس سے بھی بڑی حیثیت کا مالک ہے۔" ارشاد نے جواب دیا، پھر خود ہی بتانے لگا۔ "حمزہ خان سے میرے تعلقات کی نوعیت کاروباری ہے...... ہم شاید منزل پر پہنچ گئے ہیں۔"

ارشاد کے ان الفاظ کے ساتھ ہی جاپانی ڈرائیور نے کار کو بائیں جانب موڑ کر ایک کوٹھی کے سامنے روک لیا۔ ڈرائیور نے کار کا ہارن بجایا تو ایک مسلح چوکیدار نے آہنی پھاٹک کھول دیا۔ اس کے شانے سے کلاشنکوف لٹک رہی تھی۔ ڈرائیور نے کار کو آگے بڑھایا تو مجھے کوٹھی کی کئی منزلہ عمارت دکھائی دی۔ چوہدری اسلم کی حویلی اس کوٹھی کی گرد بھی نہیں تھی۔

عمارت کے باہر ایک جانب مجھے کئی گاڑیاں کھڑی نظر آئیں۔ ڈرائیور نے انہی کے قریب اپنی کار روک دی، پھر اس نے تیزی سے اتر کر ہمارے لئے کار کا پچھلا دروازہ کھولا۔ اترتے ہوئے ارشاد نے کہا۔ "تھینک یو سوزو" یقیناً وہ ڈرائیور سے واقف تھا۔ مجھے اپنے ساتھ لیے ارشاد آگے بڑھا۔ عمارت کے صدر دروازے پر بھی دو مسلح افراد کھڑے نظر آئے۔ انہوں نے ہمارے لئے دروازہ کھولا تو ہم چھوٹی سی ایک راہداری عبور کر کے ایک

بڑے ہال کمرے میں پہنچ گئے۔ وہ ہال کمرا بہترین سامان آرائش سے سجا ہوا تھا۔ کچھ فاصلے پر اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی محل میں آ گیا ہوں۔ خلاف توقع وہاں کوئی نہیں تھا۔

معاً ایک بھاری گونج دار آواز سن کر میں چونک اٹھا۔ ''ارشاد! دائیں جانب صوفہ سیٹ کی سینٹر ٹیبل پر اپنا بریف کیس رکھ دو اور وہاں پر رکھا ہوا بریف کیس اٹھا لو! اس کے بعد تمہیں کیا کرنا ہے، مجھے شاید یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے!''

میں نے تیزی سے اِدھر اُدھر گھوم کر دیکھا، مگر بولنے والا نظر نہیں آیا، وہ آواز شاید کسی لاؤڈ اسپیکر سے آ رہی تھی۔

''ٹھیک ہے حمزہ خان!'' ارشاد بلند آواز میں بولا۔ ''مگر سوا کروڑ کے پرائز بانڈ میں سے میرا حصہ کتنا ہوگا؟''

یہ سنتے ہی میرے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی، میرا قیاس قطعی درست ثابت ہوا تھا۔

ارشاد نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے، اب اس میں کسی قسم کے شک و شبہے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ ابھی میں یہی سوچ رہا تھا کہ موجودہ حالات میں مجھے کیا قدم اٹھانا چاہیے کہ ایک مرتبہ پھر حمزہ خان کی آواز ہال میں گونجنے لگی۔ وہ ارشاد کے سوال کا جواب دے رہا تھا۔ ''پہلے یہ کنفرم تو ہو جائے۔''

''کنفرمیشن کے بعد میں ففٹی پرسنٹ سے کم نہیں لوں گا حمزہ خان!''

''منظور ہے۔ کل تم اپنے حصے کی رقم آ کر لے جا سکتے ہو۔ پرائز بانڈ کے نمبر تم چاہو تو لکھ لو تاکہ تمہیں بدگمانی نہ ہو۔'' حمزہ خان کی آواز سنائی دی۔

''لکھ لوں گا اور آج ہی خود بھی کنفرم کر لوں گا کہ پرائز بانڈ پر واقعی سوا کروڑ روپے کا پہلا انعام ملا ہے!'' ارشاد یہ کہتے ہی دائیں جانب مڑ گیا۔ آگے قدم بڑھاتے ہوئے ارشاد کی پشت میری طرف تھی۔ بہ ظاہر ہال میں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں اسی لیے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر تیزی سے پلٹا۔ میرے پیروں میں جیسے پر لگ گئے تھے۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس کوٹھی سے نکلنا میرے لیے آسان نہیں ہوگا، پھر بھی میں کوشش تو کر ہی سکتا تھا۔ وقت و حالات سے ناامید ہو کر میں نے شکست قبول کرنا نہیں سیکھا تھا۔ میں راہداری تک پہنچا ہی تھا کہ عقب سے حمزہ خان کا قہقہہ سنا۔

''لوٹ آؤ نوجوان!'' حمزہ خان کی آواز آئی۔ ''میری مرضی کے بغیر تم اس کوٹھی سے نہیں نکل سکو گے۔''

یہ سننے کے باوجود میرے قدم نہیں رکے اور میں بھاگتا ہوا صدر دروازے تک پہنچ گیا۔ میں نے دروازہ کھولنا چاہا مگر ناکام رہا۔ یقیناً دوسری طرف سے دروازہ بند کر لیا گیا تھا۔ اسی لمحے مجھے پیچھے سے ارشاد کی آواز سنائی دی۔ ''واپس آ جاؤ شہباز! جلدی کرو ورنہ میں تمہیں گولی بھی مار سکتا ہوں۔'' میں نے مڑ کر دیکھا۔ ارشاد کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ ریوالور کی نال میری ہی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ واپسی کے سوا کوئی چارہ کار میرے لیے نہیں تھا۔ سو میں نے یہی کیا۔ ارشاد مجھے نشانے پر لیے ہوئے چند قدم پیچھے ہٹ گیا اور بولا۔

''پرائز بانڈ میرے حوالے کر دو!'' اس کا لہجہ اب قطعی بدلا ہوا تھا۔

''پرائز بانڈ میرے پاس نہیں ہے۔ تم چاہو تو میری تلاشی لے سکتے ہو؟'' میں نے پُرسکون آواز میں کہا۔

''کیا بکتے ہو! تم نے چلتے وقت مجھے خود پرائز بانڈ دکھایا تھا!'' وہ کسی درندے کی طرح غرایا۔

''وہ صرف ایک سادہ کاغذ تھا جو اب بھی میرے کوٹ کی اندرونی جیب میں موجود ہے، کہو تو نکال کر دکھاؤں؟...... تم شاید بھول رہے ہو کہ اس وقت میرے اور تمہارے درمیان کچھ فاصلہ تھا۔ اس کے علاوہ تمہیں ایک بات جو ابھی تک میں نے نہیں بتائی، وہ یہ ہے کہ میرے پاس کوئی بھی پرائز بانڈ نہیں۔ میری بیوی ناہید نے شرمندگی سے بچنے کے لیے تمہیں یہ کہانی سنائی تھی اور میں نے بھی اسی خیال کے تحت جھوٹ کی تصدیق کر دی تھی۔''

ارشاد کے چہرے سے تذبذب کا اظہار ہونے لگا۔ پھر اس نے کہا۔ ''لیکن تم تو میرے ساتھ بینک جانے پر تیار ہو گئے تھے!''

''بینک میں داخل ہونے سے پہلے ہی میں حقیقت کا اظہار کر دیتا۔'' میں نے بلاجھجک کہہ دیا۔

اسی وقت حمزہ خان کی آواز ہال میں گونجی۔ ''حیرت ہے ارشاد کہ تم اتنے تجربے کار ہونے کے باوجود اس نوجوان کے ہاتھوں بے وقوف بن گئے! پھر بھی میرا مشورہ ہے کہ تم اس کے بیان کی تصدیق کر لو۔ ذاتی طور پر یہ نوجوان مجھے پسند آیا ہے۔ بلاشبہ یہ بہادر اور ذہین ہے۔ خاص طور پر اس نے گزشتہ رات جس طرح کمال کو زیر کیا، وہ میرے لیے حیرت انگیز امر ہے۔ یہ تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ کمال پر کسی کا ہاتھ ڈالنا کتنا مشکل ہے! کمال ہی کو میں اس کی تلاشی کے لیے بھیج رہا ہوں۔ اگر اس کے پاس پرائز بانڈ نہ ملا تو تم پروین کو فون کرو گے کہ وہ ہوٹل میں موجود اس کے سامان کی تلاشی لے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں

کہ سامان کی تلاشی لینے کے لیے اس کی بیوی کو بے ہوش کرنا پڑے گا۔ اس کے سامان ۔
بھی پرائز بانڈ برآمد نہ ہوا تو پھر اسی کے بیان کو درست ماننا پڑے گا۔ میں ایسی صورت م
اسے اپنے ساتھ کام کرنے کی پیشکش کروں گا۔ میرے لیے یہ کام کا بندہ ثابت ہوسکتا ہے
اس کے ساتھ جو لڑکی ہے، ممکن ہے وہ بھی کام کی نکلے۔''

''مجھے یقین ہے حمزہ خان کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اس کے پاس پرائز بانڈ موج
ہے۔ یا تو پرائز بانڈ اس کے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہے یا پھر ہوٹل میں موجود سامان ۔
برآمد ہوجائے گا۔ یہ ہمیں بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔'' ارشاد نے اپنے الفاظ
زور دے کر کہا۔

''ہمیں نہیں ارشاد بلکہ صرف تمہیں اس نے بے وقوف بنایا ہے۔'' ان الفاظ ۔
ساتھ ہی حمزہ خان کے ہنسنے کی آواز آئی۔ ''تم درست کہہ رہے ہو یا اس نوجوان کا بیان
ہے، ابھی معلوم ہوجائے گا۔ کمال اس کی تلاشی لینے آ رہا ہے۔''

ذرا ہی دیر میں جب میری نگاہ سامنے اٹھی تو میں اچھل پڑا۔ سیڑھیوں سے نیچے اتر
آنے والے دراز قد شخص کو میں نے پہچان لیا۔ اسے یہاں دیکھ کر میں چکرا کے رہ گیا۔
وہی شخص تھا جو گزشتہ رات میرے کمرے میں گھس آیا تھا۔ بے ہوشی کی حالت میں ارشاد ا
کو میرے کمرے سے اٹھوا کر لے گیا تھا۔ یہ معما میری سمجھ میں نہیں آیا۔ حمزہ خان نے اس
نام کمال بتایا تھا وہ مجھے گھورتا ہوا قدم بہ قدم آگے بڑھنے لگا اس کے چہرے سے نفرت ا
غصے کا اظہار ہو رہا تھا۔ غصے اور نفرت کی وجہ گزشتہ رات پیش آنے والا واقعہ ہی ہوسکتا تھ
اس سے پہلے کہ وہ میرے قریب آتا۔ میں نے اپنا کوٹ اتار کر اس کی طرف اچھال دیا۔

''ارشاد کا کہنا ہے کہ پرائز بانڈ اس کوٹ کی اندرونی جیب میں ہے، تم اس کی تلا
لے سکتے ہو؟'' میں نے اسے مخاطب کیا۔

''بکواس مت کرو!'' کمال نے مجھے ڈانٹ دیا۔ ''وہ پرائز بانڈ اگر اسی کوٹ کی ک
جیب میں ہوتا تو تم ہرگز اسے اتار کر نہ پھینک دیتے۔''

''یہ اس طرح دھوکا بھی دے سکتا ہے کمال!'' ارشاد بول اٹھا۔ ''تم کوٹ کی جیبیں
ضرور دیکھو!''

میرا کوٹ کمال کے قدموں میں پڑا تھا وہ کچھ کہے بغیر جھکا اور کوٹ اٹھا کر جیبوں
تلاشی لینے لگا، پھر کوٹ کو اس نے ایک طرف پھینک دیا اور میرے قریب آ کر سخت آواز م
بولا۔ ''اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر کھڑے ہوجاؤ!''

میں نے اس کے کہنے پر عمل کیا، وہ میرے کرتے کی جیبوں کا جائزہ لینے کے بعد
پیچھے ہٹ گیا۔

''اس کے پاس پرائز بانڈ نہیں ہے۔'' کمال نے بلند آواز میں کہا۔

''تو پھر وہ پرائز بانڈ اس کے سامان ہی میں ہوگا'' ارشاد نے رائے زنی کی۔ اس کا
لہجہ حتمی تھا۔

''تم اپنی یہ حسرت بھی پوری کرلو، ارشاد!'' حمزہ خان کی آواز ابھری۔

سامنے ایک سینٹر ٹیبل پر ٹیلی فون سیٹ رکھا تھا۔ ارشاد نے آگے بڑھ کر اس کا ریسیور
اٹھا لیا اور نمبر ڈائل کرنے لگا۔ شاید دوسری جانب سے جلد ہی فون ریسیو کرلیا گیا۔ ارشاد
نے کمرے کا نمبر بتایا۔ ''روم نمبر تھری زیرو سیون پلیز!'' ریوالور اب اس نے اپنے کوٹ کی
جیب میں رکھ لیا تھا چند لمحے بعد ہی ارشاد نے حمزہ خان کی دی ہوئی ہدایت پھر دہرائی۔ اس
ہدایت کے تحت پروین کو میرے سامان کی تلاشی لینی تھی۔ دوسری جانب یقیناً پروین ہی تھی۔
اس نے فون اٹینڈ کیا تھا۔ آخر میں ارشاد بولا، جتنا جلد ممکن ہو رپورٹ دو! میں یہاں حمزہ
خان کی کوٹھی میں ہوں۔ فون نمبر تو معلوم ہے تمہیں؟

''......ٹھیک ہے، یہی نمبر ہے۔ میں تمہارے فون کا انتظار کر رہا ہوں۔ اوکے۔''
ارشاد نے یہ کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔

''اگر اجازت ہو حمزہ خان تو میں اپنا کوٹ اٹھا کر پہن لوں؟'' میں نے کہا۔ یہ بات
میری سمجھ میں آچکی تھی کہ حمزہ خان ہال میں چھپے ہوئے کسی طاقتور مائک کے ذریعے باتیں
سن سکتا ہے اور شاید ہال میں موجود افراد کو کہیں سے دیکھ بھی رہا ہے۔

''ہاں اپنا کوٹ پہن لو اور آرام سے صوفے پر بیٹھ جاؤ'' حمزہ خان کی آواز آئی۔
''میں تمہارے اور ارشاد کے لیے چائے بھجوا رہا ہوں۔ تم سے اب مزید گفتگو اسی وقت ہوگی
جب ہوٹل سے بھی پروین تمہارے بیان کی تصدیق کر دے گی۔''

اس دوران میں کمال وہاں سے جا چکا تھا۔ ہال میں اب میرے اور ارشاد کے سوا
کوئی اور نہیں تھا۔

''آؤ شہباز!'' خلاف توقع ارشاد نے مجھے دوستانہ لہجے میں مخاطب کیا۔ ''یہاں
میرے پاس آ کر بیٹھ جاؤ۔''

میں دوسرے صوفے پر بیٹھتے بیٹھتے رک گیا اور ارشاد کی پیشکش قبول کرلی۔ اس سے
پہلے میں کوٹ اٹھا کر پہن چکا تھا۔

"تمہاری بیوی کو یا تمہیں آخر مجھ سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی کہ تم لوگ کے پاس کوئی انعام یافتہ بانڈ موجود ہے؟" ارشاد نے نرمی سے پوچھا۔

"میں تمہیں اس کا جواب دے تو چکا ہوں۔" میں نے بھی اپنا لہجہ نرم رکھا۔ "ہم شرمندگی سے بچنے کی خاطر ایسا کیا تھا، لیکن تم مجھے دھوکا دے کر یہاں کیوں لے آئے؟"

"کیا اب بھی یہ بتانے کی ضرورت باقی رہ گئی ہے!" وہ مسکرایا۔ "میرا خیال ہے اتنے بھولے نہیں ہو کہ اس کی وجہ نہ سمجھ سکو۔"

"کچھ بھی سہی مگر مجھے تم سے ایسی امید نہیں تھی۔" میری آواز میں شکایت تھی۔

"بھول جاؤ جو کچھ ہوا۔" ارشاد کہنے لگا۔ "تمہیں تو اس پر خوش ہونا چاہئے کہ تم حمزہ خان کو پسند آ گئے ہو۔ حمزہ خان جسے پسند کر لیتا ہے وہ مالا مال ہو جاتا ہے۔ میں اسے تمہاری خوش بختی ہی تصور کر رہا ہوں کہ تمہیں یہ موقع ملا ہے۔"

پھر ایک شخص ٹی ٹرالی لے آیا، وہ چلا گیا تو ہم چائے پینے لگے۔ اسی عرصے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ٹیلی فون سیٹ سامنے ہی رکھا تھا۔ ارشاد نے ہاتھ بڑھ کر ریسیور اٹھا اور "ہیلو ارشاد" کہہ کر دوسری جانب کی بات سننے لگا۔

میں نے اس کے چہرے پر مایوسی کے آثار دیکھے۔ پھر اس نے کہا۔ "ہاں ہاں۔ میں جلد ہی آنے کی کوشش کروں گا۔" یہ کہتے ہی اس نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور مجھ سے مخاطب ہوا۔ "تمہارا بولا ہوا جھوٹ، سچ ہی ثابت ہوا۔ میں چلتا ہوں۔ اب تم جانو اور حمزہ خان جانے۔ اگر تم نے حمزہ خان کی پیشکش قبول کر لی تو آئندہ بھی ملاقات ہوتی رہے گی۔ بہر حال میرا دوستانہ مشورہ تمہارے لئے یہی ہے کہ تم اس موقع کو رائیگاں نہ جانے دو اور اس سے فائدہ ضرور اٹھاؤ!" ارشاد نے یہ کہہ کر اپنے قریب رکھا ہوا بریف کیس اٹھا لیا۔

"ارشاد! اب تمہاری تسلی ہو گئی؟" معاً حمزہ خان کی آواز سنائی دی۔

"ہاں حمزہ خان، میں دھوکا کھا گیا۔" ارشاد نے اعتراف کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"ابھی بیٹھو ارشاد! اس نوجوان کو بھی تم اپنے ساتھ لے کر جانا۔ اچھا ہے کہ تمہارے سامنے ہی اس سے گفتگو ہو جائے۔" حمزہ خان کی آواز آئی۔

"ٹھیک ہے حمزہ خان، میں رک جاتا ہوں۔" ارشاد یہ کہہ کر دوبارہ میرے قریب صوفے پر بیٹھ گیا۔

"نوجوان!" حمزہ خان نے مجھے مخاطب کیا۔ "اب تم خود ہی اپنا تعارف کرا دو۔"

"میرا نام شہباز ہے اور میں سرگودھے کے ایک گاؤں کا رہنے والا ہوں۔" میں نے

کہنا شروع کیا۔ "اپنی بیوی ناہید کو ساتھ لے کر میں روزگار کی تلاش میں یہاں آیا ہوں۔ میں نے سنا تھا کہ یہ شہر بڑا غریب نواز ہے اور یہاں روزگار آسانی سے مل جاتا ہے۔ دسویں جماعت تک میں نے اپنے گاؤں کے اسکول میں تعلیم حاصل کی ہے۔ مجھے ڈرائیونگ بھی آتی ہے ریوالور، رائفل وغیرہ بھی چلانا جانتا ہوں۔ ایک ریوالور بھی میرے پاس ہے اور اس کا لائسنس بھی......"

"بس اتنا تعارف کافی ہے۔" حمزہ خان بول اٹھا، پھر دریافت کیا۔ "اب یہ بتاؤ کیا تم میری ملازمت کرو گے؟"

"مجھے کیا کام کرنا ہو گا جناب؟" میں نے سوال کیا۔

"ہر وہ کام جس کا تمہیں حکم دیا جائے۔ تمہیں اس کا مناسب معاوضہ دیا جائے گا۔" حمزہ خان نے جواب دیا۔

"معاوضہ بھی بتا دیں تو اچھا ہے۔" میں بولا۔

"تمہاری توقع سے کہیں زیادہ معاوضہ ملے گا۔ فی الحال تمہیں پانچ ہزار روپے ماہوار ملیں گے۔ اگر تمہاری کارکردگی بہتر ہوئی تو جلد ہی معاوضہ بڑھا دیا جائے گا۔ تنخواہ کے علاوہ تمہارے قیام کی ذمے داری بھی مجھ پر ہو گی۔ تم ہوٹل میں نہیں رہو گے تم اگر چاہو تو تمہیں ایک مہینے کی پیشگی تنخواہ بھی ادا کی جا سکتی ہے۔" حمزہ خان نے پیشکش کی۔

اب تک مجھے یہ اندازہ تو ہو ہی چکا تھا کہ حمزہ خان کوئی غیر قانونی دھندا کرتا ہے اور مجھ سے بھی وہ ایسا ہی کام لے گا۔ پھر بھی ایک اجنبی شہر میں پاؤں جمانے کی خاطر وقتی طور پر اس کی پیشکش قبول کر لینا مجھے مناسب ہی معلوم ہوا۔ بعد میں جو ہوتا دیکھا جاتا۔ پیسوں کی مجھے کچھ زیادہ ضرورت نہیں تھی۔

"مجھے منظور ہے جناب! میرے پاس اخراجات کے لیے زیادہ رقم نہیں۔ اس وجہ سے آپ مجھے ایک مہینے کی پیشگی رقم دے دیں۔" میں نے مصلحتاً کہہ دیا۔

"ایک بات میں پہلے سے بتا دینا چاہتا ہوں شہباز کہ ہمارے دھندے میں داخل ہونے کا دروازہ تو ہے، واپسی کا راستہ نہیں۔ اگر تم نے کسی بھی مرحلے پر واپسی کا ارادہ کیا تو اپنی موت کی ذمے داری خود تمہیں پر ہو گی۔ غداری یا بے وفائی کی کم سے کم سزا موت ہے۔" حمزہ خان نے بتایا۔

"میں بے وفائی نہیں کروں گا۔" میں نے یقین دلایا۔

"تو پھر کل صبح تم تیار رہنا، سوزو ٹھیک نو بجے تمہیں لینے ہوٹل پہنچ جائے گا اور وہاں

پہنچا دے گا جہاں تم اپنی بیوی کے ساتھ رہو گے۔'' حمزہ خان بولا۔

''یہ شہر میرے لیے قطعی اجنبی ہے۔ میں آپ سے چند روز کی مہلت چاہتا ہوں تا ک
اس شہر کو گھوم پھر کر دیکھ لوں۔'' میں نے کہا۔

''تم اگر یہ نہ بھی کہتے تو مجھے اس کا احساس تھا۔ اس وقت تک تم سے کوئی کام نہیں ل
جائے گا جب تک اس شہر کے راستوں کو اچھی طرح سمجھ نہ لو۔ میرا خیال ہے اس کے لیے
ایک مہینہ کافی رہے گا۔ ٹھیک ہے نا؟'' حمزہ خان نے پوچھا۔

''جی ہاں جناب! اتنا وقت کافی رہے گا۔'' میں نے جواب دیا۔

''تو پھر کل ہی تمہیں ایک کار بھی استعمال کے لیے دے دی جائے گی۔ اس طرح شہ
کو سمجھنے میں اور زیادہ آسانی رہے گی۔ سوزو تمہیں وہ پیٹرول پمپ بھی دکھا دے گا جہاں تم
صرف اپنے دستخط کر کے پیٹرول بھروا سکو گے۔'' حمزہ خان نے بتایا، پھر معلوم کیا۔ ''تمہیں
اور کچھ کہنا یا پتا کرنا ہے؟''

''جی نہیں جناب، مجھے اور کچھ معلوم نہیں کرنا۔'' میں نے جواب دیا۔

''جہاں تم رہو گے، وہاں فون پر رابطہ رکھا جائے گا۔ پھر بھی احتیاطاً تم میرے فون
نمبر لکھ لو۔''

جیب سے قلم اور کاغذ نکال کر میں نے حمزہ خان کے بتائے ہوئے تین ٹیلی فون نمبر لکھ
لئے۔ پھر ذرا ہی دیر میں مجھے کمال دوبارہ آتا دکھائی دیا۔ اس نے مجھے پانچ ہزار روپے اد
کر دیئے۔ اس کے بعد وہ دائیں جانب موجود سینٹر ٹیبل سے بریف کیس اٹھا کر لے گیا۔ یہ
وہی بریف کیس تھا جو ارشاد لے کر آیا تھا۔ ''اب تم ارشاد کے ساتھ واپس جا سکتے ہو
شہباز!'' حمزہ خان نے مجھے جانے کی اجازت دے دی، پھر یہ بھی تاکید کی کہ میں کسی اشد
ضرورت کے بغیر اسے فون نہ کروں۔ ارشاد اٹھا تو میں نے بھی اس کی تقلید میں ایسا ہی کیا
اور ہال کے دروازے کی طرف قدم اٹھانے لگا۔ ابھی ہم دونوں ہال ہی میں تھے کہ حمزہ
خان کی آواز ایک مرتبہ پھر سنائی دی۔ وہ ارشاد سے مخاطب تھا۔ ''کل رات ہوٹل میں جو
واقعہ پیش آیا اس کی وجہ سے شہباز کا ذہن الجھن میں مبتلا ہو گا۔ اب کیوں کہ یہ ہمارا ساتھی
بن چکا ہے اس لیے اسے اصل واقعے سے آگاہ کر دینا۔''

''بہتر ہے حمزہ خان!'' ارشاد نے رکے بغیر چلتے چلتے جواب دیا۔ ہال کمرے کے
دروازے سے گزر کر ہم راہداری میں اور پھر عمارت کے صدر دروازے تک پہنچے۔ اس
مرتبہ صدر دروازہ خود بہ خود کھل گیا۔ مجھے اس پر حیرت تو ہوئی لیکن اس کا اظہار نہیں کیا۔

ں کے سخت حفاظتی انتظامات کو سمجھنا میرے لیے مشکل ہی تھا۔ عمارت سے باہر آ کر ارشاد
ۂ اسی سفید شیراڈ کی طرف قدم اٹھائے جس میں ہم یہاں تک آئے تھے۔ جاپانی ڈرائیور
ز و مجھے کار کے قریب ہی کھڑا دکھائی دیا۔ اس نے ہمارے لیے کار کا پچھلا دروازہ کھول
ا اور ہم اندر بیٹھ گئے۔ کار کا دروازہ بھی سوزو ہی نے بند کیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا پھر
ار کا انجن جاگ اٹھا۔ کوٹھی کے پھاٹک سے کار نکلی ہی تھی کہ ارشاد نے مجھے مخاطب کیا۔
گزشتہ رات کے واقعے سے تم نے خود کیا نتیجہ اخذ کیا۔ شہباز؟''

''یہ کہ کمال تمہارا ہی ساتھی ہے۔'' میں نے بتایا۔

''اس کے علاوہ اور کچھ؟'' ارشاد نے سوال کیا۔

''مناسب یہ ہے ارشاد کہ تم خود ہی سب کچھ بتا دو۔ ظاہر ہے میری قیاس آرائیاں
ں معاملے میں درست ثابت نہیں ہو سکتیں۔''

''اچھا تو پھر سنو!'' ارشاد نے گہرا سانس لیا۔ ''جس کمرے میں کمال سے تمہارا جھگڑا
ہوا، پہلے وہاں میں ہی پروین کے ساتھ ٹھہرا تھا، لیکن دوسرے ہی روز صبح وہ کمرا چھوڑ دیا اور
سامنے والے کمرے میں منتقل ہو گیا۔ مجھے ابھی مزید ایک دن وہیں گزارنا تھا کیوں کہ حمزہ
خان نے مجھے اگلے دن، یعنی آج صبح ملنے کا وقت دیا۔ بارہ نمبر کمرا ابھی تک خالی تھی۔ میں
نے سوچا آئندہ روز صبح ہوتے ہی اس کمرے کو کرائے پر حاصل کر لوں گا لیکن رات کو وہ کمرا
ہوٹل والوں نے تمہیں دے دیا۔ تم یقیناً سوچ رہے ہو گے کہ میں نے پہلے وہ کمرا کیوں
چھوڑا اور پھر دوبارہ اسے کیوں حاصل کرنا چاہتا تھا!...... تو اس کا سبب محض احتیاط تھی۔
میرے پاس ایک قیمتی شے تھی جسے میں نے بارہ نمبر کمرے میں چھپا دیا تھا۔ اس شے کا اپنے
پاس رکھنا میرے لئے خطرناک ثابت ہوتا۔ جب تمہیں وہ کمرا کرائے پر دے دیا گیا تو
مجبوراً حمزہ خان سے رابطہ قائم کرنا پڑا۔ اسے میں نے صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ فون
پر حمزہ خان کو میں نے صرف اتنا ہی بتایا کہ وہ قیمتی شے کمرے میں موجود ایک بیڈ کے اندر
ہے۔ زیادہ تفصیلی گفتگو فون پر ممکن نہیں......''

''ایک منٹ ارشاد!'' میں بول اٹھا۔ ''جہاں تک مجھے یاد ہے میں تقریباً رات کو
ڈیڑھ بجے اس ہوٹل میں پہنچا تھا۔ ظاہر ہے تم اس وقت سو رہے ہو گے، پھر تمہیں یہ کیسے
معلوم ہوا کہ بارہ نمبر کمرے میں کوئی مسافر آ چکا ہے؟''

''رات کو جس ویٹر کی ڈیوٹی ہوتی ہے، اس سے میں نے پہلے ہی کہہ رکھا تھا کہ اگر
بارہ نمبر کمرے میں کوئی مسافر آ جائے تو وہ مجھے آگاہ کر دے۔''

"اچھا! اب میں سمجھ گیا کہ اس کمرے میں میری آمد کا علم تمہیں کیسے ہوا!" میں نے
ارشاد نے اپنی بات جاری رکھی۔ "ویٹر سے اطلاع ملتے ہی میں ہوٹل سے
ریلوے اسٹیشن پہنچ گیا تاکہ حمزہ خان کو فون کر سکوں۔ مجھے کیونکہ اسی ہوٹل میں رہنا تھا
لیے میں نے خود تمہارے سامنے آنے سے گریز کیا۔ حمزہ خان نے مجھے اطمینان دلایا کہ
فکر نہ کروں، وہ اپنے دست راست کمال کو بھیج دے گا۔ اس کے لیے حمزہ خان نے
ساڑھے چار بجے کا وقت دیا۔ کمال کو تمہارے کمرے سے وہ قیمتی شے حاصل کر کے مجھے
آگاہ کرنا تھا۔ مجھے اور پروین کو مجبوراً کمال کی آمد کے انتظار میں جاگنا پڑا۔ اپنے کمرے
کے دروازے کی جھری سے میں نے کمال کو تمہارے کمرے کے دروازے پر دستک د
اور پھر اندر جاتے دیکھا۔ تمہارے کمرے کا دروازہ بند ہوتے ہی میں راہداری میں
جہاں میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ ذرا ہی دیر میں تمہاری بیوی ناہید کی ہلکی سی چیخ سنائی دی
یوں محسوس ہوا جیسے تمہارے اور کمال کے درمیان ٹھن گئی ہو۔ اس کے بعد سناٹا چھا گیا تھا
ارشاد کہتا رہا۔ "مجھے کمال سے زیادہ اس قیمتی شے کی فکر تھی۔ فوری طور پر اس شے کے حصول
کی خاطر میرے ذہن میں ایک تدبیر آئی جس پر عمل کرتے ہوئے پروین اور میں تمہارے
ہمدرد بن گئے۔ بے ہوش کمال کو ہم اس لیے کمرے میں اٹھا لائے کہ اسے ہوش آجا
وہاں سے فرار کرا دیں۔ تمہارا کمرہ درست کرنے کے بہانے پروین وہ قیمتی شے لے
اور پھر باتھ روم جانے کے لیے کہہ کر وہیں رک گئی۔ میں تمہارے کمرے میں آگیا تا
ہماری غیر موجودگی میں وہ قیمتی شے میرے سوٹ کیس کے اندر رکھ دے۔ اسی دوران
کمال کو ہوش آگیا۔ پروین نے آ کر مجھے مطلع کیا تو میں نے اپنے کمرے میں جا کر کمال
رہائی دلائی اور وہ ہوٹل سے فرار ہو گیا پھر تمہیں مزید اعتماد میں لینے کی خاطر میں نے بھی
ہوٹل چھوڑ دیا۔ نئے ہوٹل میں آ کر تمہاری بیوی نے اس طرح پرائز بانڈ کی جھوٹی کہانی
اور تم نے بھی تصدیق کر دی تو مجھے یقین آگیا۔ حمزہ خان کو فون پر میں نے اس سے آگاہ
دیا تو اس نے تمہیں بھی ساتھ لانے کی اجازت دے دی۔ اس طرح میں سوا کروڑ رو
میں سے آدھی رقم حاصل کر لیتا مگر تمہارا جھوٹ کھل گیا۔ بہرحال پھر بھی تم گھاٹے میں نہ
رہے۔ تمہیں پانچ ہزار روپے کی نوکری مل گئی جس میں آئندہ ترقی کے بہت امکانات ہیں
میں اس پر تمہیں دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔" ارشاد یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"ارشاد! تم نے جب مجھے حمزہ خان کے کہنے پر ساری بات تفصیل کے ساتھ بتا
ہے تو پھر ایک ہی بات کیوں چھپا رہے ہو؟" میرا لہجہ معنی خیز تھا۔

"وہ کیا؟" ارشاد نے چونک کر پوچھا۔

"یہ کہ وہ قیمتی شے کیا تھی جو تم نے اس ہوٹل کے کمرہ نمبر بارہ میں چھپائی تھی؟ پھر یہ
کہ قیمتی ہونے کے باوجود تم نے اسے اپنے پاس کیوں نہیں رکھا؟"

میرے سوال کرنے پر ارشاد کہنے لگا۔ "ابھی میں تمہارے ان دونوں سوالوں کا جواب
نہیں دے سکتا۔ شہباز! اب تو تم خود ہی ہمارے ساتھ آگئے ہو، وقت آنے پر ایک دن تمہیں
ساری باتیں خود ہی پتا چل جائیں گی۔ کچھ باتوں کا وقت سے پہلے معلوم ہو جانا کسی بھی طرح
مناسب نہیں ہوتا۔" یہ کہہ کر ارشاد نے گویا مزید کچھ بتانے سے اپنا دامن بچا لیا۔

"اچھا اتنا تو بتا ہی دو کہ حمزہ خان کیا کاروبار کرتا ہے؟" میں سوال کرنے سے باز نہ
آیا۔

"تمہارے اس سوال کا جواب تو حمزہ خان ہی دے سکتا ہے۔"

"کیوں، کیا تمہیں کچھ معلوم نہیں؟" میں اسے کریدنے کی کوشش کرتا رہا۔ اب ہم
دونوں ہی نے ایک دوسرے کو پُرتکلف انداز میں مخاطب کرنا چھوڑ دیا تھا۔

"معلوم تو ہے مگر حمزہ خان کی اجازت کے بغیر کچھ نہیں بتا سکتا۔" ارشاد نے صاف
گوئی سے کام لیا۔

میں سمجھ گیا کہ ارشاد نے جو باتیں خود بتا دی ہیں، ان کے علاوہ کوئی اور بات اس
سے معلوم کر لینا ممکن نہیں، سو خاموش ہو گیا۔

"لسن می سوزو! ٹرن رائٹ۔" ارشاد نے جاپانی ڈرائیور سے دائیں جانب کار
موڑنے کے لیے کہا۔

"یس سر!" کہہ کر سوزو نے ایک چوراہے سے دائیں طرف کی سڑک پر کار موڑ لی۔
تھوڑا فاصلہ طے کر کے ارشاد نے کار کو ایک بینک کے سامنے رکوا لیا، پھر سوزو کو وہیں
سے رخصت کر دیا۔

"کیا تم بھول گئے ارشاد کہ میرے پاس پرائز بانڈ نہیں ہے؟" میں نے اس کے
ساتھ ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے کہا۔

"یاد ہے مجھے، لیکن میں اپنے کام سے بینک آیا ہوں۔"

"کیا خیال ہے ارشاد وقت کے لیے میں بھی کیوں نہ اکاؤنٹ کھول
لوں؟" میں بولا۔

"تمہاری مرضی، کھول لو۔" ارشاد نے جواب دیا۔ "میں تمہارا اکاؤنٹ کھلوا

دیتا ہوں۔"

پھر ارشاد بینک میں داخل ہو گیا اور مجھے ساتھ لئے کیش کاؤنٹر کی طرف بڑھا۔ کاؤنٹ
ے جب ایک کیش سلپ لے کر اس نے بھری تو میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اُ
ے سلپ پر تیس لاکھ روپے کی رقم درج کی تھی۔ کاؤنٹر پر اس نے بریف کیس رکھ کر کھولا
مجھے ایک ایک ہزار روپے کے نوٹوں کی گڈیاں نظر آئیں۔ ارشاد نے نوٹوں کی وہ گڈیا
بریف کیس سے نکال کر کیشئر کے حوالے کر دیں۔ بریف کیس میں نوٹوں کی گڈیوں کے
اور کچھ نہیں تھا۔ وہ ایک ایک لاکھ روپے کی تیس نئی گڈیاں تھیں۔ کیشئر نے صرف گڈیاں گنیں
اور ہر گڈی کے پہلے نوٹ کے ساتھ ہی آخری نوٹ دیکھا، پھر کیش سلپ پر بینک کی مہر لگا ک
دستخط کئے اور ایک رجسٹر میں اندراج کر کے کیش سلپ بینک کے ایک افسر کو بھجوا دیا۔ بینک
افسر نے بھی کیش سلپ پر دستخط کئے اور کیشئر کو بھجوانے کے لیے چپڑاسی کو دے دی۔ کیشئر ۔
سلپ ارشاد کو تھما دی۔ ارشاد نے ایک نگاہ ڈال کر اسے جیب میں رکھ لیا۔

"آؤ شہباز!" اس نے مجھے مخاطب کیا اور دوسرے کاؤنٹر پر آ گیا۔

پھر ارشاد نے اپنے ہی نام تیس لاکھ روپے کا ایک ڈرافٹ بنوایا۔ یہ ڈرافٹ پشاو
کے ایک بینک کے لیے بنوایا گیا تھا اور وہاں سے اسے کیش کرایا جا سکتا تھا۔ ڈرافٹ
ارشاد نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا اور مجھے سے ساتھ آنے کو کہا۔

"تمہارا اکاؤنٹ بھی کھلوائے دیتا ہوں۔" وہ کہنے لگا۔ "ظاہر ہے تم تو سیونگ
اکاؤنٹ ہی کھلواؤ گے۔ اس کے لیے سو روپے بھی کافی ہیں۔ تمہارے پاس ویسے بھی رقم
ہے اس لیے سو روپے ہی سے اکاؤنٹ کھلوانا بہتر رہے گا۔"

اب وہ مجھ ساتھ لیے ایک اور کاؤنٹر تک آ گیا۔ اکاؤنٹ کھلوانے میں کوئی دشوار
نہیں ہوئی۔ اکاؤنٹ اوپننگ فارم اس نے خود ہی بھرا تھا میں نے فارم پر لکھا ہوا پتا پڑھا
چونکا۔ وہ سندھی مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی کا پتا تھا۔ پھر بھی میں نے بینک میں اس سے کچھ نہیں
پوچھا۔ اکاؤنٹ کی چیک بک مجھے مل گئی۔ بینک سے نکل کر ارشاد نے خود ہی مجھے بتایا۔ "فار
میں پتا لکھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ میں نے اسی لیے اپنے ایک دوست کا پتا لکھ دیا ہے۔"

"تم نے ٹھیک کیا۔ مقصد تو اکاؤنٹ کھلوانا تھا، سو کھل گیا۔" میں نے کہا۔

وہ صدر ہی کا علاقہ تھا اس لیے ہم دونوں پیدل ہی ہوٹل کی طرف چل دیئے۔ ارشا
نے مجھے بتایا تھا کہ وہاں سے ہوٹل زیادہ دور نہیں۔ بینک سے ہوٹل تک کا راستہ میں ۔
اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا تا کہ اکیلا بھی وہاں تک پہنچ سکوں۔ ہوٹل تک پہنچتے ہوئے میر۔

ذہن میں ایک ہی سوال گردش کرتا رہا کہ ناہید کو ہوش آ چکا ہو گا یا نہیں؟ اسی کے ساتھ مجھے یہ
خیال بھی آیا کہ پروین نے اسے کس طرح بے ہوش کیا ہو گا؟

ہوٹل کی تیسری منزل پر پہنچ کر ارشاد نے میرے ہی کمرے کے دروازے پر دستک
دی۔ دروازہ کھلنے میں دیر نہیں لگی۔ پروین ہی نے دروازہ کھولا تھا۔ وہ ابھی تک میرے ہی
کمرے میں تھی اندر گھستے ہی میری نظر بیڈ پر پڑی۔ وہاں مجھے ناہید لیٹی ہوئی دکھائی دی۔

"کیا ناہید کو ابھی تک ہوش نہیں آیا؟" میں نے براہِ راست پروین ہی سے سوال
کیا۔ وہ دروازہ بند کر کے پلٹ رہی تھی۔

"سمجھی نہیں میں!" پروین نے حیران ہونے کی بڑی شاندار اداکاری کی۔ "کچھ دیر
کو میں واش روم گئی تھی، واپس آئی تو دیکھا یہ سو رہی ہیں۔ یہ سوچ کر میں نے انہیں نہیں جگایا
کہ گزشتہ رات ان کی نیند پوری نہیں ہوئی تھی۔"

اس پر ارشاد مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔ "پروین ڈارلنگ! اب شہباز سے کوئی بات
چھپانے کی ضرورت نہیں۔ شہباز کو معلوم ہے کہ تمہی نے ناہید کو بے ہوش کیا ہے۔"

"بس یہ بتا دیں کہ ناہید کو بے ہوش کرنے کے لیے آپ نے اس کے سر پر کوئی
ضرب......"

"پروین کو تم اتنا اناڑی کیوں سمجھ رہے ہو شہباز؟" ارشاد نے میری بات کاٹ دی۔
"مجھے یقین ہے پروین نے ہرگز ایسا نہیں کیا ہو گا۔"

پھر خود ہی پروین نے بتا دیا۔ "ایک رومال پر بے ہوشی کی دوا چھڑک کر میں نے
اسے ناہید کی ناک پر رکھ دیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اب انہیں ہوش آنے ہی والا
ہو گا۔" یہ کہہ کر وہ ارشاد سے مخاطب ہوئی۔ "کیا شہباز صاحب اس وقت وہیں موجود تھے
جب تم نے مجھے فون کیا تھا؟"

"ہاں!" ارشاد نے اقرار میں سر ہلایا، پھر اسے آگاہ کر دیا کہ حمزہ خان نے مجھے
ملازم رکھ لیا ہے۔

"مبارک ہو شہباز صاحب!" پروین نے خوشی کا اظہار کیا۔ "پھر تو اب آئندہ بھی
آپ سے ملاقات ہوتی رہے گی۔"

"پروین! کل صبح یہ لوگ ہوٹل چھوڑ دیں گے کیا کہتی ہو، کل ہی ہم بھی پشاور واپس
چلیں؟" ارشاد نے پوچھا۔

"کام تو ہو گیا نا؟" پروین نے دریافت کیا۔

"ہاں! میں نے ڈرافٹ بھی بنوالیا ہے۔" ارشاد نے جواب دیا۔

"تو پھر کل تک رکنے کی بھی کیا ضرورت ہے! آج ہی واپس چلتے ہیں۔" پروی بولی۔

"کسی فلائٹ کے لیے سیٹیں بھی تو ریزرو کرانی پڑیں گی ادھر سے تو ہم بائی ایئر سکتے ہیں آخر اتنی جلدی بھی کیا ہے؟"

اسی لمحے میں نے پروین کو آنکھ سے کچھ اشارہ کرتے ہوئے دیکھا تو چونک اٹھا پھر کہنے لگی۔ "اچھا خیر جیسی تمہاری مرضی! اب چلو بھی اپنے کمرے میں یا یونہی شہباز صاحب کے کمرے میں ڈیرا ڈالے رہو گے۔" یہ کہتے ہوئے وہ کھلے ہوئے درمیانی دروازے کی طرف بڑھی۔

ارشاد بھی اس کے پیچھے پیچھے اپنے کمرے میں چلا گیا، انہوں نے درمیانی دروازہ بند کرلیا تھا، مجھے اسی کا بے چینی سے انتظار تھا۔ میں تیزی کے ساتھ واش روم کی طرف لپکا۔ ارشاد کے ساتھ جانے سے پہلے میں نے خطرہ محسوس کرلیا تھا۔ خطرہ محسوس کرنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ پہلے مجھے بینک لے جانے کے بجائے کہیں اور جا رہا تھا۔ بعد میں حمزہ خان کی کوٹھی پہنچ کر میرا اندازہ درست ہی ثابت ہوا۔ ارشاد کو اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے پرائز بانڈ نکال کر دکھاتے ہی میں نے واش روم کی راہ لی تھی۔ وہیں شیونگ کیبنٹ میں پرائز بانڈ چھپا کر میں باہر آگیا تھا۔ پروین فون پر ارشاد کو بتا ہی چکی تھی کہ اسے پرائز بانڈ نہیں ملا۔ میں اس لیے مطمئن تھا۔ میرے قیاس کے مطابق پروین نے سوٹ کیسوں کی ہی تلاشی لی تھی۔

واش روم میں پہنچ کر میں نے جیسے ہی شیونگ کیبنٹ کا ڈھکنا اٹھایا میرے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔

پرائز بانڈ غائب تھا، مجھے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی کہ وہاں سے پرائز بانڈ کون غائب کرسکتا ہے۔ میرے ذہن نے تیزی سے کڑیاں جوڑ لیں۔ پروین کو فون پر ارشاد سے پتہ چلا کہ اسے میرے سامان میں پرائز بانڈ تلاش کرنا ہے اس سے وہ یہی سمجھی ہو گی کہ میں پرائز بانڈ ساتھ نہیں لے گیا جب میں روانہ ہونے سے پہلے باتھ روم میں گیا تھا تو میری یہ حرکت ارشاد نے نظرانداز کردی تھی۔ پروین کو یقیناً یاد رہی ہوگی کہ روانگی سے قبل میں واش روم گیا تھا۔ ممکن ہے پہلے اس نے سوٹ کیسوں ہی کی تلاشی لی ہو اور ارشاد کو فون کردیا ہو کہ پرائز بانڈ نہیں ملا اس کے بعد اس نے واش روم کا رخ کیا ہو۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ حمزہ خان کو سوا کروڑ روپے میں حصے دار نہ بنانا چاہتی ہو اس نے پہلی ہی کوشش کی میں

واش روم سے پرائز بانڈ برآمد کرلیا ہو۔ جو بھی رہا ہو لیکن یہ طے تھا کہ پرائز بانڈ پروین ہی نے غائب کیا تھا۔ ناہید کو تو وہ یوں بھی بے ہوش کرچکی تھی چند ہی لمحوں میں ایک نتیجے تک پہنچ کر میں واش روم سے باہر آگیا۔

اب مجھے اپنے سوٹ کیس سے ریوالور نکالنا تھا، سوٹ کیس کھولتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اسے پروین نے ہاتھ بھی نہیں لگایا تمام سامان پہلے کی طرح ترتیب سے رکھا تھا۔ میرے حق میں یہ اچھا ہی ہوا تھا کہ اس خوب صورت ناگن نے سوٹ کیس کی تلاشی نہیں لی تھی ورنہ میرا ریوالور بھی شاید مجھے سوٹ کیس میں نہ ملتا۔ اپنے سوٹ کیس سے ریوالور نکال کر میں نے کوٹ کی جیب میں رکھا اور تیزی سے آگے بڑھ کر درمیانی دروازے پر دستک دی، دروازہ فوراً ہی نہیں کھلا اور مجھے کئی بار دستک دینی پڑی جیسے ہی میں نے چٹخنی کھلنے کی آواز سنی میرے اعصاب تن گئے۔ مجھے پہلے ہی اندازہ ہو چکا تھا کہ سیدھی انگلیوں سے گھی نکلنا ممکن نہیں۔ معاملہ چھوٹی موٹی رقم کا نہیں تھا، سوا کروڑ روپے بہت ہوتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے تیزی کے ساتھ اپنے کوٹ کی جیب سے ریوالور نکال لیا۔

دروازہ ارشاد نے کھولا اسی کے ساتھ میرے سارے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ وہ بھی مجھے خالی ہاتھ نظر نہیں آیا اس کے ہاتھ میں بھی ریوالور تھا۔ یوں گویا ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے نشانے پر تھے، کمرے میں مجھے پروین دکھائی نہیں دی۔ میری نظریں ارشاد کے ریوالور پر جمی ہوئی تھیں اس کے ریوالور کی نال پر سائیلنسر چڑھا ہوا تھا اس نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "گولی نہ چلانا شہباز! میں تم سے سودا کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیسا سودا؟" میں نے سخت لہجے میں سوال کیا۔

"وہی سودا جو میں نے حمزہ خان سے کیا تھا۔" ارشاد نے جواب دیا اس کے ساتھ ہی وہ پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔ "ففٹی ففٹی! سوا کروڑ میں سے آدھے تمہارے، آدھے میرے!"

مین اسی لمحے نتائج کی پروا کیے بغیر میں اپنی جگہ سے اچھلا اور "دھپ" کی سی آواز سنائی دی۔ ارشاد نے مجھ پر گولی چلا دی تھی۔ گولی سنسناتی ہوئی میرے کان کے بالکل قریب سے گزر کر سامنے دیوار میں پیوست ہوگئی۔ سائیلنسر کی وجہ سے فائر کی آواز نہیں ہوئی۔ گولی چلنے کے ساتھ ہی میری دائیں ٹانگ نیم دائرے کی صورت میں گھومی اور ارشاد کے دائیں ہاتھ پر پڑی اسے دوسرا فائر کرنے کی مہلت نہیں تھی۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل کر فضا میں بلند ہوا۔

اسے میں نے فرش پر گرنے سے پہلے ہی فضا میں لپک لیا۔ اس کے لیے میں نے اپنا

بایاں ہاتھ استعمال کیا تھا۔ میرے دونوں ہاتھوں میں ریوالور تھے۔ اچھل کر پیچھے
ہوئے میں نے اپنا ریوالور کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔

''پروین کہاں ہے رشاد؟'' میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔ ارشاد کا ریوالور میر
دائیں ہاتھ میں لے لیا تھا۔

''وہ..... وہ واش روم میں ہے۔'' ارشاد نے خوفزدہ آواز میں بتایا۔

''اس سے کہو کہ باہر نکل آئے ورنہ میں تمہیں گولی مار دوں گا!'' میں نے دھمکی
''فائر کی آواز نہیں ہوگی، یہ تم بھی جانتے ہو!''

ارشاد نے فوراً میرے کہنے پر عمل کیا اور پروین کو آواز دی۔ ''باہر آجاؤ! کھیل
گیا ہے پروین!'' اس کے لہجے سے شکست کا اظہار ہو رہا تھا۔

میری نظریں واش روم کے دروازے پر جم گئیں۔ میں نے اس امکان کو نظ
نہیں کیا تھا کہ پروین کے پاس بھی کوئی خطرناک کھلونا ہو سکتا ہے۔ واش روم کا درواز
ہی میں تیزی سے جھکا ورنہ پروین کی چلائی ہوئی گولی مجھے دوسرے جہاں کی سیر کرا
''دھپ'' کی آواز کے ساتھ ہی گولی میرے سر کے صرف چند انچ اوپر سے گزر گئی تھی
میں پہلے ہی سے کسی ایسی صورت حال کے لیے تیار نہ ہوتا تو یقیناً زندہ نہ بچتا۔ پرو
پاس بھی سائیلنسر چڑھا ہوا ریوالور تھا۔ جھکتے ہوئے میں نے پروین کے ریوالور کو نشا
چاہا اور پھر دائیں جانب چھلانگ لگا دی۔ میری پہلی کوشش ناکام ثابت ہوئی۔ میرا نش
ہو گیا تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ میں نے براہِ راست پروین پر گولی چلانے سے گر
تھا۔ اس کے خون سے ہاتھ رنگنا مجھے مقصود نہیں تھا۔ دائیں جانب میرا چھلانگ لگانا ب
سبب نہیں تھا۔ ارشاد اسی طرف کھڑا تھا۔ اسے اپنے ساتھ لیتا ہوا میں فرش پر گرا۔ اس
پروین نے دوسرا فائر کیا، مگر ناکام رہی۔ میں پہلے ہی جست بھر کے اس جگہ سے ہ
تھا۔ فرش پر گرتے ہی میں نے ارشاد کی پشت پر ریوالور کی نال رکھ دی۔

''اپنا ریوالور پھینک دو پروین!'' میں نے تیز اور سخت لہجے میں پروین کو مخاطب
''اگر تم نے ریوالور نہ پھینکا تو میں، ارشاد کے جسم میں گولی اتار دوں گا!''

میرے اور پروین کے درمیان خاصا فاصلہ تھا۔ اب مجھے اس پر یہ برتری بھی
ہو گئی تھی کہ میرے جسم کا بڑا حصہ بیڈ کی آڑ میں تھا۔ اسی وجہ سے اب مجھے پروین کے
دونوں پیر ہی نظر آ رہے تھے۔ پروین نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

''پروین سے کہو کہ ریوالور پھینک دے ورنہ.....'' میں نے اپنا جملہ ادھورا

ریوالور کی نال کا دباؤ ارشاد کی پشت پر ڈالا۔ ارشاد نے میرے کہنے پر فوراً عمل کیا۔ اس نے
پروین سے ریوالور پھینکنے کے لیے کہا تھا۔

میری یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی۔ پروین نے ریوالور پھینک دیا۔ بیڈ سے کچھ فاصلے پر
میں نے ریوالور کو گرتے دیکھا اور ایک دَم اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ پھر میں ایک ہی جست میں
پروین کے پھینکے ہوئے ریوالور تک پہنچ گیا اور اسے اٹھا لیا۔

''اِدھر آؤ پروین، اِدھر!'' میں نے ریوالور کی نال سے ارشاد کی طرف اشارہ کیا۔ وہ
اُٹھ کر کھڑا ہو رہا تھا۔

پروین چل کر آگے آنے لگی تو میں پیچھے ہٹ کر دیوار سے جا لگا۔ چند لمحے بعد میں
پروین، ارشاد کے قریب جا کھڑی ہوئی۔

اب وہ دونوں ہی میرے نشانے پر تھے۔ میں نے پروین سے دریافت کیا۔ ''پرائز
بانڈ کہاں ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم کہ تم کس پرائز بانڈ کے بارے میں پوچھ رہے ہو!'' پروین بلاخوف
بولی۔

''انجان بننے کی کوشش نہ کرو!'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''میں اس پرائز بانڈ کی
بات کر رہا ہوں جو تم نے میرے کمرے کے واش روم سے غائب کیا ہے۔ کیوں چاہتی ہو
کہ میں تم دونوں کو گولی مار دوں! سیدھی طرح پرائز بانڈ میرے حوالے کر دو!''

''مگر شہباز، تم کس پرائز بانڈ کی بات کر رہے ہو؟ تم ہی نے حمزہ خان کی کوٹھی میں کہا
تھا کہ تمہارے پاس کوئی پرائز بانڈ نہیں۔'' ارشاد نے مداخلت کی۔

''ارشاد! مجھے اس پر مجبور نہ کرو کہ میں تمہیں اور پروین کو موت کی نیند سلا دوں۔''
مجھے غصہ آنے لگا۔

''اگر تم نے ہمیں قتل کر دیا تو حمزہ خان تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔'' ارشاد بولا۔
''اس لیے بہتر یہی ہے کہ ہم سے سودا کر لو۔ میں اب پچیس لاکھ روپے لے کے بھی اس
معاملے کو یہیں ختم کرنے پر راضی ہوں۔ بولو تمہیں یہ سودا منظور ہے؟''

''مجھے لگتا ہے ارشاد کہ تم بہت بڑے بے وقوف ہو! کیا تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میں تمہیں قتل
کرنے کے بعد بھی اسی ہوٹل میں رکا رہوں گا! جب تک حمزہ خان کو تمہارے قتل ہونے کا پتا
چلے گا، میں یہ شہر ہی چھوڑ کر جا چکا ہوں گا۔ جلدی بانڈ نکالو ورنہ میری قوت برداشت جواب
دے جائے گی۔'' میں نے ریوالور کی نال سیدھی کر لی۔ ''تم شاید زندہ رہنا نہیں چاہتے۔

ایسا ہے تو پھر یہی سہی!''

ارشاد تقریباً چیخ اٹھا۔''ٹھہرو شہباز! گولی نہ چلانا۔'' یہ کہہ کر پروین سے مخاطب ہوا۔

''پرائز بانڈ شہباز کو دے دو!''

پروین نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر پرائز بانڈ نکال لیا۔ وہ ارشاد سے بولی۔
''جب یہ پرائز بانڈ واپس ہی کرنا ہے تو پھر شہباز سے دشمنی مول لینے کا کیا فائدہ!'' پھر اس نے مجھ سے کہا۔''میں تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتی ہوں شہباز! لے لو یہ پرائز بانڈ۔''

میں محتاط انداز میں آگے بڑھا اور پرائز بانڈ اس کے ہاتھ جھپٹ کر پیچھے ہٹ گیا۔ معاً میرے ذہن میں ایک اور خدشے نے سر ابھارا، میں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ دوپہر کے ایک بجنے میں ابھی بیس منٹ باقی تھے۔ بینک ٹائم ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔

''تم دونوں میرے ساتھ چلو!'' میں نے انہیں مخاطب کیا۔

''مگر کہاں اور کس لیے؟'' ارشاد نے حیرت سے پوچھا۔

''مجھے شک ہے کہ یہ انعام یافتہ بانڈ نہیں ہے۔'' میرے ذہن میں جس خدشے نے سر ابھارا تھا، میں نے اس کا اظہار کر دیا۔''تمہیں میرے ساتھ بینک چلنا پڑے گا۔''

''تمہیں غلط فہمی ہو گئی ہے شہباز!'' پروین نے یقین دہانی کرائی۔''میرے پاس دس ہزار روپے کا کوئی اور پرائز بانڈ کہاں سے آ جاتا!''

''کیوں، کیا تم اس عرصے میں کسی بینک سے پرائز بانڈ خرید کر نہیں لا سکتیں! انعام یافتہ بانڈ کی جگہ دوسرا بانڈ دے کر کیا تم مجھے نہیں بہلا سکتیں!''

''اگر تمہیں یہی شک ہے شہباز تو اس کے لیے بینک جانے کی کیا ضرورت ہے! کسی بھی قریبی بک اسٹال سے چھپا ہوا پمفلٹ ایک روپے میں خریدا جا سکتا ہے۔ چلو میرے ساتھ! اس کی خاطر پروین کو ساتھ لے جانا ضروری نہیں، اسے یہیں رہنے دو۔'' ارشاد نے تجویز پیش کی۔

میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔''نہیں، پروین بھی ہمارے ساتھ چلے گی!'' پھر میری نگاہ پروین کے چہرے پر پڑی، وہ مجھے کسی قدر گھبرائی ہوئی لگی۔

ابھی تک ایک ریوالور میرے ہاتھ میں تھا، پروین کا ریوالور میں نے اپنے کوٹ کی دوسری جیب میں ڈال لیا تھا۔

''جلدی کرو! وقت کم ہے۔'' میں نے ریوالور کی نال کو حرکت دی۔

''پروین! یہ خطرناک حد تک چالاک آدمی ہے۔ ہم اسے دھوکا نہیں دے سکتے۔''

ارشاد نے یہ کہہ کر طویل سانس لیا۔''میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اس جیسے نوجوان کو اپنا دشمن نہیں بنانا چاہیے۔'' اس کے بعد ارشاد نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور مجھ سے بولا۔

''اصل انعام یافتہ بانڈ یہ ہے۔''

ارشاد کے ہاتھ میں مجھے ایک اور پرائز بانڈ نظر آیا، میں نے آگے بڑھ کر وہ بانڈ بھی اس سے لے لیا۔

''اب پہلے والا پرائز بانڈ مجھے واپس کر دو۔'' ارشاد نے کہا۔

''بالکل نہیں، ابھی کچھ پتا نہیں ان دونوں میں سے کون سا بانڈ انعام یافتہ ہے۔ ممکن ہے، یہ دونوں بانڈ انعام یافتہ نہ ہوں۔'' میں بولا۔

''تو پھر کس طرح تمہیں یقین آئے گا؟'' ارشاد نے سوال کیا۔

''تصدیق ہونے کے بعد!'' میں نے اپنے الفاظ پر زور دیا۔''تم دونوں کو اب بھی میرے ساتھ چلنا پڑے گا، ان میں سے جو بانڈ انعام یافتہ نہ ہوا وہ میں تمہیں واپس کر دوں گا، اب دیر نہ کرو! میں تصدیق ہونے تک تم دونوں میں سے کسی کو اپنی نظروں سے اوجھل دیکھنا نہیں چاہتا!''

پھر ان دونوں کو میرا مطالبہ تسلیم کرنا ہی پڑا۔ ان کے ریوالور میں نے گولیاں نکال کر انہیں واپس کر دیے تھے۔ اب صرف میرے ریوالور میں گولیاں تھیں جو میرے کوٹ کی جیب میں تھا۔ دونوں کمروں کو مقفل کر کے ہم لفٹ کی طرف بڑھ گئے، ناہید کو اس وقت تک ہوش نہیں آیا تھا۔

ہوٹل سے نکل کر ہم تیز قدمی کے ساتھ چلتے ہوئے مین روڈ پر آ گئے۔ سامنے ہی سڑک کی دوسری جانب کئی بک اسٹال نظر آ رہے تھے۔ مین روڈ عبور کر کے ہم ایک بک اسٹال تک پہنچ گئے۔ ارشاد نے بک اسٹال سے مطلوبہ پمفلٹ خرید لیا، سب سے اوپر ہی انعام یافتہ بانڈ کے نمبر نمایاں ہندسوں میں چھپے ہوئے تھے۔ ایسا ہی ایک پمفلٹ بہاولپور میں مجھے میرے دوست اور ہم وطن ارشد نے دکھایا تھا۔ وہیں کھڑے کھڑے میں نے پہلے وہ پرائز بانڈ کوٹ کی ایک جیب سے نکالا جو بعد میں مجھے ارشاد نے دیا تھا، ارشاد نے غلط نہیں کہا تھا، انعام یافتہ بانڈ وہی تھا۔ یہ سمجھنا میرے لیے مشکل نہ تھا کہ پروین نے ارشاد کو وہ پرائز بانڈ دیا ہوگا۔ اپنے پاس اس نے نیا خریدا جانے والا پرائز بانڈ مجھے دھوکہ دینے کے لیے رکھا تھا اگر بازی پلٹ بھی جائے یعنی وہ دونوں مغلوب ہو جائیں تو بھی انعام یافتہ بانڈ ان کے پاس رہے۔

دوسرا پرائز بانڈ میں نے اسی وقت ارشاد کو دے دیا اور کہا۔ ''تم چاہو تو میرے ساتھ بینک تک چلو، ابھی وقت ہے۔''

ارشاد راضی ہو گیا۔ پروین کو اس نے ہوٹل بھیج دیا۔ ہم بینک میں اس وقت داخل ہوئے جب پبلک ڈیلنگ ختم ہونے میں پانچ منٹ رہ گئے تھے۔ انعام یافتہ بانڈ میں نے اس لیے اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرانا ضروری سمجھا تھا کہ آئندہ کسی قسم کا خطرہ نہ رہے۔ گزشتہ تلخ تجربات کی روشنی میں اب میں، ارشاد اور پروین پر اعتماد کرنے کو تیار نہیں تھا۔

معلوم ہوا کہ اتنی بڑی رقم فوری طور پر بینک کی اس برانچ سے کیش نہیں مل سکتی۔ اس کے لیے ہمیں اسٹیٹ بینک جانا ہوگا۔

''آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔'' ارشاد بول اٹھا۔ ''ہم تو یہ رقم اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرانا چاہتے ہیں۔''

''ہماری برانچ میں آپ کا اکاؤنٹ ہے؟'' پوچھا گیا۔

''جی ہاں۔ مجھے ذرا ڈپازٹ سلپ دیجئے۔'' ارشاد نے کہا۔

''مجھے دس ہزار روپے بہر حال نکلوانے ہیں۔'' میں بولا اور کوٹ کی اندرونی جیب سے چیک بک نکال لی۔

''چیک کاٹ دیجئے، رقم آپ کو مل جائے گی۔'' جواب ملا۔

''شہباز! تم چیک کاٹو، میں ڈپازٹ سلپ بھرتا ہوں۔'' ارشاد مجھ سے کہنے لگا۔ ''ذرا اپنا اکاؤنٹ نمبر دکھاؤ۔''

میں دس ہزار روپے کا چیک کاٹنے لگا۔ ارشاد نے اکاؤنٹ نمبر دیکھ کر اسے نیچے والی دوسری سلپ پر لکھ لیا۔ میں اس پر چونک اٹھا اور کن انکھیوں سے دیکھا۔ دوسری ڈپازٹ سلپ پر اس نے میرا نام لکھ کر دس ہزار روپے حروف اور ہندسوں میں لکھے تھے۔

''تم ٹوکن لو، میں ابھی آیا۔'' ارشاد یہ کہتے ہی تیزی سے کیش کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا۔

میں نے اسے کوٹ کی جیب سے دس ہزار روپے کا پرائز بانڈ نکال کر کیشئر کو دیتے دیکھا۔ وہ دس ہزار روپے میرے اکاؤنٹ میں جمع کرا رہا تھا۔ اس وقت میں چیک دے کر ٹوکن لے چکا تھا جب ارشاد میرے قریب آ کر بولا۔ ''وہ پرائز بانڈ مجھے دے دو تا کہ اسے تمہارے اکاؤنٹ میں جمع کرا دوں۔'' کچھ کہے بغیر میں نے ایک جھٹکے سے ڈپازٹ سلپ چھین لی۔ اوپر والی سلپ پر سوا کروڑ روپے کی رقم ہی بھری گئی تھی مگر اکاؤنٹ نمبر اور نام

ارشاد کا لکھا ہوا تھا۔ گویا وہ سوا کروڑ روپے میرے نہیں اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرا رہا تھا۔ وہ آخر وقت تک مجھے فریب دینے سے باز نہیں آیا تھا۔ میرے اکاؤنٹ میں دس ہزار روپے اس نے یوں جمع کرائے تھے کہ میرا کاٹا ہوا چیک کیش ہو جائے۔ اس طرح میں مطمئن ہو جاتا۔ اوپر والی سلپ میں نے پھاڑ دی اور پھر کاؤنٹر سے دوسری سلپ لے کر خود بھری۔

کیش کاؤنٹر کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے ارشاد کو بھی میں نے اپنے پیچھے آتے دیکھا۔ اس کے چہرے پر ندامت اور شرمندگی کے آثار تھے۔ میں نے انعام یافتہ بانڈ خود ہی کیشئر کے حوالے کیا اور ڈپازٹ سلپ بھی اس کی طرف بڑھا دی۔ کیشئر نے سلپ ایک طرف رکھ کر ایک ویسا ہی پمفلٹ نکالا جیسا ارشاد نے خریدا تھا۔ اس نے پرائز بانڈ کے نمبر پمفلٹ پر چھپے ہوئے نمبر سے ملائے، پھر ڈپازٹ سلپ پر لکھی رقم کا اندراج ایک رجسٹر پر کیا۔ بینک افسر سے دستخط کرانے کے بعد ڈپازٹ سلپ کا ایک چھوٹا حصہ مہر لگا کے مجھے تھما دیا۔

''دس ہزار روپے کا ایک چیک بھی میں نے کاٹا ہے۔'' میں کیشئر سے مخاطب ہوا۔

''یہ رہا ٹوکن۔''

ذرا ہی دیر میں مجھے دس ہزار روپے مل گئے اور میں انہیں گن کر جیب میں رکھنے لگا۔

بینک سے باہر آتے ہوئے ارشاد مجھ سے بولا۔ ''میں تم سے انتہائی شرمندہ ہوں شہباز! مجھے معاف کر دو۔''

''معاف تو کر دوں گا میں تمہیں لیکن بہ طور جرمانہ دس ہزار روپے واپس نہیں کروں گا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

بینک کے قریب ہی ایک اچھا کافی ہاؤس تھا۔ ارشاد اصرار کر کے مجھے وہاں لے گیا۔ ویٹر کو بلا کر اس نے کافی کا آرڈر دیا۔

ویٹر آرڈر لے کر چلا گیا تو ارشاد نے مجھے مخاطب کیا۔ ''دس ہزار روپے ادا کر کے اگر مجھے تمہاری دوستی حاصل ہو جائے تو یہ سودا مہنگا نہیں۔''

''تم مجھے اپنا دوست کیوں بنانا چاہتے ہو؟'' میں نے اسے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

''اس لیے شہباز کہ آج تک میری نظر سے تم جیسا ذہین، بہادر اور چالاک نوجوان نہیں گزرا۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے آخر وقت تک تمہیں دھوکا دینے کی پوری کوشش کر لی، مگر ناکام رہا۔ تم پہلے آدمی ہو جس نے مجھے شکست فاش دی ہے۔ کیا تم میری طرف دوستی کا ہاتھ نہیں بڑھاؤ گے؟''

"ارشاد! دنیا میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جن سے نہ تو دوستی اچھی ہوتی ہے نہ دشمنی۔" میں نے یہ کہہ کر طویل سانس لیا۔ "تم بھی شاید ایسے ہی لوگوں میں سے ہو۔"

"تم کچھ بھی کہو شہباز، مگر میں تمہیں اپنا دوست بنانے پر فخر محسوس کروں گا۔ اب مجھے یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ تمہیں حمزہ خان کی نوکری نہیں چاہیے تھی۔ اتنا دولت مند ہونے کے باوجود یقیناً تمہیں پانچ ہزار روپے مہینے کی ملازمت حاصل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم نے حمزہ خان کی یہ پیشکش غالباً کسی مصلحت کے تحت قبول کی ہے۔ ممکن ہے تمہیں وقتی طور پر تحفظ کی ضرورت ہو۔" ارشاد نے قیاس آرائی کی۔

میں اس کی بات سن کر صرف مسکرا کے رہ گیا۔ اسی وقت ویٹر کافی رکھ کر چلا گیا۔

کافی پیتے ہوئے بھی ارشاد نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔ "شہباز! اگر تم چاہو تو میں بھی تمہیں تحفظ دلا سکتا ہوں، اس کے ساتھ میں تمہیں اپنا شریک کار بھی بنا سکتا ہوں۔ تم میرے ساتھ پشاور چلو۔ حمزہ خان سے میں اس سلسلے میں آج ہی بات کر سکتا ہوں، لیکن پہلے تمہاری رضامندی ضروری ہے مجھے پورا یقین ہے کہ حمزہ خان میری بات نہیں ٹالے گا۔ بولو شہباز، کیا کہتے ہو؟"

"ظاہر ہے تم مجھے اپنا شریک کار بنا کر کاروبار میں سرمایہ لگانے کو بھی کہو گے!" میں نے اسے معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

"نہیں۔" ارشاد خلاف توقع بولا۔ "تم میرے ورکنگ پارٹنر ہو گے، تمہیں میرے کاروبار میں ایک پیسا بھی نہیں لگانا پڑے گا۔"

"ارشاد! میں یقیناً تمہاری پیشکش قبول کر لیتا مگر معاف کرنا، مجھے تم پر قطعی طور پر اعتماد نہیں رہا، پھر یہ کہ مجھے تمہارے کاروبار کا علم نہیں۔"

"اگر میں تمہیں اپنے کاروبار کے بارے میں بتا دوں، پھر تو تم انکار نہیں کرو گے؟"

"تمہارے سوال کا جواب میں اس وقت دے سکتا ہوں جب مجھے پتا چل جائے کہ تمہارا کاروبار کیا ہے!" میں نے جواب دیا۔

"تو پھر ٹھیک ہے، ہوٹل چل کر تم سے اس موضوع پر گفتگو ہو گی، یہاں بات کرنا مناسب نہیں ہے۔"

کافی پی کر ہم کیفے سے نکل آئے۔ ارشاد ہی نے کافی کے پیسے دیے تھے۔ ہوٹل جاتے ہوئے مجھے راستے میں عورتوں اور مردوں کے ریڈی میڈ کپڑوں کی کئی دکانیں نظر آئیں، ابھی تک مجھے ناہید کے لیے کپڑے خریدنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ گزشتہ رات ہی کو

ہم اس شہر میں آئے تھے۔ ریڈی میڈ کپڑے خریدنے کے لیے ناہید کا ساتھ ہونا ضروری تھا۔ میں نے سوچا، آج ہی ناہید کے لیے کپڑے خرید لوں گا۔

ہوٹل کے آنے کے بعد مجھے ناہید سخت برہم دکھائی دی، اسے ہوش آ چکا تھا۔ پروین میرے ہی کمرے میں تھی۔

ناہید مجھے دیکھتے ہی تیز آواز میں بولی۔ "پروین صاحبہ میری بات کا تو کوئی تسلی بخش جواب نہیں دے سکیں، اب تم ہی ان سے پوچھو کہ انہوں نے میری ناک پر رومال رکھ کر مجھے کیوں بے ہوش کیا تھا؟" ناہید کے لہجے میں بلا کی چبھن تھی۔ پروین اس کے سامنے کسی مجرم کی طرح کھڑی تھی۔

"مجھے معلوم ہے ناہید!" میں نے اسے نرم آواز میں سمجھایا۔ "اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ پروین نے تمہیں کیوں بے ہوش کیا تھا! غصہ تھوک دو، میں تمہیں ساری باتیں بتا دوں گا۔ فی الحال میں تمہارے لیے چائے منگواتا ہوں تاکہ....."

"ہاں۔" پروین بول اٹھی۔ "چائے سے بے ہوشی کی دوا کے اثرات مزید زائل ہو جائیں گے۔" پھر اس نے خود ہی آگے بڑھ کر فون پر روم سروس سے رابطہ قائم کیا اور کمرا نمبر بتا کر چائے لانے کے لیے کہہ دیا۔ اس نے کسی سے پوچھے بغیر ہی چار چائے لانے کا آرڈر دے دیا تھا۔

"ہم لوگ تو ابھی کافی پی کر آ رہے تھے۔" ارشاد نے بتایا۔ "خیر ناہید صاحبہ کا ساتھ دینے کو تھوڑی بہت چائے بھی پی لیں گے۔" اس کا لہجہ خوشامدی تھا۔

میں تو ناہید کے قریب بیڈ پر، پروین اور ارشاد کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"کیا ہوا شہباز، بینک میں اکاؤنٹ کھول کر پرائز بانڈ جمع کرا دیا؟" ناہید نے مجھ سے معلوم کیا۔

"ہاں ناہید!" میں دھیرے سے ہنس دیا۔ "آخر کار میں یہ کارنامہ انجام دینے میں کامیاب ہو ہی گیا۔"

"کارنامہ.....؟ میں سمجھی نہیں۔" ناہید کے چہرے پر الجھن کے آثار نظر آنے لگے۔

"سمجھا دوں گا، فکر نہ کرو۔" میں نے اس وقت دانستہ بات ٹال دی کیوں کہ وہاں پروین اور ارشاد بھی موجود تھے۔

کچھ دیر میں ویٹر ٹرالی لے آیا۔ میں نے صرف آدھا کپ چائے پی۔ چائے پی کر ارشاد اٹھتے ہوئے کہنے لگا۔ "میں اپنے کمرے میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں کیوں کہ ہمارے

درمیان ہونے والی گفتگو ادھوری رہ گئی ہے۔''

''ٹھیک ہے تم لوگ چلو، میں ابھی ذرا دیر بعد آتا ہوں۔''

میرا جواب سن کر پروین اور ارشاد درمیانی دروازے کی طرف بڑھ گئے میں نے اٹھ کر اپنی طرف سے چٹخنی بند کر دی، پھر روم سروس فون کر کے ویٹر کو بلوالیا تاکہ وہ ٹی ٹرالی لے جائے۔ میں دراصل سکون واطمینان اور کسی مداخلت کے بغیر ناہید سے گفتگو کرنا چاہتا تھا۔

ویٹر چلا گیا تو میں نے کمرے کا دروازہ بھی بند کرلیا اور ناہید کے پاس آ بیٹھا۔ موجودہ حالات میں ناہید سے مشورہ کرنا اور اسے اعتماد میں لینا بہت ضرورت تھا۔

''یہ دولت بہت بڑی بلا ہے ناہید!'' میں نے گفتگو شروع کی۔ ''یہ ایک آدمی کو دوسرے آدمی کے خون کا پیاسا بنا دیتی ہے۔''

''کیا ہوا، کیا ہوگیا؟'' ناہید نے گھبرا کر سوال کیا۔

''یہ پوچھو کیا نہیں ہوا! بس یوں سمجھ کر اللہ کی مدد ساتھ تھی ورنہ تو دولت بھی جاتی اور جان بھی!'' میں نے یہ کہہ کر اسے از اول تا آخر ساری باتیں بتا دیں۔

سب کچھ جان کر وقتی طور پر جیسے ناہید کے حواس گم ہو گئے۔ پھر وہ بہ مشکل بولی

''شہباز! تم...... تم نے حمزہ خان کی پیشکش کیوں قبول کر لی؟''

''میں اگر اس کی پیشکش قبول نہ کرتا تو شاید وہ مجھے زندہ نہ چھوڑتا۔ وقتی طور پر میرے پاس کوئی چارہ کار نہیں تھا۔'' میں نے وضاحت کی۔

''تمہاری باتیں سن کر حمزہ خان مجھے کوئی بہت بڑا جرائم پیشہ معلوم ہوتا ہے، شہباز! ہمیں اس کے چکر میں نہیں پھنسنا چاہئے، اس سے قطع نظر ارشاد کی پیشکش قبول کرنے کا سوال ہی نہیں۔ میرا تو مشورہ یہ ہے کہ ہمیں فوری طور پر اس ہوٹل سے فرار ہو جانا چاہئے۔''

''تمہارے خیال میں کیا یہ اتنا آسان ہے؟ کیا ارشاد فوراً حمزہ خان کو اس سے آگاہ نہ کر دے گا؟ معلوم ہے پھر کیا ہوگا؟ ... حمزہ خان کے آدمی پاگل کتوں کی طرح اس شہر کے تمام ہوٹلوں میں ہمیں تلاش کرتے پھریں گے۔ ایسی صورت میں حمزہ خان کو ارشاد یہ بھی بتا دے گا کہ انعام یافتہ بانڈ میرے ہی پاس تھا جسے میں نے واش روم میں چھپا دیا تھا اور اسے سوا کروڑ روپے اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرا چکا ہوں۔''

''تو پھر کیا کیا جائے شہباز؟'' ناہید فکرمند ہوگئی۔ ''ایک عذاب سے ہماری جان نہیں چھٹتی کہ ہم دوسری مصیبت میں پھنس جاتے ہیں۔''

''میرا خیال ہے کہ ہمیں تھوڑے صبر و تحمل سے کام لینا چاہئے۔ کم از کم ایک مہینے تک

حمزہ خان مجھ سے کوئی کام نہیں لے گا۔ اگر ہمیں فرار ہی ہونا ہے تو اس کے لیے ایک مہینہ بہت ہے۔ پھر یہ بات بھی ذہن میں رکھو ناہید کہ اس طرح وقتی طور پر سہی ہمیں بہر حال سکون کا سانس لینے اور آئندہ کے لیے کوئی لائحہ عمل مرتب کرنے کا موقع مل جائے گا۔ مجھے اللہ کی ذات پر پورا بھروسہ ہے کہ اس عرصے میں وہ ہمارے لیے کوئی راہ نکال ہی دے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' ناہید نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ ''تم پہلے اس فریبی ارشاد سے بات کر کے تو اپنی جان چھڑاؤ۔''

''ایک مرتبہ پھر سوچ لو ناہید! میرے خیال میں حمزہ خان کے چنگل سے نکلنا اتنا آسان نہیں ہوگا۔ ارشاد کی پیشکش قبول کر کے حمزہ خان سے تو جان چھوٹ ہی سکتی ہے، پھر ارشاد سے بھی جان چھڑا لوں گا۔'' میں کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

''وہ کیسے؟'' ناہید نے دریافت کیا۔

''ارشاد سے میں ایک روز سوچنے کی مہلت لے لوں گا اور بعد میں اس کی پیشکش رد کر دوں گا، وہ زبردستی تو مجھے اپنے ساتھ پشاور نہیں لے جا سکتا نا!''

''تم سے انکار سن کر بھی تو ارشاد تمہاری طرف سے حمزہ خان کو برگشتہ کر سکتا ہے۔ بات تو وہیں کی وہیں رہے گی شہباز!''

ناہید کی بات میں وزن تھا۔ ارشاد سے یہ بعید نہ ہوتا۔ میں اسی لیے سوچ میں پڑ گیا۔

''پھر تو یہی بہتر معلوم ہوتا ہے ناہید کہ ہمیں سوچنے سمجھنے کے لیے کچھ وقت مل جائے۔ ارشاد کی پیشکش کو میں قبول نہیں کرتا، ٹھیک ہے؟''

''میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا شہباز! تم جو مناسب سمجھو کرو۔''

پھر میں اٹھ کھڑا ہوا اور آگے بڑھ کر درمیانی دروازہ کھول دیا، دوسری طرف سے ارشاد نے چٹخنی نہیں لگائی تھی۔

''آؤ شہباز!'' ارشاد نے مجھ پر نظر پڑتے ہی خوش دلی کا مظاہرہ کیا۔ ''میں تمہارا ہی منتظر تھا... آؤ ادھر بیٹھ کے بات کرتے ہیں، چاہو تو درمیانی دروازہ بھیڑ دو یا بند کر دو تاکہ اطمینان سے گفتگو ہو سکے۔''

''بند ہی کر دیتا ہوں۔'' میں نے درمیانی دروازہ بند کر دیا، کمرے میں مجھے پروین دکھائی نہیں دی۔ ارشاد نے ایک جانب پڑی ہوئی کرسیوں کی سمت اشارہ کیا۔ ہم دونوں آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے تو میں نے ہی بات شروع کی۔ ''ہاں مجھے اب تم اپنے کاروبار کے متعلق بتاؤ۔''

"حیرت ہے شہباز کہ تم جیسا ذہین آدمی میرے ساتھ حمزہ خان کی کوٹھی تک جا کر کچھ نہیں سمجھ سکا۔ تمہارے ہی سامنے تو میں نے ایک بریف کیس میں وہ قیمتی شے حمزہ خا پہنچائی تھی جس کے عوض میں تیس لاکھ روپے کی ادائیگی کی گئی۔ تم نے کوئی اندازہ نہیں لگا ہ قیمتی شے کیا ہو سکتی ہے؟"

"بریف کیس بند تھا تو مجھے کیسے پتا چل جاتا کہ اس کے اندر کیا ہے!" میں جواب دیا۔

"سمجھ گیا کہ تم خود میری زبان سے اعتراف چاہتے ہو۔" ارشاد نے طویل سا یا۔ "خیر مجھے اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔"

اسی وقت واش روم کا دروازہ کھلا، میں نے پروین کو واش روم سے نکلتے دیکھا۔ کھلتے ہوئے گلابی رنگ کی ساڑھی باندھے ہوئی تھی۔ اس کے جسم کی گلابی رنگت ساڑھی کچھ اور بھی غضب ڈھا رہی تھی۔ لمبے سیاہ بال اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ نے کوئی ایسی ہی خوشبو لگائی تھی کہ کمرا کھلتے ہوئے گلابوں کی خوشبو سے مہک اٹھا تھا۔ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ہوئی میرے برابر والی کرسی پر آ بیٹھی۔

ہر حسین عورت کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے حسن کی ستائش کی جائے۔ پروین اس سے مستثنیٰ نہیں تھی مگر میں نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ میری سرد مہری سے یقیناً پرو کی انا کو ٹھیس پہنچی تھی۔ مجھے اس کا چہرہ متغیر دکھائی دیا، یوں جیسے اس کا غرورِ حسن خاک ل گیا ہو، یوں نظر انداز کیے جانا پروین جیسی عورتیں قبول نہیں کرتیں، انہیں اپنے حسن پر ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ پروین اگر مجھے اور کسی فضا میں ملی ہوتی تو شاید میں اس خداداد حسن سے متاثر ہو جاتا، مگر ارشاد جیسے شخص کے ساتھ اس کی موجودگی میرے لیے خیز تھی۔ میرا اندازہ یہ تھا کہ ارشاد کی غیر قانونی سرگرمیوں میں وہ بھی شریک ہے اور یہ ضروری نہیں کہ وہ ارشاد کی بیوی ہو۔

"سنو شہباز!" معاً ارشاد نے پھر بات شروع کی۔ "ہیروں اور سونے سے بھی ز اس ملک میں ایک اور قیمتی شے ہے جسے ہم لوگ سفید دولت کہتے ہیں، یعنی ہیروئن!" یہ ہوئے اس نے میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے مزید بتایا۔ "میرا بھی کاروبار ہے اور خان بھی یہی دھندا کرتا ہے، لیکن اس کے بازو بہت دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کا د یورپی ممالک اور امریکہ تک پھیلا ہوا ہے۔ میں بھی اپنے کاروبار کو وسعت دینے کے انہی خطوط پر عمل کرنا چاہتا ہوں۔ تم میرے ساتھ رہو یا حمزہ خان کی ملازمت کر لو، دھندا

رہے گا۔ ان حالات میں تمہیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ تم کس کے ساتھ زیادہ فائدہ حاصل کر سکتے ہو۔ حمزہ خان محض اپنے دوسرے کارندوں کی طرح تنخواہ دے گا جبکہ میں تمہیں اپنے کاروبار میں آدھے کا حصے دار بنانے کی پیشکش کر رہا ہوں، سوچو شہباز کہ تمہارے لیے کیا بہتر ہے!"

چند لمحے خاموش رہ کر میں کہا۔ "تم خود ہی بتا چکے ہو ارشاد کہ حمزہ خان کا کاروبار تم سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اپنی ذہانت اور کارگردگی کے سبب جلد ہی وہ دن آ جائے گا کہ حمزہ خان بھی مجھے یہی پیشکش کرے گا جو تم نے کی ہے۔"

"یہ صرف تمہارا خواب ہے شہباز! میرے نزدیک یہ ناممکن ہے، پھر بھی اگر تم حمزہ خان ہی کی ملازمت کرنا چاہتے ہو تو اس پر بھی مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میری پیشکش اپنی جگہ برقرار رہے گی۔ تم جب اپنے خواب کی تعبیر ملنے سے قطعی مایوس ہو جاؤ تو مجھے آگاہ کر دینا۔ میں خود حمزہ خان سے بات کر لوں گا۔ اس شہر میں میرا آنا جانا رہے گا۔ میں تم سے ملتا رہوں گا۔ میرے دروازے ہمیشہ تمہارے لیے کھلے رہیں گے۔"

"شکریہ ارشاد!" میں بولا۔ "غالباً تمہیں جو کچھ کہنا تھا، کہہ چکے ہو اور میں اس کا جواب دے چکا ہوں۔"

"تمہارا صاف جواب سننے کے باوجود میں تمہیں کل تک سوچنے کا ایک اور موقع دیتا ہوں۔" ارشاد کہنے لگا۔ "مجھے کل پشاور جانا ہے، لیکن تمہاری خاطر ایک دن اور ابھی رک سکتا ہوں، مجھے معلوم ہے، کل صبح نو بجے تم یہ ہوٹل چھوڑ دو گے۔ مجھے اس سے پہلے ہی تمہارا آخری جواب چاہیے شہباز!"

میں اقرار میں سر ہلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی وقت پروین مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "دوپہر کا کھانا تم اور ناہید ہمارے ساتھ کھا لو نا!"

"تم کھانا منگواؤ، ناہید کو ساتھ لے کر میں ابھی کچھ دیر میں آتا ہوں، پھر مجھے ناہید کو بازار بھی لے جانا ہے۔" میں نے پروین کی بات مان لی۔

"کیوں، کیا ناہید کو شاپنگ کرانی ہے؟" پروین نے سوال کیا، پھر خود ہی بولی۔ "اگر تم کہو تو میں بھی ساتھ چلوں، مجھے بھی کپڑے خریدنے ہیں۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں، تم بھی ہمارے ساتھ چل سکتی ہو۔" میں نے جواب دیا اور درمیانی دروازے کی طرف قدم اٹھانے لگا۔

اس وقت پروین نے ایک شعر پڑھا۔

راہ پر ان کو لگا لائے تو ہیں باتوں میں

اور کھل جائیں گے دوچار ملاقاتوں میں

میں نے سوچا، پروین اگر اسی خوش فہمی میں مبتلا رہنا چاہتی ہے تو رہا کرے، میہ
جاتا ہے۔ درمیانی دروازہ کھول کر میں اپنے کمرے میں آ گیا۔

ناہید نے مجھ سے پوچھا۔ "بات ہوگئی ارشاد سے؟"

"ہاں۔" میں نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بتایا۔ "اس کی پیشکش میں نے رد کر دی۔"

"اچھا کیا۔ کم از کم اس سے تو جان چھوٹی۔" ناہید نے گہرا سانس لیا۔

مختصراً میں نے اسے ارشاد سے ہونے والی گفتگو بتا دی اور پروین کے بارے
بھی کہ وہ مجھے کوئی ٹھیک عورت نہیں لگتی۔

"شہباز! میرا بھی اس کے بارے میں یہی خیال ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے جی
تمہیں رجھانے کی کوشش کر رہی ہو، صحیح کردار کی کوئی عورت ایسی نہیں ہو سکتی۔ اس کے با
مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے۔" ناہید نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

ناہید کو میں نے بتایا کہ شاپنگ کے لیے بازار چلنا ہے اور پروین بھی ہمارے
ہوگی۔

"لگتا ہے وہ تمہارا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔"

"تمہیں مجھ پر اعتماد ہے تو پھر مجھے کیا ڈر! یوں بھی بس کل صبح تک کی تو بات ہے
تو ہم یہ ہوٹل چھوڑ ہی دیں گے؟" میں نے اسے اطمینان دلایا۔

"مجھے تو اب یہ بھی شبہ ہو رہا ہے شہباز کہ وہ ارشاد کی بیوی ہے۔"

"ہاں مجھے بھی یقین نہیں کہ ان دونوں کے درمیان میاں بیوی کا رشتہ ہو۔" میر
اور پھر اسے بتایا۔ "کھانا ہم انہی دونوں کے ساتھ کھائیں گے۔"

"اور شاپنگ؟" ناہید نے سوال کیا۔

"شاپنگ کے لیے کھانے کے بعد چلیں گے۔" میں نے جواب دیا اور اٹھ کھڑا
"چلو۔"

میرے اٹھتے ہی ناہید بھی کھڑی ہوگئی۔ درمیانی دروازہ عبور کے جب ہم د
ارشاد کے کمرے میں پہنچے تو ویٹر میز پر کھانا لگا رہا تھا۔

پروین کے متعلق ناہید کو میں نے جو باتیں بتائی تھیں اور جو خود اس نے محسوس کی
اس کا ردعمل ظاہر ہونے لگا، ناہید نے کھانا کھانے کے دوران میں پروین سے سیدھ
بات نہ کی۔ اس کی باوجود پروین کے رویے میں کوئی فرق نہ آیا۔ غالباً یہ اس کی مجبور

تھی وہ میری طرف سے ابھی پُر امید تھی۔

میرے پاس خریداری کے لیے خاصی رقم تھی۔ پانچ ہزار روپے تو بہ طور پیشگی تنخواہ حمزہ
خان ہی سے ملے تھے۔ ان روپوں کے علاوہ دس ہزار روپے وہ تھے جو آخری داؤ آزمانے
کی خاطر ارشاد نے میرے اکاؤنٹ میں جمع کرا دیے تھے جنہیں میں بینک سے نکلوا چکا تھا۔
اور ایک ہزار سات سو روپے پہلے کی رقم میں سے بچ گئے تھے۔ میں اسی لیے پیسوں کی طرف
سے مطمئن تھا۔

کھانا کھا کر درمیانی دروازے میں، ناہید کو ساتھ لئے اپنے کمرے میں آیا اور اسے
اپنی طرف سے بند کر دیا۔ اب میں نے ریوالور بھی ساتھ لے کر چلنے کی ضرورت محسوس
نہیں کی۔ اسے میں نے واپس اپنے سوٹ کیس میں رکھ دیا اور پھر کمرے سے نکل آیا، جب
میں اپنے کمرے کا دروازہ مقفل کرنے لگا تو پروین بھی برابر والے کمرے سے باہر آ گئی۔ اس
کی کلائی سے ایک خوبصورت ہینڈ پرس لٹک رہا تھا۔ پرس کا رنگ ساڑھی سے میچ کر رہا تھا۔
یقیناً اسے لباس پہننا آتا تھا۔ سر کے کھلے ہوئے بال بھی اس نے سلیقے سے سنوار لئے تھے۔

ہوٹل سے نکل کر بازار میں پہنچتے ہی مجھے معلوم ہوگیا کہ پروین کے لیے وہ علاقہ نیا
نہیں تھا۔ پروین نے ہماری مناسب رہ نمائی کی۔ ناہید کے لیے میں نے اسی کی پسند سے کئی
ساڑھیاں خریدیں اور شلوار سوٹ بھی لیے۔ بہاولپور کی طرح ناہید نے کپڑے خریدتے
ہوئے مہنگے یا سستے کپڑوں کی طرف دھیان نہیں دیا۔ اسے معلوم تھا کہ اب میرے لیے رقم
کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ پروین بھی اپنے لیے کپڑے خریدتی رہی۔ پھر وہ ہمیں ساتھ لیے
ایک ایسی دکان میں داخل ہوگئی جہاں صرف مردانہ ریڈی میڈ کپڑے ملتے تھے۔

دکان میں داخل ہوتے وقت پروین نے ناہید کو مخاطب کیا۔ "اگر تمہیں کوئی اعتراض
نہ ہو تو شہباز کے لیے میں ایک سوٹ خریدنا چاہتی ہوں تاکہ اسے گفٹ دے سکوں، کیا خبر
پھر کب ملاقات ہو اور ہو بھی یا نہیں!"

"ناہید کو اس پر اعتراض ہو نہ ہو، لیکن میں یہ گفٹ لینا پسند نہیں کروں گا۔" میں بول
اٹھا۔

"پلیز شہباز! میری اس معصوم خواہش کو تو نہ ٹھکراؤ۔" پروین کے لہجے میں عاجزی
تھی۔

"میرا خیال ہے شہباز کہ تمہیں پروین کا دل نہیں توڑنا چاہیے۔" خلاف توقع ناہید
نے کہا۔ "اس میں آخر حرج بھی کیا ہے! پروین یہ سوچ کر خوش ہو جائے گی کہ جب تم یہ

سوٹ پہنا کرو گے تو تمہیں پروین کی یاد آجایا کرے گی، مان جاؤ!''

ناہید کے اصرار پر میں مان گیا۔ پروین نے اپنی پسند سے ایک سوٹ میرے خریدا، اس کے ساتھ میچ کرتی ہوئی ٹائی بھی تھی۔ سوٹ کا پیکٹ لے کر محض رسماً میں پروین کا شکریہ ادا کیا اور وہ خوش ہوگئی۔ ہم تینوں کے پاس اب اتنا سامان تھا کہ مزید خرید ممکن نہیں تھی، پھر بھی پروین ایک جیولری شاپ کی طرف بڑھی۔ اس جیولری شاپ میں پر نے سونے کے کئی سیٹ دیکھے اور ناہید کو بھی دکھائے۔ عورتوں کو فطری طور پر زیورات دلچسپی ہوتی ہے۔ ناہید اسی لیے اپنی پسند و ناپسند کا اظہار کرنے لگی۔ ناہید کی پسند سے سو ایک سیٹ پروین نے الگ رکھ دیا، پھر دکاندار سے ویسا ہی ایک اور سیٹ منگوالیا۔

''یہ دونوں سیٹ الگ الگ پیک کر دیں۔'' پروین نے دکاندار سے کہا، پھر اپ پرس کھول کر ہزار ہزار روپے کے نوٹ نکال کر گننے لگی۔

''اگر تمہیں دو سیٹ ہی خریدنے تھے تو مختلف ڈیزائن کے لیتیں۔'' ناہید بولی۔

اس پر پروین صرف مسکرا دی اور دونوں سیٹوں کی قیمت ادا کر کے انہیں کاؤنٹر اٹھا لیا۔ دکان سے باہر آتے ہوئے ان دونوں سیٹوں میں سے ایک پروین نے نا طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میری طرف سے یہ گفٹ تمہارے لیے ہے۔''

''لیکن...... لیکن پروین......''

''میری نظر میں تم دنیا کی وہ خوش قسمت عورت ہو جسے خود پر فخر کرنا چاہئے ک شہباز جیسا وفادار ساتھی ملا ہے۔ یہ تحفہ قبول کر لو ناہید؟ میرے لیے اس سے زیادہ خو کوئی اور بات نہیں کہ جو ہار تمہارے گلے کی زینت بنے گا ویسا ہی ہار میں پہنے ہوں'' پروین کی آواز شدت جذبات سے بوجھل ہوگئی۔

اس مرتبہ میں نے ناہید سے اصرار کیا کہ وہ پروین کا گفٹ قبول کر لے۔ ناہید کو بات ماننی پڑی۔ واپسی میں جوتوں کی ایک دکان دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ ناہید کے صرف ایک جوڑی سینڈل ہیں، وہ بھی پرانے۔ سو وہاں سے کئی جوڑی سینڈل خرید لئے۔ یوں ہم سامان سے لدے ہوئے ہوٹل پہنچے۔

کمرے میں آتے ہی میں نے ناہید سے کہا۔ ''اب تم یہ کپڑے بدل لو۔ کوئی ا ساڑھی باندھ لو تمہارے خالی کان اور خالی گلا بھی اچھا نہیں لگ رہا۔ سونے کے یہ سیٹ پہ لو، کس کام آئے گا!'' سونے کے اس سیٹ میں بندے، ہار، انگوٹھی اور چوڑیاں بھی تھیں۔

''شہباز! مجھے سخت حیرت ہے کہ اس عورت نے مجھے اتنا قیمتی تحفہ کیوں دیا!''

نے اظہار حیرت کیا۔

''اس کی وجہ بتائی تو تھی اس نے! تم نے شاید اس کے الفاظ پر غور نہیں کیا، ایسا ہی دوسرا سیٹ اس نے اپنے لیے بلاوجہ تو نہیں خریدا۔'' میں بولا۔

''عجیب جذباتی عورت ہے!'' ناہید بڑبڑائی اور پھر سامان کے بنڈل کھول کر اس میں سے ساڑھیاں مجھے دکھانے لگی۔ ''کس رنگ کی ساڑھی پہنوں؟''

''یہ گلابی ساڑھی۔'' میں نے ایک ساڑھی اٹھالی۔ اس کا بلاؤز بھی ساتھ ہی تھا اور پیٹی کوٹ بھی!

''اسی رنگ کی ساڑھی تو پروین بھی پہنے ہوئے تھی، بس پھولوں کا فرق ہے۔'' ناہید بولی۔

''فرق تو ہے نا!'' میں مسکرایا۔ ''پھول تو مختلف ہوتے ہیں۔''

''تمہیں یہ ساڑھی پسند ہے تو اسی کو باندھے لیتی ہوں۔'' ناہید یہ کہہ کر واش روم میں چلی گئی۔

جب وہ ساڑھی باندھ کر واش روم سے نکلی تو میری نگاہیں جیسے پلٹنا بھول گئیں۔ ساڑھی میں اس کا حسن نکھر آیا تھا، پھر اس نے سونے کے زیورات بھی پہن لئے اور ساڑھی کی مناسبت سے سرخ رنگ کے سینڈل بھی اپنے گورے گورے نازک پیروں میں ڈال لئے۔

اسے بھی یہ احساس ہوگیا کہ میری نظریں اس کی طرف سے ہٹ نہیں رہیں۔

''یوں اس طرح مجھے کیا دیکھے جا رہے ہو جیسے پہلے کبھی نہ دیکھا ہو۔'' ناہید نے کسی قدر لجا کر کہا۔

''تمہارے سراپا پر جس جگہ نظر پڑتی ہے، جی چاہتا ہے وہیں ساری عمر بسر کر دوں۔'' میری آواز خمار آلود ہوگئی۔

''تم تو شاعری کرنے لگے۔'' وہ دھیرے سے ہنس دی۔

میں نے بہ مشکل اپنے جذبات پر قابو پایا ورنہ کسی ''حسین حادثے'' کے رونما ہونے کے قوی امکانات تھے۔

☆======☆======☆

رات کے کھانے پر ہم پھر یک جا ہوئے تو میں حیرت زدہ رہ گیا، پروین بھی سونے کا وہی سیٹ پہنے ہوئی تھی، گلابی ساڑھی اس کے جسم پر پہلے سے تھی۔ پہلی بار میں نے محسوس کیا کہ ارشاد کی نظریں بھی ناہید پر جمی ہوئی تھیں۔ پروین بلاشبہ حسین تھی، مگر اس کا حسن ناہید

کے سامنے ماند پڑ گیا تھا۔ ارشاد اور پروین ہمارے ہی کمرے میں آ گئے تھے۔ میں نے
سروس کو فون کر کے کھانے کا آرڈر دیا تھا۔

"شکریہ ناہید کہ تم نے میری موجودگی میں سونے کا یہ سیٹ پہن لیا۔ خدا تمہیں نظر
سے بچائے بہت اچھی لگ رہی ہو۔" پروین نے ناہید کو مخاطب کیا۔

"یہ شہباز کی ضد کا نتیجہ ہے ورنہ میں ابھی کپڑے نہ بدلتی۔" ناہید میری طرف ا
کر کے کہنے لگی۔

"اور میری نظر میں یہ سب کمرا نمبر بارہ کا کمال ہے۔" میں ہنس کر بولا۔ "نہ ہم
ٹھہرتے، نہ ارشاد و پروین سے ملاقات ہوتی اور نہ تمہیں یہ گفٹ ملتا۔"

ارشاد نے بھی میری ہنسی کا ساتھ دیا، پھر اسی خوشگوار فضاء میں ہم نے کھانا
ارشاد نے مجھے بتایا کہ اس نے آئندہ روز دوپہر کی ایک فلائٹ سے پشاور کے لیے دو
بک کرالی ہیں۔ ہوٹل میں قیام وطعام کے اخراجات بھی ارشاد نے خود اپنے ذمے لے
اور مجھے بھی اس سے آگاہ کر دیا۔

"اصولاً آدھے اخراجات مجھے برداشت کرنے چاہئیں۔" میں نے کہا۔

"تمہیں معلوم ہے شہباز کہ میں پانچ ہزار روپے پہلے ہی ایڈوانس جمع کرا چکا
ہوٹل کا بل اس سے کم ہوگا۔ میں تم سے اتنی سی رقم لیتے ہوئے اچھا لگوں گا کیا!"

"اچھا تمہیں میری ایک بات تو ماننی ہی پڑے گی۔" میں یہ کہہ کر اٹھا اور سوٹ
میں رکھی ہوئی چیک بک نکال لایا۔

میں نے دس ہزار کا چیک کاٹ کر اسے دیا تو اس نے حیرت سے پوچھا۔ "یہ کیا
"جرمانے کی وہ رقم ہے جو میں نے زبردستی ہضم کرنی چاہی تھی مگر اب ہضم نہ
رہی، اگر تم نے یہ چیک وصول نہ کیا تو میرے ذہن پر ایک بوجھ رہے گا۔"

"اگر ایسی بات ہے تو یہ چیک میں رکھ لیتا ہوں، لیکن اسے کیش نہیں کراؤں گا۔"

"وہ کیوں؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"اسے میں تمہاری دوستی کی نشانی کے طور پر ہمیشہ اپنے پاس رکھوں گا۔" ارشا
جواب دیا۔

مجھے علم تھا کہ ارشاد جیسے شخص کے لیے دس ہزار روپے کی کوئی اہمیت نہیں۔ تقر
صورت حال میری تھی۔ سوا کروڑ روپے کم نہیں ہوتے جو میرے بینک اکاؤنٹ
تھے، پھر مجھے دس ہزار روپے کی معمولی سی رقم کا کیا خیال ہوتا۔

ہمارے کمرے سے جاتے ہوئے ارشاد نے ایک مرتبہ پھر اپنی پیشکش کی یاد دلائی۔

"صبح تمہیں میرا آخری جواب مل جائے گا۔" میں نے یہ کہہ کر بات ٹال دی۔

ارشاد اور پروین چلے گئے تو ناہید کہنے لگی۔ "تم کہو تو کپڑے بدل لوں، اب تو کسی
سے ملنا ہے نہ کہیں جانا ہے۔"

"نہیں۔" میں نے منع کر دیا۔ "تم اس لباس میں بہت اچھی لگ رہی ہو۔ یہی
ساڑھی باندھے سو جاؤ، صبح کوئی اور ساڑھی یا شلوار سوٹ پہن لینا۔"

وہ مان گئی، صبح کیوں کہ ہمیں جلدی اٹھنا تھا اور گزشتہ رات بھی ہم زیادہ دیر نہیں سو
پائے تھے اسی لیے جلد ہی سونے کے لیے لیٹ گئے۔ کمرے میں اب میں نے نیلا ہلکا بلب
جلا دیا تھا۔ بستر پر لیٹتے ہوئے میں نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ ناہید اور میرے درمیان
تھوڑا فاصلہ برقرار رہے۔ میں نے ناہید کی طرف سے کروٹ لے کر آنکھیں موند لیں، پھر
اس کا حسین چہرہ اپنی آنکھوں میں بسائے جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

یہ اسی رات کا واقعہ ہے کہ اچانک سوتے سوتے مجھے کسی کے اپنے قریب آ جانے کا
احساس ہوا۔ سوتے ہوئے جانے کب ناہید نے میری طرف اور میں نے اس کی جانب
کروٹ لے لی تھی۔ مدھم نیلی روشنی میں اس کا چاند چہرہ مجھے بے حد حسین لگا۔ اس کے
بالوں کی ایک لٹ پیشانی پر خزانے کے کسی سانپ کی طرح جیسے پہرا دے رہی تھی۔ میں
عالم وارفتگی میں نہ جانے کب تک اسے دیکھتا رہا۔ قرب کے سبب اس کا دل گویا مجھے اپنے
سینے میں دھڑکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ مجھ پر عجیب سی بے خودی طاری ہونے لگی۔ میں نہ
جانے کس دنیا میں پہنچ گیا۔ اس ان دیکھی دنیا میں رنگ ہی رنگ تھے۔ میرے وجود پر خوشبو
اور رنگوں کی برسات سی ہو رہی تھی کہ اچانک میں چونک اٹھا۔

میری سماعت سے ہلکے سے کھٹکے کی آواز ٹکرائی تھی۔ میں تیزی سے پلٹا تو ساکت رہ
گیا۔ کمرے کا دروازہ کھول کر مجھے کچھ ہیولے اندر آتے دکھائی دیئے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد
تھا کہ میں نے بستر پر لیٹنے سے پہلے خود کار قفل کا بٹن دبا دیا تھا پھر کمرے کا دروازہ کس طرح
کھل گیا؟ میں نے سوچا۔ یوں خاموشی سے رات کے وقت کمرے میں داخل ہونے والے
ظاہر ہے میرے دوست نہیں ہو سکتے۔ اس خیال سے میرے جسم میں خوف کی سرد لہری دوڑ گئی۔

☆======☆======☆

اس منظر کو دیکھ کر خوف کے ساتھ ساتھ میرے اعصاب تن گئے۔ اس کا سبب خطرے
کا شدید احساس ہی تھا۔ مجھے اپنی زندگی سے زیادہ فکر ناہید کی تھی۔ میں اگر اکیلا ہوتا تو یقیناً

اتنا خوفزدہ نہ ہوتا۔ ہلکے نیلے بلب کی روشنی میں مجھے ان کے چہرے تو نظر نہیں آئے لیکن
ضرور دیکھ لیا کہ وہ آگے نہیں بڑھے۔ ان میں سے ایک شخص دراز قد تھا۔ یہ دیکھ کر
چونکا۔ حمزہ خان کے دست راست کمال کا قد بھی لمبا ہی تھا۔ میرے چونک اٹھنے کی وجہ
تھی۔ اس دراز شخص کی جسمانی ساخت بھی مجھے کمال ہی کی طرح لگی۔ وہ تینوں اب کمر
میں داخل ہو کے اندر سے دروازہ بند کر چکے تھے۔

''جلدی کرو! ہمیں اپنا کام کر کے فوراً یہاں سے نکل جانا ہے۔'' دراز قد شخص
سرگوشی ابھری۔ وہ اپنے دونوں ساتھیوں سے مخاطب تھا۔

دراز قد شخص کی سرگوشی سن کر میرا شک یقین میں بدل گیا۔ حمزہ خان کی کوٹھی میں اس
آواز میں نے سنی تھی۔ اس کے علاوہ بھی میں یہ آواز سن چکا تھا۔ یہ اس وقت کی بات تھی
جب وہ کینٹ ریلوے اسٹیشن کے قریب واقع ہوٹل کے کمرے میں زبردستی گھس آیا تھا اور
اس سے بھڑ گیا تھا۔ حمزہ خان کی پیشکش قبول کرنے کے بعد تو اب میں انہی لوگوں کا ساتھ
چکا ہوں، پھر وہ اس طرح میرے کمرے میں کیوں اور کس لیے داخل ہوئے ہیں؟ میر
ذہن میں سوال ابھرا۔ پھر میں نے سوچا، کہیں کمال ذاتی طور پر تو مجھ سے اپنی شکست کا ا
لینے کا ارادہ نہیں رکھتا؟ اس عرصے میں مجھے کمال کا ایک ساتھی واش روم کا دروازہ کھول
آہستگی سے اندر جاتا دکھائی دیا۔ کمال اور اس کا ایک ساتھی باہر ہی کھڑے رہے۔ واش
میں جانے والے نے دروازہ بند کر لیا، میں سمجھ نہ سکا کہ وہ کیوں واش روم میں گیا ہے!

ان میں سے کوئی بھی میرے بیڈ کی طرف نہیں بڑھا تھا۔ میں اس لئے بے حس
حرکت ان کی نقل و حرکت دیکھتا رہا۔ اس سے میں نے یہی اندازہ لگایا کہ وہ شاید مجھے چھ
نہیں چاہتے تھے۔ ذرا ہی دیر میں مجھے ایسی آواز سنائی دی جیسے واش روم کے اندر فلش ٹ
سے پانی بہایا گیا ہو، پانی کے بہنے کی آواز بہت دھیمی تھی۔ عام حالات میں یقیناً میرا دھ
اس طرف نہ جاتا اگر میں سو رہا ہوتا تو بھی اس آواز سے میری آنکھ نہ کھلتی۔

میں حیران تھا کہ آخر وہ شخص واش روم میں کیا کر رہا ہے؟

وہاں کمال کی موجودگی کے سبب اب میرے لیے یہ سمجھنا دشوار نہ رہا کہ وہ لوگ
کمرے میں کیسے گھس آئے! ان جیسے جرائم پیشہ افراد کے لیے کوئی تالا کھول لینا کون
مشکل کام تھا! میں ابھی انہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ واش روم کا دروازہ کھلا اور جو
اندر گیا تھا، باہر نکل آیا، پھر اس نے دھیرے سے دروازہ بند کر دیا، اسی لمحے کمال نے سرگ
کی۔ ''کام ہو گیا؟''

جواب میں واش روم سے نکلنے والے شخص نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

''اب خاموشی سے نکل چلو!'' کمال بہت دھیمی آواز میں بولا۔

پھر میں نے کمال کے دونوں ساتھیوں کو یکے بعد دیگرے کمرے کا دروازہ کھول کر
باہر جاتے دیکھا۔ آخر میں کمال نے آگے قدم بڑھاتے ہوئے ایک مرتبہ مڑ کر بیڈ کی طرف
دیکھا، پھر خودکار قفل کا بٹن دبا کر وہ بھی باہر نکل گیا اور دروازہ بند ہو گیا۔ ان لوگوں کے
جاتے ہی میں اس طرح احتیاط سے اٹھا کہ ناہید جاگ نہ جائے۔ میرے ذہن سے یہ بات
نکل ہی گئی تھی کہ کمرے میں آنے والوں کی نقل و حرکت سے ناہید کی آنکھ بھی کھل سکتی ہے۔
ایسی صورت میں اس نے بھی کمال اور اس کے دونوں ساتھیوں کو دیکھا ہوگا۔

میں بستر سے اٹھنے لگا تو معاً ناہید نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

''تم......تم کہاں جا رہے ہو شہباز؟''

''تو تمہاری آنکھ بھی کھل گئی!'' میں نے کہا۔

''ہاں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''انہیں پہلے میں نے کمرے میں اور......اور پھر
جاتے ہوئے دیکھا تھا، وہ......وہ کون تھے شہباز؟ اور......اور کس لئے آئے تھے؟''

''یہ تو مجھے معلوم ہو چکا ہے ناہید کہ وہ کون تھے! اب صرف یہ پتا لگانا ہے کہ وہ کس
مقصد سے آئے تھے! تم فکر نہ کرو، میں کمرے سے باہر نہیں جا رہا۔'' میں بولا۔

اطمینان دلانے پر ناہید نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ میں بستر سے اتر کر
تیز قدمی سے واش روم کی طرف بڑھا۔ قریب پہنچ کر میں نے واش روم کا دروازہ کھولنے
سے پہلے باہر لگا ہوا سوئچ آن کر دیا۔ واش روم میں روشنی ہو گئی۔ میں دروازہ کھول کر اندر
داخل ہوا اور گہری نظروں سے واش روم کا جائزہ لیا۔ وہاں مجھے بہ ظاہر کوئی تبدیلی نظر نہیں
آئی۔ میں نے شیونگ کیبنٹ بھی کھول کر دیکھا۔ وہ بھی خالی تھا۔ واش روم میں موجود ایک
ایک چیز کو میں اٹھا کر دیکھنے لگا۔ اسی اثناء میں ناہید بھی واش روم کے دروازے پر آ کھڑی
ہوئی، مگر کچھ بولی نہیں اور مجھے تلاشی لیتے ہوئے دیکھنے لگی۔

معاً مجھے فلش ٹینک کا خیال آیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کی ناب اٹھائی تو تیزی سے
پانی بہنے لگا۔ واش روم میں داخل ہونے والے نے بھی یقیناً ایسا ہی کیا تھا، مگر کیوں؟ اس
سوال نے میرے ذہن کو الجھن میں مبتلا کر رکھا تھا۔ فلش ٹینک میں دوبارہ پانی بھرنے کی
دھیمی آواز سنائی دے رہی تھی۔

''شہباز! تم آخر کیا تلاش کر رہے ہو؟'' ناہید آخر بول ہی اٹھی۔

''یہ تو مجھے خود بھی نہیں معلوم۔'' میں نے جواب دیا۔ ''تم اگر جاگ گئی تھیں تو ان میں سے ایک شخص کو واش روم......''

''ہاں دیکھا تھا میں نے۔'' ناہید نے میری بات کاٹ دی، پھر بولی۔ ''اور اس پر مجھے حیرت بھی ہوئی تھی۔''

''وہ بلا سبب تو یہاں نہیں آئے ہوں گے۔ واش روم میں داخل ہونے والا جب باہر آیا تھا تو اس سے کام ہو جانے کے بارے میں پوچھا گیا تھا۔ آخر اس نے یہاں کیا کام انجام دیا تھا۔ میں اسی جستجو میں ہوں۔ جب وہ واش روم میں تھا تو مجھے پانی بہنے کی آواز سنائی دی تھی۔'' میں نے بتایا۔

''لیکن وہ لوگ تھے کون؟ اور تم نے انہیں کس طرح پہچان لیا؟'' ناہید نے پوچھا۔

''وہ حمزہ خان کے آدمی تھے۔'' میں بولا اور پھر ناہید کو کمال کے متعلق بتا دیا۔

حسب توقع ناہید چونک اٹھی پھر کہنے لگی۔ ''مجھے تو یہ کمال ہی کی کوئی سازش معلوم ہوتی ہے تم ان لوگوں کے دھندے سے تو مجھے آگاہ کر ہی چکے ہو فرض کرو کمال تم سے انتقام لینے کی خاطر یہاں ہیروئن چھپا دیتا ہے اور پھر پولیس کو اس کی اطلاع کر دیتا ہے تو ہم پھنس جائیں گے یا نہیں؟''

ناہید کی بات سن کر میں تقریباً اچھل پڑا۔ میرے خیال میں اس نے بالکل صحیح اندازہ لگایا تھا۔ کسی شے کو تلاش کرنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ آدمی اس پر دھیان دے کہ وہ اگر خود کوئی شے چھپانا چاہتا تو کہاں چھپاتا؟ میں نے یہی سوچا اور پھر میری نظریں فلش ٹینک پر جم گئیں۔ واش روم میں اس سے محفوظ جگہ کوئی اور نہیں تھی۔ میں لپک کر اس کے قریب پہنچا، پھر جیسے ہی میں نے اس کا ڈھکنا اٹھایا تیزی سے پانی بہنے لگا، ظاہر ہے ڈھکنے ہی سے ناب بھی منسلک تھی۔ پانی اس لیے بہنے لگا تھا۔ ڈھکنے کو میں نے ذرا سا آڑا کر کے اندر جھانکا تو فلش ٹینک میں مجھے پلاسٹک کی چھوٹی سی ایک تھیلی نظر آ گئی۔ میں نے ہاتھ ڈال کر اسے باہر نکال لیا، پھر ڈھکنا دوبارہ اس کی جگہ رکھ دیا۔ واش روم سے نکل کر میں نے دروازہ بند کیا اور لائٹ بھی بجھا دی۔

''ناہید! ذرا ٹیوب لائٹ جلا دو۔ تمہارا اندازہ مجھے سو فیصد ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ اس تھیلی میں ہیروئن ہی ہو سکتی ہے۔ بہرحال اسے کھول کر دیکھتے ہیں۔''

میرے کہنے پر ناہید نے ٹیوب لائٹ جلا دی۔ اس تھیلی کا وزن آدھا کلو سے کم نہیں ہوگا۔ تھیلی کا منہ پتلی سی ایک ریشمی ڈوری سے باندھا گیا تھا تاکہ اس میں پانی نہ بھرے۔

بڑی مشکل سے میں نے وہ ریشمی ڈوری کھولی۔ کبھی میں نے ہیروئن نہیں دیکھی تھی لیکن سنا ضرور تھا کہ وہ سفید پاؤڈر کی طرح ہوتی ہے۔ اس تھیلی میں سفید پاؤڈر ہی بھرا ہوا تھا۔ اس خطرناک شے سے جان چھڑانے کی سیدھی سیدھی ایک صورت یہ تھی کہ میں اسے کموڈ میں ڈال کر بہا دیتا۔ پلاسٹک کی تھیلی کو بھی جلا کر بہایا جا سکتا تھا۔ اس وقت میری سماعت میں ارشاد کے الفاظ گونجنے لگے۔

''ہیروں اور سونے سے بھی زیادہ اس ملک میں ایک اور قیمتی شے بھی ہے جس ہم لوگ سفید دولت کہتے ہیں، یعنی ہیروئن!''

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اس تھیلی میں موجود ہیروئن کی قیمت کتنی ہوگی! یہ اندازہ کوئی ایسا شخص ہی لگا سکتا تھا جو اس دھندے میں ملوث ہو یا اس کا تعلق اینٹی نارکوٹکس کے سرکاری شعبے سے ہو۔ میں نے سوچا، اس دولت کو ضائع کرنا میرے لیے بہت آسان ہے، لیکن اسے ارشاد کے حوالے کر دوں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ ممکن ہے، وہ اس سلسلے میں مجھے کوئی مناسب مشورہ بھی دے سکے کہ کمال سے میں کس طرح نمٹوں؟ اس کے مشورے کی روشنی میں حمزہ خان سے میں، کمال کی شکایت بھی کر سکتا تھا۔

''تم کیا سوچ رہے ہو شہباز؟'' ناہید نے مجھے مخاطب کیا۔ ''اس مصیبت سے جان چھڑانے کی کوشش کرو!''

''اسی پر غور کر رہا ہوں۔'' میں نے یہ کہتے ہوئے وال کلاک کی طرف نگاہ اٹھائی۔ رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔ اس دوران میں جو باتیں میں نے سوچی تھیں، ان سے ناہید کو بھی آگاہ کر دیا اور بولا۔ ''میرا خیال ہے ناہید کہ ارشاد مجھ سے زیادہ ان لوگوں کو جانتا ہے۔'' میں نے تیزی سے کہا۔

میں یہ کہتا ہوا بہ عجلت درمیانی دروازے کی طرف بڑھا اور اس کی چٹخنی کھول کر دستک دینے لگا۔ تھیلی میرے ہاتھ میں تھی۔ کئی بار دستک دینے پر دوسری طرف سے چٹخنی کھولی گئی، دروازہ کھولنے والی پردین تھی۔

''ارشاد کو جگا دو! مجھے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔'' میں نے پردین سے کہا۔

''اندر آ جاؤ!'' وہ مڑتے ہوئے بولی اور پھر کمرے میں ٹیوب لائٹ جلا دی۔

ارشاد نیم غنودگی کے عالم میں تھا، وہ بھی اٹھ کر بیٹھ گیا، میں نے بڑی تیزی کے ساتھ اسے پوری روداد سنا دی۔

''تم غلط سمجھ رہے ہو، یہ کام کمال کا نہیں ہو سکتا۔'' اس نے پُر یقین لہجے میں کہا۔

"لیکن میں نے تو خود اسے دیکھا ہے اور اس کی آواز سنی ہے جیسا کہ میں تمہیں بتا چکا ہوں۔" میں اپنی بات پر زور دے کر بولا۔

"میں نے تمہاری یہ بات ماننے سے انکار تو نہیں کیا، میں دراصل تمہیں یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ حمزہ خان کی اجازت کے بغیر کمال اتنا بڑا قدم نہیں اٹھا سکتا۔"

"مگر حمزہ خان ایسا کیوں کرنے لگا؟" میں نے سوال کیا۔ "میں تو اس کی پیشکش بھی قبول کر چکا ہوں۔"

"تم حمزہ خان کو نہیں جانتے۔ وہ کبھی اپنے کسی آدمی کو بے نکیل نہیں چھوڑتا، وہ تمہیں خود ہی پکڑوا کر چھڑا لیتا، اب کچھ آیا تمہاری سمجھ میں! اس کارروائی کا مقصد محض یہ ہے کہ تمہارا نام پولیس کے ریکارڈ پر آجائے اور تم کبھی آئندہ اس سے بغاوت کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہ سکو۔" ارشاد نے وضاحت کی۔

"پھر اب تمہارا کیا مشورہ ہے، مجھے کیا کرنا چاہئے؟" میں نے پوچھا۔

"میں کیوں کہ تمہیں دوست کہہ چکا ہوں اس لیے کوئی غلط مشورہ نہیں دوں گا۔ میں چاہوں تو خود بھی تم سے اس مال کا سودا کر سکتا ہوں، لیکن میری نظر میں اس سے بہتر ایک اور صورت ہے۔ اس طرح ابتداء ہی سے تم حمزہ خان کی نظر میں چڑھ جاؤ گے اور اس کا اعتماد حاصل کر لو گے، لاؤ فی الحال یہ تھیلی مجھے دے دو۔"

میں نے اسے تھیلی دے دی، تھیلی سے تھوڑا سا پاؤڈر نکال کر ارشاد نے دیکھا، پھر اسے واپس تھیلی میں ڈال دیا۔

"پروین! اسے احتیاط سے میرے سوٹ کیس میں رکھ دو! یہ شہباز کی امانت ہے۔" ارشاد نے وہ تھیلی پروین کی طرف بڑھا دی، پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "اب تم میری بات پوری توجہ سے سنو! تمہیں اسی پر عمل کرنا ہے جو میں سمجھا رہا ہوں۔"

پھر ارشاد نے مجھ سے جو کچھ کہا اسے میں نے غور سے سنا، باقی تو ٹھیک تھا مگر ایک بات مجھے کھٹک رہی تھی۔ میں بے گناہ ہونے کے باوجود پولیس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کی وجہ ناہید تھی۔ پولیس مجھ پر یہ الزام بھی لگا سکتی تھی کہ میں اسے گاؤں سے بھگا کر لایا ہوں اور وہ میری بیوی نہیں ہے۔ اسی کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے ارشاد سے کہا۔ "اس علاقے میں اور ہوٹل بھی تو ہوں گے، ہم ایسا کیوں نہ کریں کہ یہ ہوٹل ہی چھوڑ دیں؟"

"اس کی کیا ضرورت ہے؟ پولیس کو جب تمہارے کمرے سے قابل اعتراض چیز ملے گی ہی نہیں تو پھر ہوٹل چھوڑنے کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی، اس کے علاوہ یہ کہ کل صبح نو

بجے حمزہ خان کا ڈرائیور سوز و بھی تمہیں یہاں لینے آئے گا۔" ارشاد بولا۔

"تمہارے کہنے کے مطابق کل صبح سات بجے حمزہ خان سے مجھے فون پر رابطہ قائم کرنا ہی ہے، میں کہہ سکتا ہوں اس سے کہ وہ اب کہاں گاڑی بھیجے!"

"ہاں یہ بھی ممکن تو ہے، میرا خیال یہ ہے کہ تم کسی سبب پولیس کے سامنے آنا نہیں چاہتے۔" ارشاد نے قیاس آرائی کی۔

"چلو ایسا ہی سمجھ لو۔" میں نے کہہ دیا۔

"تو پھر میں کپڑے بدل لوں، اتنے میں تم بھی تیار ہو جاؤ۔" ارشاد یہ کہتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ "کاؤنٹر پر فون کر کے بتا دینا تم یہ ہوٹل چھوڑ رہے ہو۔"

میں تیزی سے درمیانی دروازہ عبور کر کے اپنے کمرے میں آیا اور جلدی جلدی مختصراً ناہید کو اپنے ارادے سے آگاہ کر دیا۔ ناہید کو میں نے ہوٹل چھوڑنے کی وجہ بھی بتا دی تھی۔ اس نے میرے خیال سے اتفاق کیا تھا۔ ساڑھی پہن کر سونے کی وجہ سے ناہید کو بھی لباس تبدیل کرنا پڑا، پھر بھی اس نے دیر نہیں لگائی۔ درمیانی دروازہ اب تک کھلا ہوا تھا۔ ارشاد بھی کپڑے بدل کر آ گیا تو اس نے درمیانی دروازہ بند کر دیا۔ میں نے اس عرصے میں فون کر کے کاؤنٹر پر بتا دیا کہ ہوٹل چھوڑ رہا ہوں، جواب میں کہا گیا تھا کہ جب آپ کہیں گے پورٹر کو بھیج دیا جائے گا۔ اب اتنا وقت نہیں تھا کہ پورٹر کی آمد کا انتظار کیا جاتا۔ میں اور ناہید دونوں ہی تیار تھے۔

"شہباز! تم یہ ہوٹل چھوڑ ہی رہے ہو تو اپنی امانت بھی لیتے جاؤ۔" ارشاد بولا۔

"نہیں، وہ میں تم سے کل صبح ہی لوں گا۔" میں نے کہا۔ "صبح تمہیں جواب بھی تو دینا ہے نا!" یہ کہہ کر میں آگے بڑھا اور دونوں سوٹ کیس اٹھا لیے۔

"لاؤ ایک سوٹ کیس مجھے دے دو!" ارشاد نے قریب آ کر ایک سوٹ کیس میرے ہاتھ سے لے لیا اور بولا۔ "پورٹر کو بلوا لیتے تو اچھا تھا۔"

"میرا مقصد یہ تھا کہ ہم جلد از جلد یہ ہوٹل چھوڑ....." میری بات ادھوری ہی رہ گئی میں تقریباً اچھل پڑا، کمرے کے دروازے پر کوئی دستک دے رہا تھا۔

"اس طرح غیر مہذب انداز میں پولیس والے ہی دستک دے سکتے ہیں۔" ارشاد نے دھیمی آواز میں مجھ سے کہا۔ "پھر بھی گھبرانے کی ضرورت نہیں، سوٹ کیس رکھ دو۔" اس وقت ایک خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں کوندا اور اس پر میں نے فوراً عمل کیا۔

"ناہید! تم درمیانی دروازہ کھول کر پروین کے پاس چلی جاؤ۔ دوسری طرف سے

چٹخنی لگا لینا۔'' میں نے ناہید کو مخاطب کیا اور پھر بلند آواز میں پوچھا۔'' کون ہے؟''

''پولیس'' جواب ملا۔'' دروازہ کھولو!''

اس دوران میں ناہید دروازہ کھول کر دوسرے کمرے میں جا چکی تھی۔ ادھر میں کمرے کا دروازہ کھولنے آگے بڑھا ادھر درمیانی دروازہ دوسری طرف سے بند کر لیا گیا۔ ارشاد نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس طرف سے بھی درمیانی دروازے کی چٹخنی لگا دی۔ مجھے یہ خیال ہی نہیں رہا تھا۔

کمرے کا دروازہ کھولتے ہی مجھے چار پولیس والے نظر آئے۔ ان میں ایک سب انسپکٹر اور تین سپاہی تھے۔ وہ سبھی مسلح دکھائی دیئے۔ سب انسپکٹر کے ہاتھ میں ریوالور تھا چاروں پولیس والے بغیر اجازت ہی کمرے میں گھس آئے۔

''ہمیں تمہارے کمرے کی تلاشی لینی ہے۔'' سب انسپکٹر نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

''ضرور لیجئے۔'' میں پُرسکون آواز میں بولا۔

''ہاتھ اوپر اٹھا دو۔'' سب انسپکٹر نے گویا مجھے حکم دیا۔

میں نے ہاتھ اٹھانے میں دیر نہیں کی۔ سب انسپکٹر کے اشارے پر ایک سپاہی نے میری تلاشی لی پھر وہ سب انسپکٹر کو بتانے لگا۔'' اسلحہ نہیں ہے سر!''

ارشاد سامنے کچھ دور آرام سے ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ سب انسپکٹر کے حکم پر اس کی جامہ تلاشی بھی لی گئی۔

''سر! آپ ہمیں بھی کچھ بتائیں گے کہ یہ کیا معاملہ ہے؟'' ارشاد نے نرم لہجے میں سب انسپکٹر سے پوچھا۔

''یہ تمہیں ابھی معلوم ہو جائے گا۔'' سب انسپکٹر نے سخت آواز میں جواب دیا، پھر مجھ سے بولا۔'' تم بھی ادھر کرسی پر جا کر بیٹھو۔''

میں آگے بڑھ کر ارشاد کے قریب ہی ایک کرسی پر جا بیٹھا۔ اس اثناء میں سب انسپکٹر اپنے ایک سپاہی کو لے کر واش روم کے اندر گھس گیا۔ اس وقت مجھے ارشاد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نظر آئی۔ واش روم کا دروازہ سب انسپکٹر نے کھلا ہی رہنے دیا تھا۔ ذرا ہی دیر میں فلش ٹینک کا ڈھکنا اٹھائے جانے اور پانی بہنے کی آواز آئی۔ وہاں اب کچھ ہوتا تو سب انسپکٹر کو ملتا۔ مجھے یہ خوبی معلوم تھا کہ اسے کس ''قیمتی شے'' کی تلاش تھی! نتیجہ یہ کہ وہ جھنجھلایا ہوا سا واش روم سے باہر نکل آیا۔ غالباً اسی جھنجھلاہٹ میں اس نے دونوں سوٹ کیس کھول کر ان کا سارا اِدھر اُدھر کر دیا۔ وہ یقیناً کوئی بے وقوف آدمی ہی تھا ورنہ ایک سوٹ کیس میں م

ردانہ کپڑے نہ دیکھ کر کوئی سوال ضرور کرتا۔ ممکن ہے، اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ اسے ہیروئن سے بھری ہوئی ایک تھیلی کی تلاش تھی۔ اس کی ساری توجہ تھیلی ڈھونڈنے پر مرکوز تھی جو گویا اطلاع کے مطابق اسے فلش ٹینک میں نہیں مل سکی تھی۔ میرے سوٹ کیس سے البتہ اس نے ریوالور ضرور ''برآمد'' کر لیا تھا۔

جب سب انسپکٹر کو دونوں سوٹ کیسوں میں کوئی اور قابل اعتراض چیز نہیں ملی تو سیدھا کھڑا ہو گیا۔

''تمہارے سوٹ کیس سے یہ ریوالور برآمد ہوا ہے۔'' سب انسپکٹر اس طرح بولا جیسے ریوالور رکھنا کوئی انتہائی سنگین جرم ہے۔

''مجھے معلوم ہے جناب! آپ نے میرے ہی سامنے اسے سوٹ کیس سے نکالا ہے۔'' میں نے کہا۔

''لیکن شاید تمہیں یہ معلوم نہیں ہو گا کہ غیر قانونی اسلحہ رکھنے کے جرم میں تم کو گرفتار بھی کیا جا سکتا ہے!'' وہ جیسے غرایا۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں، لیکن میرے پاس ریوالور کا لائسنس موجود ہے۔'' میں نرمی سے بولا۔

''کیا؟'' سب انسپکٹر نے غیر یقینی انداز میں میری طرف دیکھا۔

''اگر آپ اجازت دیں تو میں سوٹ کیس کی جیب سے لائسنس نکال کر دکھا دوں!''

''دکھاؤ!'' وہ پھاڑ کھانے والی آواز میں کہنے لگا۔

ریوالور کا اور ڈرائیور لائسنس دونوں ہی سوٹ کیس کی جیب میں تھے۔ سب انسپکٹر نے انہیں نکال کر نہیں پھینکا تھا۔

میں نے ریوالور کا لائسنس سوٹ کیس سے نکال کر سب انسپکٹر کو تھما دیا۔ اس کی یہ ساری حرکتیں کسی کھسیانی بلی کی طرح تھیں ورنہ تو مجھے اس کی آمد کا اصل مقصد معلوم تھا جس میں اسے ناکامی ہوئی تھی، لائسنس دیکھ کر اس نے مجھے واپس کر دیا، پھر ریوالور بھی میرے کپڑوں کے ڈھیر میں پھینکنے کے بعد وہ سپاہیوں سے مخاطب ہوا۔'' چلو!''

سپاہی فوراً ہی۔'' یس سر!'' کہہ کر سب انسپکٹر کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھے۔ سب انسپکٹر پہلے ہی اپنا ریوالور ہولسٹر میں رکھ چکا تھا۔

''ٹھہریئے جناب!'' معاً خلاف توقع ارشاد نے سب انسپکٹر کو مخاطب کیا۔

''کیا بات ہے؟'' سب انسپکٹر کے لہجے میں اب بھی سختی تھی۔ وہ چلتے چلتے رک کر مڑا تھا۔

"مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے، مگر اکیلے میں۔" ارشاد نے جواب
چند لمحے کو سب انسپکٹر کے چہرے پر تذبذب کے آثار نظر آئے۔ سپاہی بھی آ
بڑھتے بڑھتے رک گئے تھے۔

"تم نیچے چلو، میں ابھی آتا ہوں۔" سب انسپکٹر نے سپاہیوں سے کہا۔
سپاہی چلے گئے تو سب انسپکٹر ہماری طرف بڑھ آیا، اس کے چہرے پر اب بھی
برقرار تھا۔

"تشریف رکھئے جناب!" ارشاد نے اپنے سامنے والی خالی کرسی کی طرف اشارہ کیا
سب انسپکٹر کرسی پر بیٹھتے ہی بولا۔ "جو کچھ کہنا ہے جلدی کہو، میرے پاس فالتو و
نہیں ہے۔"

"لیجیے عرض کرتا ہوں۔" ارشاد نے یہ کہتے ہوئے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈ
کر ہزار روپے کا ایک نوٹ نکالا اور سب انسپکٹر کی طرف بڑھا دیا۔ "جناب! ہماری طر
سے یہ حقیر سا نذرانہ قبول کر لیجیے اس لیے کہ آپ کو ایک غلط اطلاع ملنے پر ناحق اتنی را
گئے یہاں آنے کی زحمت اٹھانی پڑی۔"

سب انسپکٹر نے حیرت سے ارشاد کی طرف دیکھا، مگر ہزار روپے کا نوٹ لے کر ا
جیب میں رکھ لیا اور بولا۔ "تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں نے یہ کارروائی کوئی اطلاع ملنے ہی پر
ہے؟" اس کا یہ سوال بھی احمقانہ ہی تھا۔

"ظاہر ہے کسی نے غلط اطلاع نہ دی ہوتی تو آپ یہاں کیوں آتے!" ارشاد
پُرسکون آواز میں کہا۔ "میں آپ سے صرف اتنا فیور چاہتا ہوں کہ اگر وہ شخص اب ا
کارروائی کے بارے میں پوچھے تو اسے صحیح جواب نہ دیں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے! مجھے کیا اپنی وردی اتروانی ہے!" سب انسپکٹر بولا۔ "ا
علاقے کے ڈی ایس پی صاحب کے حکم پر یہ کارروائی ہوئی ہے، سمجھے!"
ارشاد نے چونک کر کہا۔ "پھر تو واقعی مجبوری ہے جناب! آپ کچھ نہیں کر سکتے!"

"ایسا بھی ہوتا ہے، کبھی کبھی ہمارے افسران کو بھی غلط اطلاعات مل جاتی ہیں، ڈ
ایس پی صاحب کو معلوم نہیں کس نے یہ غلط اطلاع دے دی کہ اس کمرے کے فلش ٹینک
میں ہیروئن چھپائی گئی ہے۔ تھانے میں اس وقت ڈیوٹی پر میں ہی تھا اس لیے مجھی کو دوڑ لگانا
پڑی، ایس ایچ او صاحب علاقے کے گشت پر تھے۔" سب انسپکٹر نے ایک ہزار رشوت ہضم
کرنے کے عوض اصل بات بتا دی ورنہ شاید وہ زبان نہ کھولتا۔ پھر وہ کہنے لگا۔ "اچھا اب

چلتا ہوں، ممکن ہے ڈی ایس پی صاحب فون کریں۔"

"اس تعاون کا شکریہ جناب!" ارشاد بولا۔

"کبھی تمہیں کوئی کام پڑے تو پریڈی تھانے آجانا!" سب انسپکٹر نے اٹھتے ہوئے کہا
اپنا نام بتایا۔

"ضرور جناب!" ارشاد اخلاقاً سب انسپکٹر کو کمرے کے دروازے تک چھوڑنے گیا
پھر دروازہ مقفل کر کے لوٹ آیا۔

"تم نے خواہ مخواہ ہزار روپے گنوا دیے۔" میں نے ارشاد سے کہا۔

"اس طرح سب انسپکٹر سے کم از کم ایک کام کی بات تو معلوم ہو گئی کہ وہ کوئی گمنام کال
صول ہونے کے سبب یہاں نہیں آیا تھا۔ اس سے تم نے بھی حمزہ خان کے اثر و رسوخ کا
ازہ لگا لیا ہوگا۔ خیر اس بحث کو چھوڑو اور یہ بتاؤ کیا اب بھی تم یہ ہوٹل چھوڑنا چاہتے ہو؟"

"احتیاط کا تقاضا تو یہی ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "حمزہ خان یقیناً یہ ضرور جاننا
ہے گا کہ اس کی چلی ہوئی چال کامیاب رہی یا نہیں! ناکامی کا علم ہونے کے بعد وہ صبح
نے سے پہلے کوئی اور چال بھی چل سکتا ہے۔"

"یہ خطرہ تو تمہیں آئندہ بھی اس کی طرف سے لاحق رہے گا، وہ تمہیں پھنسانے کی
شش کرے گا۔" ارشاد نے خدشے کا اظہار کیا۔ "کل سے تو تم یوں بھی اس کی دسترس
ں ہو گے، یہ کیوں بھول رہے ہو!"

"تمہارے مشورے کے مطابق جب میں کل اس سے ملوں گا تو صاف بات کر لوں گا
کہ آئندہ میرے ساتھ ایسا کوئی کھیل نہ کھیلے۔" میں نے کہا۔

"مجھے یقین نہیں شہباز کہ وہ اپنی فطرت سے باز آجائے گا، بہرحال سوچ لو، میری
پیشکش اب بھی اپنی جگہ ہے۔"

"ارشاد! اب میں تمہیں تمہاری پیشکش کا جواب اس وقت دوں گا جب حمزہ خان
سے مل آؤں۔"

"یہ خیال رکھنا کہ میری فلائٹ دو بجے کی ہے اور میں زیادہ سے زیادہ ساڑھے بارہ
بجے تک تمہاری واپسی کا انتظار کر سکتا ہوں، اب اگر تمہیں یہاں سے کسی اور ہوٹل میں منتقل
ہونا ہے تو پھر یہ سامان تو سمیٹو!" ارشاد بولا۔

"ٹھیک ہے، میں ابھی ناہید کو بلاتا ہوں تاکہ وہ میری مدد کر سکے۔" میں نے اٹھتے
ہوئے کہا۔

اپنی طرف سے درمیانی دروازے کی چٹخنی کھول کر میں نے دستک دی، پروی
جلدی ہی دروازہ کھول دیا۔

"ناہید کو بھیج دو۔" میں نے پروین کو مخاطب کیا۔

"پولیس والے چلے گئے؟" پروین نے پوچھا۔

"ہاں" میں نے جواب دیا۔

اسی وقت ناہید قریب آ گئی، اس کے چہرے سے فکرمندی کا اظہار ہو رہا تھا
نے اسے تسلی دی کہ اب کوئی فکر کی بات نہیں، پھر میرے کہنے پر وہ اپنے سوٹ کیس۔
گیا سامان سنبھال کر دوبارہ سوٹ کیس میں رکھنے لگی۔ میں دوسرے بکھرے ہوئے
کی طرف متوجہ ہو گیا۔ سب سے پہلے میں نے ایک طرف پڑی ہوئی وظائف والی
اٹھائی اور اسے اپنے سوٹ کیس میں رکھا، پھر کپڑے تہہ کرنے لگا۔ اگر ہم تھوڑی دیر قبل
ہوٹل سے نکل گئے ہوتے تو یہ پریشانی نہ اٹھانی پڑتی۔ اس عرصے میں پروین بھی ہ
کمرے میں آ گئی اور ناہید کا ہاتھ بٹانے لگی۔ ارشاد پہلے ہی سے وہاں موجود تھا۔ ج
اس ہوٹل سے دوبارہ روانہ ہونے کے لیے تیار ہوئے تو ساڑھے تین بجنے والے
ارشاد نے فون کر کے پورٹر کو بلالیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک ویٹر تھا جس نے کمرے پر
نظر ڈالی اور واش روم بھی کھول کر دیکھا۔ ارشاد نے ویٹر کو ٹپ دی اور پھر اسی کو مج
کمرے کی چابی دینے کو کہا، پورٹر نے دونوں سوٹ کیس اٹھالیے، پروین اپنے کمر۔
جا چکی تھی، ناہید اور ارشاد کے ساتھ میں کمرے سے نکل آیا۔

لفٹ کے ذریعے ہم نیچے پہنچے۔ ارشاد نے مجھے کاؤنٹر پر ادائیگی نہیں کرنے دا
پانچ ہزار پہلے ہی بہ طور پیشگی جمع کرا چکا تھا۔

اس ہوٹل سے نکل کر ہمیں زیادہ دور نہیں جانا پڑا، اس چوڑی اور پختہ گلی میں
فاصلہ پر بائیں جانب ایک اور کئی منزلہ ہوٹل تھا۔ وہاں مجھے پہلی ہی منزل پر ایک ڈبل
مل گیا۔ ارشاد نے کاؤنٹر پر موجود شخص سے کہہ دیا تھا کہ وہ صبح ٹھیک سات بجے فون
مجھے جگا دے۔ اس نے یہ ہدایت نوٹ کر لی۔

"تو پھر کل صبح تم میرے پاس کس وقت آ رہے ہو؟" ارشاد نے رخصت ہو
پہلے سوال کیا۔

"حمزہ خان کی بھیجی ہوئی گاڑی نو بجے آئے گی، میں احتیاطاً صبح آٹھ بجے تمہ
پاس پہنچ جاؤں گا، ٹھیک ہے!"

میری بار... کر ارشاد نے مطمئن انداز میں سرہلایا اور کھڑا ہو گیا، کاؤنٹر پر کیوں کہ
ارشاد نے جگانے کے لیے کہہ دیا تھا اس لیے ہم اطمینان سے سو سکتے تھے۔ اس کے باوجود
میں فوری طور پر نیند نہیں آئی۔

مجھے کروٹیں بدلتے دیکھ کر ناہید کہنے لگی۔ "کیوں شہباز، کیا نیند نہیں آ رہی؟"

"آ جائے گی نیند، تم تو سو جاؤ۔" میں نے کہا۔

"شہباز! اب تک ہم وقت کے دھارے پر کسی تنکے کی طرح بہتے چلے آئے ہیں ہم
کسی سمت کا تعین نہیں کر سکتے۔" ناہید نے یہ کہہ کر ٹھنڈا سانس بھرا۔

"سمت کا تعین ہو جائے گا ناہید! ابھی ہمیں اس کی مہلت ہی کہاں ملی ہے! فی الحال
ان باتوں کو ذہن سے جھٹک دو اور سونے کی کوشش کرو۔"

"اچھا" وہ بولی اور آنکھیں بند کر لیں۔

ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف کروٹ لیے ہوئے تھے۔ اس ہوٹل میں بھی ہم نے
خود کو میاں بیوی ہی ظاہر کیا تھا۔ سونے کے لیے اس وجہ سے وہاں بھی ہمیں ایک بیڈ ہی ملا
تھا۔ پھر بھی میں نے درمیانی فاصلہ برقرار رکھا اور اس کی طرف سے کروٹ لے لی۔

مجھے بس یہی لگا کہ آنکھ لگی تھی کہ سرہانے ایک تپائی پر رکھے فون کی گھنٹی بجنے لگی،
میری نگاہ سامنے والی کلاک پر پڑی، صبح کے سات بج چکے تھے۔

"کیا ہوا؟...... کیا ہوا؟" ناہید گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔

"کچھ نہیں، لیٹی رہو۔" میں نے ہاتھ بڑھا کر ٹیلی فون کا ریسیور اٹھالیا "ہیلو"......

"سر! سات بج گئے ہیں۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"شکریہ!" یہ کہہ کر میں نے ریسیور رکھ دیا اور انگڑائی لے کر اٹھ گیا۔ مجھے اب حمزہ
خان کو فون کرنا تھا۔ اس کے لکھوائے ہوئے نمبر میرے کوٹ کی جیب میں تھے۔ میں بستر
سے اٹھا اور ہینگر پر لٹکے ہوئے کوٹ کی جیب سے وہ پرچہ نکال لیا جس پر نمبر لکھے ہوئے
تھے۔ ٹیلی فون سیٹ کے قریب تپائی پر جو کارڈ پڑا تھا میں نے اس میں ہوٹل کے ٹیلی فون
ایکس چینج کا نمبر دیکھ کر ڈائل کیا۔

"یس سر!" دوسری طرف سے ایک نسوانی آواز سنائی دی، وہ ٹیلی فون آپریٹر ہی ہو
سکتی تھی۔

"ذرا ایک فون ملا دیجیے۔" میں نے یہ کہہ کر اسے ٹیلی فون نمبر لکھوا دیے۔

"سر! آپ ریسیور رکھ دیں، نمبر ملتے ہی آپ کی بات کرا دوں گی۔" آپریٹر بولی۔

میں نے ریسیور رکھ دیا اور ناہید سے مخاطب ہوا۔ ''اتنے میں تم تیار ہو جاؤ، سے فون پر بات کر کے میں بھی منہ ہاتھ دھولوں گا، پھر ہم ناشتا کر لیں گے۔ آٹھ ارشاد سے ملنے اس کے ہوٹل بھی جانا ہے۔ نو بجے ہمیں لینے کے لیے حمزہ خان کی گاڑی بھی آجائے گی۔''

میری بات سن کر ناہید اٹھی اور واش روم کی طرف چلی گئی، اسے بھی غالباً یہ ا کہ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔

حمزہ خان سے رابطہ قائم ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی، فون کی گھنٹی بجتے ہی ریسیور اٹھالیا تو آپریٹر کی آواز آئی۔ ''بات کیجیے سر!''

دوسرے ہی لمحے حمزہ خان کی بھاری آواز سنائی دی۔ ''ہیلو!''

''میں شہباز بول رہا ہوں جناب! زحمت دینے کی معافی چاہتا ہوں، ایک معاملے میں مجھے آپ سے ملاقات کرنی ہے جناب!'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے، مجھے خود بھی تم سے ملنا تھا، میں تمہیں فون کرنے ہی والا تھا کہ تم آگیا، سوزو تمہیں اور تمہاری بیوی کو پہلے اس جگہ چھوڑ دے گا جہاں تم لوگوں کے بندوبست کیا گیا ہے، پھر وہ صرف تمہیں ساتھ لے کر میرے پاس آجائے گا، ٹھیک حمزہ خان بولا۔

''جناب! مجھے ایک بات اور بتانی تھی کہ میں نے گزشتہ رات ہی وہ ہوٹل ہے، یہ ہوٹل بھی اسی گلی میں ہے۔'' میں نے یہ کہہ کر ہوٹل کا نام بتایا۔

''سوزو کو بتادوں گا میں، وہ نو بجے گاڑی لے کر پہنچ جائے گا، اور کچھ؟''

''نہیں جناب، شکریہ! مجھے بس یہی عرض کرنا تھا۔''

دوسری طرف سے مزید کچھ کہے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا گیا، میرے لیے یہ سمجھ نہیں ہوا کہ حمزہ خان خود بھی مجھ سے کیوں ملنا چاہتا ہوگا! اسے اب تک یقیناً یہ اطلاع ہوگی کہ اس کی چلی ہوئی چال کامیاب نہیں رہی اور پولیس مجھے گرفتار نہیں کر سکی، جاننے کے لیے بے چین ہوگا کہ آخر میں نے کس طرح اس کی چال ناکام بنادیا اور یہ ہیروئن کی تھیلی کہاں گئی؟ جب ناہید واش روم سے نکل آئی تو میں منہ دھونے اندر میں باہر آیا تو وہ لباس تبدیل کر چکی تھی۔

فون پر روم سروس سے میں نے ناشتہ بھیجنے کو کہہ دیا اور پھر خود بھی واش روم میں کپڑے بدل لئے، ناشتے کے انتظار میں ناہید اور میں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

مختصراً میں اس کو فون پر ہونے والی گفتگو بتانے لگا، اسی دوران میں ویٹر ناشتہ لے آیا۔ ویٹر چلا گیا تو ناہید بولی۔ ''شہباز! تم حمزہ خان سے صاف صاف بات کر لینا کہ آئندہ وہ تمہارے ساتھ ایسا خطرناک کھیل نہ کھیلے۔''

''میں یہ پہلے ہی سوچ چکا ہوں۔'' میں نے ناہید کو اطمینان دلایا اور جلدی جلدی ناشتہ کرنے لگا۔

اس وقت آٹھ بجنے میں بیس منٹ باقی تھے جب میں اپنے ہوٹل سے نکلا، مجھے اسی گلی میں جانا تھا اس لیے اطمینان سے ٹہلتا ہوا بائیں جانب واقع ہوٹل کی طرف بڑھنے لگا، ہوٹل میں داخل ہو کر لفٹ کے ذریعے میں تیسری منزل پر پہنچا اور پھر آگے بڑھتا ہوا ایک کمرے کے دروازے پر رک گیا، یہ ارشاد ہی کے کمرے کا دروازہ تھا، دستک دینے پر اسی نے دروازہ کھولا۔

''میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ تم آتے ہی ہوگے، آؤ!'' ارشاد یہ کہہ کر ایک طرف ہٹ گیا، اس کے حلیے سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ ابھی سو کر اٹھا ہے۔

میں کمرے میں داخل ہوا تو پروین بھی اٹھ کر بیٹھ گئی، اس نے میری طرف خمار آلود آنکھوں سے دیکھتے ہوئے دونوں ہاتھ اٹھا کر بڑی توبہ شکن انگڑائی لی، اس کا حسین اور متناسب جسم کسی کھنچی ہوئی کمان کی طرح تن گیا، میں نے گھبرا کر اس کی طرف سے نظریں پھیر لیں۔

ارشاد اور میں ایک سمت پڑی ہوئی خالی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

''حمزہ خان سے تمہاری بات ہوگئی؟ اس نے ملاقات کی اجازت دے دی؟'' ارشاد نے معلوم کیا۔

''ہاں۔'' میں نے بتایا۔ ''وہ خود بھی مجھ سے ملنا چاہتا تھا۔''

ارشاد کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی، پھر اس نے وہی کیا جو میں بھی سوچ چکا تھا، اس کے خیال سے میں نے اتفاق کیا۔

''پروین! میرے سوٹ کیس میں سے شہباز کی امانت نکال لاؤ!...... اور ہاں خالی بریف کیس بھی لے آنا۔'' ارشاد نے پروین سے کہا۔

میں نے دانستہ پروین کی طرف دیکھنے سے گریز کیا، مگر کب تک؟ ذرا ہی دیر میں وہ میرے بالکل سامنے آ کھڑی ہوئی، اس کے ایک ہاتھ میں تھیلی اور دوسرے ہاتھ میں بریف کیس تھا۔

''شہباز! تم یہ تھیلی اس بریف کیس میں رکھ کر لے جاؤ۔'' ارشاد مجھ سے بولا۔

''یہ...... یہ دونوں چیزیں یہاں...... یہاں میز پر رکھ دو۔'' میں نے یہ کہتے نظریں جھکا لیں۔

''کیوں، کیا میرے ہاتھوں سے یہ چیزیں لیتے ہوئے تمہیں کرنٹ لگ جائے پروین چہکی۔ ''ذرا نظریں تو اٹھاؤ، تم تو لڑکیوں کی طرح شرمار ہے ہو!''

''پروین! شرارت نہیں۔'' ارشاد بول اٹھا، پھر اس نے خود ہی پروین سے د چیزیں لے لیں۔ اس نے یقیناً یہ محسوس کر لیا تھا کہ پروین دانستہ مجھے ستا رہی ہے، و لیے چپ نہیں رہا تھا۔

''شہباز کے بارے میں تمہاری کچھ اور ہی رائے تھی ارشاد!'' پروین کہنے ''تمہارا کہنا تو یہ تھا کہ شہباز پر کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوتا، پھر چہرہ کیوں سرخ ہے؟...... لہو کی گردش بھی شاید تیز ہوگئی ہے۔'' پروین بدستور میرے سامنے کھڑی رہی۔ میری نظریں کیوں کہ جھکی ہوئی تھیں اس لیے مجھے صرف اس کے گورے پیر آ رہے تھے۔

''بس کرو پروین! تم جو کہہ رہی ہو مجھے بھی نظر آ رہا ہے، لیکن تمہیں اتنا تو ما پڑے گا کہ شہباز ایک باکردار نوجوان ہے، تم جیسی کوئی عورت بھی اسے راہِ راست سے بھٹکا سکتی۔ جاؤ، واش روم میں جا کے شب خوابی کا یہ لباس تبدیل کر لو۔'' ارشاد نے کہ بریف کیس کھول کر اس میں ہیروئن کی تھیلی رکھ دی۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''تمہار لیے چائے یا ناشتہ منگواؤں؟'' پروین اس دوران میں واش روم کا رخ کر چکی تھی۔

''میں ناشتہ کر کے آیا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میرا خیال ہے کہ اب مجھے چاہئے۔''

''یہ لو!'' ارشاد نے بریف کیس میری طرف بڑھا دیا۔ ''وقت کا خیال رکھنا! ساڑھے بارہ بجے سے زیادہ تمہارا انتظار نہیں کر سکوں گا۔''

''میں کوشش کروں گا کہ اس سے پہلے ہی پہنچ جاؤں۔'' میں یہ کہہ کر اٹھ کھڑا میرے ہاتھ میں بریف کیس تھا۔

ارشاد کے کمرے سے نکلتے ہی مجھے اس بات کا پوری طرح احساس تھا کہ میر پاس ایک خطرناک چیز ہے، میں اس لیے پوری طرح سے محتاط اور چوکنا تھا۔ میری نظر اردگرد کا جائزہ لے رہی تھیں۔

ہوٹل سے نکل کر میں گلی میں آیا، صبح کا وقت تھا اس لیے زیادہ آمد و رفت نہیں تھی۔ میں کچھ دور چلا تھا کہ سامنے سے ایک معذور شخص کو آتے دیکھا۔ وہ بیساکھیوں کے سہارے چل رہا تھا۔ میرے قریب پہنچتے ہی اس نے خلاف توقع اچانک دائیں ہاتھ والی بیساکھی اٹھائی اور میری کلائی پر ماری، بریف کیس میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا، بیساکھیاں پھینک کر وہ کسی چیل کی طرح بریف کیس پر جھپٹا اور اسے اٹھا کر بھاگنے لگا۔

اس میں کوئی شک نہیں رہا تھا کہ وہ شخص معذور نہیں تھا دوسرے ہی لمحے میں اس کے پیچھے بھاگا۔ میرے پیروں میں جیسے پر لگ گئے تھے۔ درمیانی فاصلہ اسی لیے تیزی سے کم ہونے لگا۔ گلی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ اس میں اس کے سر پر پہنچ گیا۔ بھاگتے بھاگتے اس نے مڑ کے دیکھا اور بوکھلا گیا۔ اسی وقت سامنے سے گلی میں ایک کار داخل ہوئی۔ یوں گویا اس کی راہ مسدود ہوگئی۔ اسے شاید یقین ہوگیا تھا کہ اب وہ میری دسترس میں آنے سے بچ نہیں سکتا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں اسے دبوچ لیتا، اس نے بریف کیس پھینکا اور کار کی زد میں آنے سے بچنے کے لیے دائیں جانب دوڑ لگا دی۔ میں تیزی سے جھکا اور زمین پر پڑا ہوا بریف کیس اٹھا لیا۔ اس شخص کا پیچھا کرنا میں نے فضول سمجھا تھا۔ اسی لمحے کار کے بریک چرچرائے اور میں اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ کار والے نے اس شخص کو بریف کیس پھینک کر بھاگتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ اسی لیے حقیقت حال جاننے کی خاطر کار سے اتر کر میرے قریب آ گیا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور استفسار پر جو واقعہ پیش آیا تھا، بتا دیا۔

کار والا مطمئن ہو کر واپسی کے لیے مڑ گیا۔ میں بھی وہاں مزید نہیں رکا۔

مجھ سے بریف کیس چھین کر بھاگنے والا شخص یقیناً کوئی جرائم پیشہ ہی تھا۔ میں نے اس کے بارے میں اندازہ لگایا۔ جب اسے پکڑے جانے کا یقین ہوگیا تو بچنے کے لیے اس نے بریف کیس پھینک دیا۔ لازماً اسے یہ معلوم نہیں ہوگا کہ بریف کیس میں کیا ہے! اگر معلوم ہوتا تو غالباً وہ بہ آسانی بریف کیس سے دستبردار نہ ہوتا۔

تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا میں اپنے ہوٹل تک پہنچ گیا۔ اپنے ہوٹل میں داخل ہوتے وقت بھی میں اطراف سے غافل نہیں تھا۔

ناہید نے یہ تصدیق کیے بغیر کہ دستک دینے والا کون ہے، دروازہ نہیں کھولا۔ خود میں ہی چلتے وقت اسے یہ تاکید کر گیا تھا۔ کمرے کا دروازہ بند کر کے اس بریف کیس کو میں نے سوٹ کیس میں رکھ دیا، پھر فون پر بتا دیا کہ ہم ہوٹل چھوڑ رہے ہیں اور دس منٹ بعد کسی پورٹر کو بھیج دیا جائے۔

''شہباز! اس بریف کیس میں کیا ہے جو تم نے......''

میں بول اٹھا۔ ''وہی خطرناک ۔ شے ہے جس کی تلاش میں گزشتہ رات پولیس نے چھاپہ مارا تھا۔ ارشاد نے احتیاطاً اس تھیلی کو بریف کیس میں رکھ دیا ہے۔'' میرے کہنے کے بعد ناہید نے نہیں پوچھا کہ اس تھیلی کو میں کہاں اور کیوں لے جا رہا ہوں۔ اسے پہلے ہی میں سب کچھ بتا چکا تھا۔

دس منٹ کے بعد ہی ہوٹل کا ایک پورٹر اور ویٹر ہمارے کمرے میں آ گئے۔ ویٹر کو میں نے کمرے کی چابی تھما دی۔ پورٹر نے ہمارے دونوں سوٹ کیس اٹھا لئے۔ ناہید کو ساتھ لئے میں کمرے سے نکل آیا۔ ہر چند کہ ہم ہوٹل کی پہلی منزل ہی پر ٹھہرے تھے، پھر بھی پورٹر نے سوٹ کیس ساتھ ہونے کی وجہ سے لفٹ کا رخ کیا۔ ہم بھی اس کے ہمراہ نیچے پہنچ گئے۔

کاؤنٹر پر میرا بل تیار تھا۔ جو رقم رات کو میں نے پیشگی جمع کرائی تھی، اس میں بل کی رقم کاٹ کے بقیہ روپے مجھے ادا کر دیئے گئے۔

پورٹر ہمارے سوٹ کیس اٹھائے ہوٹل کے باہر تک آیا اور پوچھا۔ ''سر آپ کے لیے کوئی ٹیکسی لے کر آؤں؟''

''نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''دونوں سوٹ کیس تم یہیں رکھ دو۔'' یہ کہہ کر بطور ٹپ اسے میں نے دس روپے کا ایک نوٹ دیا۔

پورٹر شکریہ ادا کر کے چلا گیا۔ میں نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا۔ نو بجنے ہی والے تھے۔ اسی وقت مجھے گلی میں سفید شیراڈ داخل ہوتی دکھائی دی جو ہمارے قریب آ کر رک گئی۔ کار اور اس کے جاپانی ڈرائیور کو میں نے پہچان لیا۔ ڈرائیو سوزو میری طرف دیکھ کر شناسائی کے انداز میں مسکرایا اور کار سے اتر کر احتراماً میرے سامنے جھکا۔

''آپ دونوں کار میں بیٹھئے جناب!'' ڈرائیور سوزو انگریزی میں مجھ سے بولا۔ پھر آگے بڑھ کر اس نے کار کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔ اس کے ساتھ اس نے یہ بھی بتایا کہ ہمارے سوٹ کیس وہ کار کی ڈگی میں رکھ دے گا۔

اتنی انگریزی بہر حال مجھے آتی تھی میں نے میٹرک اچھے نمبروں سے پاس کیا تھا۔ ناہید کے پاس میں کار کی پچھلی نشست پر بیٹھ گیا تو سوزو نے کار کا دروازہ بند کر دیا۔ پھر اس نے ڈگی کھولی اور اس میں سوٹ کیس رکھ دیے۔ ڈگی بند کر کے وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا اور کار وہاں سے روانہ ہو گئی۔

''سوزو!'' میں نے جاپانی ڈرائیور کو مخاطب کیا اور انگریزی زبان میں پوچھا۔ ''تم

ہمیں کہاں لے جا رہے ہو؟''

''کلفٹن۔'' سوزو نے جواب دیا۔ ''وہاں آپ دونوں ایک فلیٹ میں رہیں گے جس کی چابیاں میرے پاس ہیں۔''

صدر اور ڈیفنس کے علاوہ کراچی کا یہ تیسرا علاقہ تھا جس کے بارے میں معلوم ہوا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ صدر سے وہ علاقہ کتنی دور ہے۔ سوزو کو شاید یہ بتا دیا گیا تھا کہ میں کراچی میں نووارد ہوں اور مجھے راستوں کا علم نہیں وہ اسی لئے مجھے راستوں کے بارے میں بتاتا رہا۔ راستے میں جو اہم عمارتیں آئیں ان کے متعلق بھی سوزو نے بتایا خود میں بھی ان راستوں کو ذہن نشین کرتا رہا تا کہ دوبارہ صدر آ سکوں۔ اس کی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ صدر ہی کے ایک بینک میں میرا اکاؤنٹ تھا جہاں میرے سوا کروڑ روپے جمع تھے۔ کسی بھی وقت مجھے وہاں سے رقم نکلوانے کی ضرورت پیش آ سکتی تھی۔ سفر کے دوران میں ناہید بھی کھڑکی سے باہر کے مناظر دیکھتی رہی۔

کلفٹن کے علاقے میں وہ کئی منزلہ ایک بڑی عمارت تھی جس کے کمپاؤنڈ میں کار داخل ہوئی۔ کمپاؤنڈ کے کھلے ہوئے آہنی پھاٹک کے ایک طرف مجھے مسلح گارڈ بھی کھڑا ہوا نظر آیا۔ اسی کمپاؤنڈ میں سوزو نے ایک جگہ کار پارک کی، پھر ڈرائیونگ سیٹ سے اتر کر ہمارے لئے کار کا پچھلا دروازہ کھولا۔ میں اور ناہید کار سے اتر گئے تو سوزو نے کار کے شیشے چڑھا کر دروازہ بند کر دیا، پھر ڈگی کھول کر اس میں سے سوٹ کیس بھی نکال لئے۔ کار کو مقفل کر کے دونوں سوٹ کیس اٹھائے وہ ہمارے ساتھ ہو لیا۔

مطلوبہ فلیٹ گراؤنڈ فلور ہی پر تھا سوزو ہی نے اس کا دروازہ کھولا اور ہم فلیٹ میں داخل ہو گئے تین کمروں کے اس فلیٹ میں ضرورت کا تمام سامان موجود تھا۔ یہاں تک کہ باورچی خانے کے باہر رکھے ہوئے فریج میں پھل، انڈے، سبزیاں وغیرہ تک موجود تھیں۔ سوزو کے ساتھ ہم نے پورے فلیٹ کا جائزہ لیا۔ ایک کمرے میں ہمیں دو سنگل بیڈ بھی پڑے دکھائی دیئے۔ دوسرے کمرے میں صرف ایک ڈبل بیڈ تھا۔ تیسرا کمرا نشست گاہ تھا۔ وہ فلیٹ گویا دو بیڈ روم اور ایک ڈرائنگ روم پر مشتمل تھا۔ اس کے درمیان جو جگہ تھی وہاں کھانے کی میز اور کرسیاں پڑی تھیں۔ فلیٹ صاف ستھرا اور بہترین فرنیچر سے آراستہ تھا۔ ایک بیڈ روم میں مجھے ٹیلی فون سیٹ بھی رکھا نظر آیا۔ کلر ٹی وی، وی سی آر غرض کہ وہاں سبھی کچھ تھا۔ لکڑی کی بنی ہوئی خوبصورت الماریاں بھی کمروں میں رکھی تھیں سوزو نے ان الماریوں کی چابیاں بھی مجھے دے دیں۔

"آپ کو فلیٹ پسند آیا؟" سوزو نے مجھ سے دریافت کیا۔

"یقیناً یہ رہنے کے لیے اچھی جگہ ہے؟" میں نے جواب دیا۔

اس عرصے میں ناہید باورچی خانے کا جائزہ بھی لے چکی تھی۔ وہاں بھی ہر شے موجود تھی۔

"مارکیٹ یہاں سے کتنی دور ہے؟" میں نے سوزو سے پوچھا۔

"زیادہ دور نہیں، واپسی میں آپ کو دکھا دوں گا۔" سوزو نے بتایا۔ پھر مجھے اور ناہی
اپنے ساتھ لے کر اس نے گھر کے صدر دروازے میں لگی ہوئی چھوٹی سی دوربین بھی دکھا
اور بولا۔ "کال بیل کی آواز سن کر دروازہ کھولنے سے پہلے آپ اس کے ذریعے دیکھ
ہیں۔"

سوزو نے بتایا کہ باہر سے اندر دیکھنا ممکن نہیں۔

معاً مجھے خیال آیا کہ حمزہ خان سے مل کر ساڑھے بارہ بجے سے پہلے میرا صدر پہ
بھی ضروری ہے۔ مجھے ارشاد سے ملنا تھا۔ ہمارے سوٹ کیس سوزو نے اس بیڈروم میں ر
دیئے تھے جس میں ڈبل بیڈ پڑا تھا۔ ناہید اور سوزو کو میں لاؤنج میں چھوڑ کر وہاں پہنچا
اپنے سوٹ کیس سے بریف کیس نکال لیا۔

"ناہید! میں حمزہ خان سے مل کر صدر جاؤں گا۔" میں نے ناہید کو مخاطب کیا۔ "
صدر سے میں یہاں لوٹوں گا۔ اگر واپسی میں مجھے دوپہر ہو جائے تو تم فکر نہ کرنا۔ اتنے میں
تم دوپہر کے کھانے کا بندوست کر سکتی ہو۔ اس طرح تمہارا وقت بھی گزر جائے گا۔ ٹھیک
ہے؟"

"کوشش کرنا کہ جلد لوٹ آؤ۔ تمہیں معلوم ہی ہے کہ یہ جگہ میرے لئے بالکل
ہے۔" ناہید نے کہا۔

"میری کوشش تو یہی ہوگی، پھر بھی دیر ہو سکتی ہے۔ تم بہرحال گھبرانا مت! مجھے خ
بھی یہ احساس ہے کہ تم اکیلی ہوگی۔" میں نے اسے دلاسا دیا اور پھر سوزو سے بولا
"میرے خیال میں اب ہمیں چلنا چاہیئے۔"

"جیسی آپ کی مرضی جناب!" سوزو نے خوش اخلاقی سے کہا۔ چلتے چلتے کچھ سو
کر احتیاطاً میں نے اپنے کوٹ کی جیب سے وہ کاغذ نکال کر ناہید کو دے دیا جس پر حمزہ خا
کی کوٹھی کے تینوں فون نمبر لکھے ہوئے تھے۔

"یہ حمزہ خان کی کوٹھی کے فون نمبر ہیں تم انہیں اپنے پاس رکھ لو۔" میں نے ناہید سے
کہا۔ "محض احتیاطاً تمہیں نمبر دیے جا رہا ہوں کوئی اور بات نہیں۔ ہاں ذرا یہاں کا فون نمبر

تو دیکھ کر بتا دو مجھے۔ موقع ملا تو فون کر کے تمہاری خیریت پوچھ لوں گا۔"

"میں آئی ابھی دیکھ کر۔" ناہید یہ کہہ کر اس بیڈروم میں چلی گئی جہاں ٹیلی فون سیٹ
رکھا تھا۔ وہ واپس آئی تو بتایا۔ "وہاں تو نمبر نہیں لکھے۔"

"شاید سوزو کو معلوم ہو۔" میں دھیرے سے بولا۔ اپنا نام سن کر سوزو میری طرف
متوجہ ہو گیا تو میں نے اس سے پوچھا۔ "یہاں کا فون نمبر کیا ہے؟"

سوزو نے فوراً فون نمبر بتا دیا جو اتنا آسان تھا کہ مجھے اسی وقت یاد ہو گیا۔ اس کے
باوجود میں نے جیب سے کاغذ نکال کر نمبر لکھ لیا۔

"خدا حافظ!" میں نے ناہید سے کہا۔

"اچھا خدا حافظ!" ناہید جواباً بولی اور دروازہ بند کر لیا۔

اسی بلڈنگ سے کچھ فاصلے پر ایک پٹرول پمپ تھا۔ سوزو نے وہاں سے پٹرول
بھروایا۔ پھر اسی پٹرول پمپ کے مالک سے میرا تعارف کرایا۔

"آج سے ان کے بھی دستخط چلیں گے۔" سوزو نے پٹرول پمپ کے مالک سے
کہا۔ "یہ کار بھی انہی کے استعمال میں رہے گی۔"

پٹرول پمپ کے مالک نے ایک شیٹ نکال کر اس پر میرا نام لکھا۔ وہ شیٹ چھپی
ہوئی تھی اس نے اپنے ملازم کو آواز دے کر معلوم کیا کہ کار میں کتنا پٹرول بھرا گیا ہے۔ پھر
شیٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "یہاں دستخط کر دیجئے۔"

میں دستخط کر رہا تھا تو اس نے سوزو کو بتایا کہ اس سلسلے میں فون پر اسے حمزہ خان کی
ہدایت مل چکی ہے۔

کیبن سے نکلتے ہوئے میں نے سوزو کو مخاطب کیا۔ "اگر یہی کار میرے استعمال میں
رہنی ہے تو پھر میں اسے ڈرائیو کرتا ہوں۔ تم میری رہنمائی کرتے رہنا!"

"بہتر ہے جناب!" سوزو نے کار کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

کار میں سوزو میرے ساتھ آگے بیٹھ گیا۔ اس نے کار کی چابیاں میرے حوالے کر
دیں، پھر ایک خانہ کھول کر مجھے کار کے کاغذات بھی دکھائے۔

"جناب! انہی کاغذات میں آپ کا ڈرائیونگ لائسنس بھی رکھا ہے۔" سوزو نے
بتایا۔

"یہ کب بنوایا ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"کل ہی میں نے باس کے حکم پر بنوا لیا تھا۔" سوزو نے جواب دیا۔ حمزہ خان جیسے

با اثر شخص کا کسی آدمی کے لیے ڈرائیونگ لائسنس بنوالینا کون سا مشکل کام ہے! یہ سو
ہوئے میں نے کار اسٹارٹ کی اور اسے سڑک پر لے آیا۔ سوزو میری رہنمائی کرنے ا
راستے ہی میں اس نے مجھے ایک مارکیٹ دکھائی وہاں سے روزمرہ استعمال کی اشیاء خر
جاسکتی تھیں۔ کارڈرائیو کرتے ہوئے میں نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی کہ کراچی
شہر کے لوگوں میں خاصا ٹریفک سینس تھا۔

کلفٹن سے ڈیفنس پہنچنے کا راستہ میں نے اپنے ذہن میں محفوظ رکھا۔ ویسے بھی را
میں زیادہ پیچ وخم نہیں تھے۔ صدر کے مقابلے میں کلفٹن سے ڈیفنس زیادہ دور نہیں تھا۔ جلد
وہاں پہنچ گئے۔ حمزہ خان کی کوٹھی کو میں پہچان گیا کیونکہ گزشتہ روز ہی ارشاد کے ساتھ و
آچکا تھا۔

کار ڈرائیو کرتے ہوئے بریف کیس میں نے سوزو کو تھما دیا تھا۔ کار سے اتر کر
نے بریف کیس اس سے لے لیا۔ دور ہی سے مجھے عمارت کا صدر دروازہ نظر آرہا تھا۔ و
کل کی طرح آج بھی دو مسلح افراد کھڑے تھے۔ سوزو کو میں وہیں چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

سیڑھیاں چڑھ کر میں بلا جھجک مسلح افراد کی طرف بڑھا۔ مجھے معلوم تھا کہ حمزہ
ان محافظوں کو پہلے ہی میرے بارے حکم دے چکا ہوگا۔ میرا اندازہ غلط ثابت نہیں
محافظوں نے میرے لیے دروازہ کھول دیا۔ میرے اندر داخل ہوتے ہی دروازہ بند
گیا۔ چھوٹی سی راہداری عبور کرکے مجھے ہال کمرے تک پہنچنے میں دیر نہیں لگی۔ گزشتہ دا
طرح ہال کمرا بالکل خالی تھا۔ وہاں سناٹا چھایا ہوا تھا۔

معاً اس سناٹے کو حمزہ خان کی آواز نے توڑ دیا۔ ''سامنے جو صوفہ پڑا ہے، ا
آرام سے بیٹھ جاؤ شہباز!'' میں آگے قدم بڑھا کر صوفے پر بیٹھ گیا اور اخلاقاً اس
خان کا شکریہ ادا کیا۔

''تمہاری آمد کا مقصد بعد میں سنوں گا شہباز! پہلے یہ بتا دوں کہ تمہیں کیوں
ہے!'' حمزہ خان کی آواز پھر سنائی دی۔ ''تم اپنا ریوالور ساتھ لائے ہو؟''

''جی نہیں۔'' میں نے بتایا۔ ریوالور کے ذکر پر میں چونکا ضرور تھا۔

''دراصل میں تمہارا نشانہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کیسا ہے! خیر کوئی بات نہیں۔ تم
صوفے پر بیٹھے ہو، اس کی گدیاں اٹھا کر دیکھو تمہیں کسی نہ کسی گدی کے نیچے ایک ریوالو
نظر آجائے گا، دیکھو!'' حمزہ خان کی آواز میں حکم تھا۔ ''ریوالور کھول کر گولیاں ضرور چیک
لینا کہ ریوالور کہیں خالی تو نہیں! اس کی وجہ یہ ہے کہ نشانے کے ساتھ مجھے تمہاری ہمت

ذہانت کا امتحان بھی لینا ہے۔''

''وہ کس طرح جناب؟ میں کچھ سمجھا نہیں۔'' میں نے کہا۔

''میں سمجھاتا ہوں تمہیں۔'' حمزہ خان کی آواز ہال میں گونجی۔ ''فرض کرو، اچانک
یہاں تمہیں کوئی قتل کرنے آجائے اور وہ مسلح ہو تو تم کیا کرو گے؟''

''ظاہر ہے جناب کہ میں اس سے اپنی جان بچانے کی کوشش کروں گا۔'' میں نے
جواب دیا۔

''اور جان بچانے کا صرف یہی راستہ رہ جائے کہ تم اپنے دشمن کو ٹھکانے لگا دو تو؟''

''تو...... تو جناب، مجبوراً مجھے ایسا ہی کرنا پڑے گا۔''

''تو پھر تیار ہو جاؤ شہباز!'' حمزہ خان کی آواز آئی۔ ''ذرا ہی دیر میں یہاں ایک ایسا
شخص داخل ہونے والا ہے جو تمہیں ہر ممکن طور پر قتل کرنا چاہتا ہے۔ تمہیں اس کے قاتلانہ
حملے سے بچنا ہے مگر میرا خیال ہے کہ یہاں روشنی کچھ کم ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہیں اپنے
دفاع کا پورا موقع مل سکے۔'' حمزہ خان کے ان الفاظ کے ساتھ ہی کمرے میں ایک دم اتنی
روشنی ہوگئی کہ کہیں سوئی بھی گر جاتی تو اسے تلاش کیا جاسکتا تھا۔

قہراً جبراً مجھ حمزہ خان کے حکم پر صوفے کی گدیاں ہٹا کے ایک ریوالور تلاش کرنا
پڑا۔ میں جس صوفے پر بیٹھا تھا، اسی کی ایک گدی کے نیچے مجھے ریوالور رکھا ہوا مل گیا۔ اس
ریوالور کے چیمبر کو کھول کر میں نے چیک کیا تو اس میں گولیاں موجود تھیں۔

''سنبھلو شہباز! تمہارا دشمن تم پر حملہ کرنے والا ہے۔'' حمزہ خان کی آواز میرے
اعصاب پر جیسے بجلی بن کر گری۔

میں نے تیزی سے گھوم کر ہال کا جائزہ لیا۔ پھر ایک دم جھک گیا۔ زبردست دھماکے
سے ہال کمرا گونج اٹھا۔ میں اگر تیزی سے جھک نہ گیا ہوتا تو میری کھوپڑی کے پرخچے اڑ
گئے ہوتے۔ مجھے وہ دراز قد شخص نظر آگیا جس نے مجھ پر گولی چلائی تھی۔ وہ دائیں جانب
سیڑھیوں کے اوپر کھڑا تھا۔ اسے پہچاننے میں مجھے کوئی دقت نہیں ہوئی۔ بلاشبہ وہ حمزہ خان کا
دست راست کمال ہی تھا۔

اس سے پہلے کہ کمال مجھ پر دوسرا فائر کرتا، میں اچھل صوفے کی آڑ میں ہو گیا۔

''تم مجھ سے بچ نہیں سکتے شہباز!'' میں نے کمال کی آواز سنی۔ ''میں تمہیں ہر قیمت
پر قتل کردوں گا۔ باس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ اگر میں نے تمہیں ٹھکانے لگا دیا تو تمہاری
حسین بیوی کو وہ میرے حوالے کر دے گا۔ جس کی خاطر تم نے مجھ پر ہاتھ اٹھانے کی

ہمت......''

''کتے!'' میں چیخ اٹھا اور کمال کا جملہ ادھورا ہی رہ گیا۔ اس کی بات سن کر میرا خون کھولنے لگا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میرا نشانہ خطا ہو گیا۔ میری چلائی ہوئی گولی اس کے قریب سے گزر گئی تھی۔ اب وہ چند سیڑھیاں اور نیچے اتر آیا تھا۔

''یوں بزدل چوہوں کی طرح کیوں چھپا ہوا ہے تُو! مرد کا بچہ ہے تو میری طرف سامنے آ کر گولی چلا!'' کمال کی آواز جیسے زہر میں بجھی ہوئی تھی۔

میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ میں اچھل کر کھڑا ہو گیا اور اسی کے ساتھ کمال کے سینے کا نشانہ لیا۔ میں نے اسے گولی چلانے کی مہلت دیئے بغیر فائر کیا اور اس مرتبہ میرا نشانہ خطا نہیں ہوا۔ کمال کے منہ سے بھیانک چیخ نکلی اور وہ سینہ تھامے سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا نیچے آ گیا۔ اس دوران میں ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا۔ میری دانست میں کمال کی حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی نے اس کی جان لے لی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے وہ اپنے سینے کو تھامے ہوئے تڑپ رہا تھا۔ میں اس سے چند قدم کے فاصلے پر ریوالور ہاتھ میں لئے کھڑا تھا۔

''اپنی ہوس کا انجام دیکھ لیا کمال! تُو آخر کار میرے ہاتھ سے مارا گیا!'' میں نے آگے بڑھتے ہوئے نفرت و حقارت سے کہا۔ ''میں چاہوں تو دوسری گولی تیری کھوپڑی میں اتار کر تجھے یوں تڑپ تڑپ کے مرنے سے نجات دلا سکتا ہوں، مگر ایسا نہیں کروں گا کہ تیری یہی سزا ہے۔''

''شہبا...... باز...... تو...... تو نے مجھے قتل کر دیا شہباز!...... قتل......'' تکلیف کی شدت سے شاید وہ اپنی بات پوری نہیں کر سکا۔

پھر میں نے اس کے جسم کو آخری بار تڑپتے اور ساکت ہوتے دیکھا۔

اسی وقت ہال کی تیز روشنی بجھ گئی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے حمزہ خان کی آواز سنائی دی۔ ''مبارک ہو شہباز! تم اس امتحان میں کامیاب رہے۔ اب یہ ریوالور وہیں رکھ دو جہاں سے تم نے اسے نکالا تھا۔ اس کی ضرورت اب نہیں رہی۔''

''وہ تو ٹھیک ہے جناب، لیکن اس شخص نے قتل ہونے سے پہلے جو کہا، کیا سچ تھا؟ کیا آپ نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ میری بیوی کو اس کے حوالے......''

''ہرگز نہیں!'' حمزہ خان نے میری بات کاٹ دی۔ ''کمال نے تم سے جھوٹ بولا تھا۔ یہ البتہ حقیقت ہے کہ اس نے مجھ سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا، لیکن میں نے اس

کی خواہش کو رد کر دیا تھا۔ ویسے بھی مجھے یقین تھا کہ کمال تمہیں قتل نہیں کر سکے گا۔ وہ اپنے بارے میں بہت سی خوش فہمیوں کا شکار تھا۔ اسے ایک خوش فہمی یہ تھی کہ وہ بہت آسانی سے تمہیں موت کی نیند سلا دے گا۔ یہی خوش فہمی خود اس کی موت کا سبب ثابت ہوئی۔ اب تم ریوالور اس کی جگہ واپس رکھ کر آرام سے صوفے پر بیٹھو۔ میں تمہارے لئے چائے بھجواتا ہوں۔''

''اور جناب، یہ لاش؟...... کیا یہ یہیں پڑی رہے گی؟'' میں صوفے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے حیرت سے بولا۔

''اگر میں تم سے یہ کہوں شہباز کہ اس لاش کو تم خود ہی لے جا کر کہیں ٹھکانے لگا دو تو کیا یہ تمہارے لیے ممکن ہے؟'' حمزہ خان نے سوال کیا۔

''جی نہیں جناب!'' میں نے صاف انکار کر دیا۔ ''میں تو ابھی ٹھیک طرح سے اس شہر کے راستے بھی نہیں جانتا، پھر اس لاش کو کہاں ٹھکانے لگا سکتا ہوں!''

''یہ شہر اگر تمہارے لیے اجنبی نہ ہوتا تو کیا تم ایسا کر لیتے؟ کمال بہرحال تمہارے ہی ہاتھوں مارا گیا ہے۔''

''پھر شاید میں اس کی لاش کو ٹھکانے لگانے کی ہمت کر لیتا۔'' میں نے ریوالور کو صوفے کی گدی کے نیچے رکھتے ہوئے جواب دیا۔

''خیر میں اپنے آدمیوں کو بھیجتا ہوں جو کمال کی لاش کو یہاں سے اٹھا کر لے جائیں گے اور فرش پر سے خون بھی صاف کر دیں گے۔ میرے اور تمہارے درمیان باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔ تم چائے پیو! اس لاش کو میں ٹھکانے لگوا دوں گا۔''

پھر ہال کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ میں اس عرصے میں صوفے پر بیٹھ چکا تھا۔ کسی کو قتل کر کے اعصاب کو پُرسکون ہونے میں وقت لگتا ہے۔ کچھ ہی فاصلے پر سیڑھیوں کے نیچے کمال کی لاش پڑی تھی۔ میں نے اس طرف سے نظریں پھیر لیں۔ ذرا ہی دیر میں مجھے وہاں چند افراد نظر آئے جو کمال کی لاش کو اسٹریچر پر ڈال کر لے گئے۔ اسی کے ساتھ ایک شخص ٹی ٹرالی دھکیلتا ہوا لے آیا اور اسے میرے سامنے کھڑی کر کے چلا گیا۔ میں چائے پینے لگا۔ بریف کیس جو میں اپنے ساتھ لایا تھا، میرے پہلو میں رکھا تھا۔ ابھی تک اس سلسلے میں حمزہ خان سے کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ چائے پیتے ہوئے میں نے یہ بھی دیکھا کہ جو لوگ کمال کی لاش اٹھا کر لے گئے تھے، اب وہ فرش سے خون صاف کر رہے تھے۔ پھر وہ چلے گئے۔ اب ہال کمرا پہلے کی طرح نظر آ رہا تھا۔ معلوم ہی نہیں ہو رہا تھا کو وہاں کچھ دیر پہلے قتل ہو چکا ہے۔

"شہباز!" اچانک حمزہ خان کی آواز آئی۔ "اب یہ بتاؤ کہ تم مجھ سے ملنا کیوں چاہتے تھے؟"

"یہ شخص جو ابھی میرے ہاتھوں قتل ہو چکا ہے، کل رات بھی اپنے دو ساتھیوں کو کر......" پھر میں نے وہ پورا واقعہ بیان کر دیا جو گزشتہ رات پیش آیا تھا۔ حمزہ خان کو میں صرف یہ بتانے سے دانستہ گریز کیا کہ ارشاد نے اس واقعے پر کیا خیالات ظاہر کیے تھے!

"پھر تو یہ اچھا ہی ہوا کہ کمال تمہارے ہاتھوں مارا گیا۔" حمزہ خان نے کہا۔ "واقعے سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ کمال تمہارے ہاتھوں شکست کھا کر تم سے انتقام لینے پر اتر آیا تھا۔ میرا دست راست ہونے کی وجہ سے پولیس میں اس کا بھی کافی اثر و رسوخ تھا۔ علاقے کے ڈی ایس پی کو یقیناً اس نے اطلاع دی ہوگی۔ کمال کو یہ علم تھا کہ تم ہمارے ساتھی بن چکے ہو، پھر بھی اس نے تمہیں پھنسانا چاہا۔ اس کا یہ جرم واقعی ناقابل معافی ہی تھا۔ جرم کی سزا بھی اسے موت ہی کی صورت میں ملتی۔ تم نے اس کی بزدلانہ چال سے نمٹ کر حیرت انگیز ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔ بلاشبہ اس پر تم انعام کے مستحق ہو۔ مجھے تو اس پر حیرت ہے کہ تم اتنی چوکنا نیند سوتے ہو کہ کمرے کا قفل کھلنے کی ہلکی سی آواز سے بھی تمہاری آنکھ کھل گئی۔ میں تمہارا انعام بھیج رہا ہوں۔"

"جناب! میں وہ تھیلی بھی ساتھ لے آیا ہوں جو میرے کمرے کے فلش ٹینک میں چھپائی گئی تھی۔" میں نے بتایا۔

"میرا جو آدمی انعام لے کر آ رہا ہے، تم اسے یہ بریف کیس دے دو۔ تم وہ تھیلی بریف کیس میں رکھ کر لائے ہو گے۔"

"جی ہاں جناب! آپ کا اندازہ درست ہے۔" میں بولا۔ "اس کے علاوہ میں آپ سے ایک اور بات کی یقین دہانی چاہتا ہوں۔"

"کیسی یقین دہانی؟" حمزہ خان نے سوال کیا۔

"یہ کہ آئندہ میرے ساتھ کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آئے گا جو گزشتہ رات پیش آیا۔"

"جب میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ کمال نے ذاتی دشمنی کی بنیاد پر ایسا کیا تھا تو پھر تم اس طرح کی بات کیوں کر رہے ہو! کہیں تم اس غلط فہمی کا شکار تو نہیں کہ کمال نے میری ایماء پر ایسا کیا ہوگا؟...... اگر ایسا ہے تو اس خیال کو ذہن سے جھٹک دو، میں بھلا اپنے ہی کسی آدمی کو کیوں گرفتار کرانے لگا!"

حمزہ خان کی اس بات کا بھی میرے پاس جواب تھا، مگر دانستہ کچھ نہیں بولا۔

اسی وقت حمزہ خان کا ایک آدمی مجھے ایک طرف سے آتا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں ہزار ہزار روپے کے کئی نوٹ تھے۔ قریب آ کر اس نے وہ نوٹ مجھے تھما دیئے۔ میں نے بریف کیس اس کے حوالے کر دیا۔ وہ خاموشی سے بریف کیس لے کر لوٹ گیا۔

"یہ پندرہ ہزار روپے ہیں۔ یقیناً تم اس انعام پر خوش ہو گے شہباز!" حمزہ خان کی آواز آئی۔

"جی جناب، شکریہ!" میں نے کہا۔

"وعدہ کے مطابق تمہارے قیام کا بندوبست کر دیا گیا ہے اور تمہیں کار بھی مل چکی ہے۔ کیا تم اس سے مطمئن ہو؟" حمزہ خان نے پوچھا۔

میں نے پندرہ ہزار روپے کوٹ کی جیب میں رکھتے ہوئے حمزہ خان کے اس سوال کا جواب بھی اقرار میں دیا۔

"تم نے مجھ سے ایک ماہ کی مہلت مانگی تھی جو تمہیں دے دی ہے۔ اس کے بعد تمہیں کام شروع کرنا ہے۔"

"مجھے اپنا وعدہ یاد ہے جناب!" میں نے یقین دہانی کرائی۔

"ٹھیک ہے، اب تم جا سکتے ہو۔" حمزہ خان نے مجھے جانے کی اجازت دے دی۔

"اب تم پوری طرح آزاد ہو، جہاں جی چاہے آؤ جاؤ اور جو چاہو کرو، لیکن اس عرصے میں کسی اشد ضرورت کے بغیر فون پر بھی سے رابطہ نہ کرنا، نہ یہاں آنا۔ ہاں تمہیں اس شہر سے کہیں اور جانے کی اجازت نہیں ہے۔"

حمزہ خان کی طرف سے لگائی جانے والی پابندی کی میں نے وجہ نہیں پوچھی۔ میں بہر حال اس کا ملازم تھا۔ خواہ وہ مجھ سے فی الحال کوئی کام نہ لیتا مگر یہ پابندی لگا سکتا تھا کہ میں اس شہر میں رہوں۔ اسے مطمئن کرنے کے لیے میں بولا۔ "آپ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں ہوگی جناب!"

"مجھے تم سے اسی بات کی امید تھی شہباز! خدا حافظ۔"

یہ سنتے ہی میں اٹھ کھڑا ہوا اور اس ہال کمرے سے نکل کر راہداری عبور کی۔ وہ صدر دروازہ دستک دیے بغیر میرے لیے کھول دیا گیا تھا۔ دروازے سے نکلتے ہوئے میری نگاہ ایک طرف دیوار پر لگے سبز بلب پر پڑی۔ اسے میں نے اسی لمحے بجھتے دیکھا تھا۔ اب میں سمجھ گیا کہ صدر دروازہ دستک کے بغیر کیسے کھل گیا تھا۔ یقیناً مسلح محافظ اسی وقت صدر دروازہ کھولتے ہوں گے جب سبز بلب جل جاتا ہوگا۔

برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر میں اس طرف بڑھ گیا جہاں سفید شراڈ کھڑی ہوئی تھی سوز دیا کوئی اور شخص پھاٹک پر متعین چوکیدار کے سوا مجھے وہاں نظر نہیں آیا۔ کار کے قریب کر میں نے جیب سے چابی نکالی اور قفل کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گھڑی میں وق دیکھا تو گیارہ بج رہے تھے۔ صدر پہنچ کر ارشاد سے ملنے کا وقت ابھی باقی تھا، لیکن میر لیے مشکل یہ تھی کہ وہاں سے مجھے صدر پہنچنے کا راستہ معلوم نہیں تھا۔

آخر اس مسئلے کا ایک حل میرے ذہن میں آ ہی گیا۔ میں نے کار اسٹارٹ کی پھاٹک کی طرف بڑھا۔ مسلح چوکیدار نے فوراً ہی پھاٹک کھول دیا۔ ڈیفنس سے کلفٹن ت میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ پھر وہاں سے صدر تک کا راستہ میرے ذہن میں محفوظ تھا۔ سو نے اسی پر عمل کیا۔

کار خاصی تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتا ہوا میں کلفٹن پہنچ گیا۔ پھر وہاں سے میں صدر کی راہ لی۔

مقررہ وقت سے بہت پہلے یعنی پونے بارہ بجے تک میں صدر پہنچنے میں کامیاب گیا۔ یہ میں پہلے سوچ چکا تھا کہ مجھے ارشاد کو کیا جواب دینا ہے! فی الحال مجھے یہی اپنے ناہید کے لیے بہتر معلوم ہوا کہ ہم کراچی میں رہیں۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ ارشا پیشکش کو قبول نہ کیا جاتا۔ موجودہ حالات میں میرے لیے دوسرا راستہ حمزہ خان کی ملازم میں رہنا تھا۔ یہ راستہ بھی میں نے اس لئے اپنایا تھا کہ ایک ہی ماہ کے لیے سہی مجھے سوچنے کا موقع مل جائے۔ حمزہ خان کے مذموم کاروبار میں اس کا ساتھ دینا میرا مقصد تھا۔ اس سلسلے میں مجھے جس شخص کی طرف سے کچھ خطرہ تھا، وہ اب میرے ہاتھوں مارا جا تھا۔ گذشتہ شب پیش آنے والے واقعے کے متعلق ایک بیان حمزہ خان کا تھا کہ کمال نے سے ذاتی دشمنی کی بنا پر ایسا کیا تھا۔ اس بیان کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ یہ تھا۔ دوسرا بیان ارشاد کا تھا۔ اس کے خیال میں کمال بہ ذات خود یہ قدم نہیں اٹھا سکتا تھا اس میں حمزہ خان کی مرضی شامل تھی۔ یہ بات بھی ایسی نہیں تھی کہ میری سمجھ میں نہ آتی۔ ا نے اس کی وجہ بھی مجھے بتا دی تھی۔ حقیقت کیا تھی، کیا نہیں، میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ میں بھی سوچ رہا تھا کہ اپنے ہاتھوں کمال کے قتل کا ذکر کروں یا نہ کروں؟

میں انہی خیالوں میں کھویا ہوا صدر کے اس ہوٹل تک پہنچا جہاں ارشاد میرا منتظر دستک دینے پر کمرے کا دروازہ پروین نے کھولا۔ دروازہ بند کر کے وہ میرے بالکل قریب آ کر کہنے لگی۔ "میں تمہیں آج ایک راز کی بات بتانا چاہتی ہوں کہ

کہ میں...... ارشاد کی بیوی نہیں ہوں۔"

"معلوم ہے مجھے۔ پھر؟" میں قدرے پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔

"شہباز! کیا تمہارے سینے میں دل نہیں ہے؟" وہ پھر میرے قریب آ گئی۔

"دل تو ہے مگر وہ کسی اور کے لیے دھڑکتا ہے۔"

"بڑے بے رحم ہو تم!" اس نے ایک ادا سے کہا۔

اس وقت پروین مجسم خوشبو بنی ہوئی تھی۔ بلاشبہ وہ ایک حسین عورت تھی، لیکن میں نے اس کی بانہوں کو جھٹک دیا۔ میں اسے حد سے گزر جانے کی اجازت کیسے دے دیتا؟ وہ مجھ سے ٹھکرائے جانے کا انتقام لینا چاہتی تھی مگر میں نے اسے یہ موقع فراہم نہیں کیا۔

اسی لمحے واش روم کا دروازہ کھلا اور ارشاد باہر آیا۔ پروین پیچھے ہٹ گئی۔ وہ یقیناً اس فن سے واقف تھی کہ کسی کو کس طرح ہوش و خرد سے بیگانہ کیا جا سکتا ہے! اس کی چشم خمار پرور، بدن کی مینا اور لبوں کے ساغر کسی زاہد خشک کو بھی بہکنے پر مجبور کر سکتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک چلتا پھرتا میخانہ تھی۔ اس کے تیز اور بھرپور نشے سے انکار ممکن ہی نہیں تھا۔ اس جیسی کسی عورت کو ٹھکرا دینے کا حوصلہ ہر ایک کے بس میں نہیں ہوتا۔ یہ خودستائی نہیں، واقعہ ہے کہ میں نے یہ حوصلہ کیا تھا۔ اس کے باوجود پروین نے ہار نہیں مانی۔ وہ مجھ پر نظروں کے تیر برساتی رہی۔ اب ہم تینوں کمرے میں موجود کرسیوں پر بیٹھ چکے تھے۔ ارشاد نے چائے کے لیے آرڈر دے دیا تھا۔

پروین کچھ کہنے ہی والی تھی کہ ارشاد بول اٹھا۔ "وقت کم ہے پروین! شہباز سے کام کی بات کرنے دو۔"

"تو میں نے کب روکا ہے!" پروین اٹھلا کر بولی۔ "مجھے یقین ہے کہ شہباز کو اب ہمارے ساتھ چلنے سے انکار نہیں ہوگا۔"

"تمہارا خیال غلط ہے پروین!" میں نے کہا۔

"تو پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انکار کرو کہ تم ہمارے ساتھ نہیں چل رہے۔"

"تم خاموش بیٹھو پروین!" ارشاد بولا۔ "پہلے تو مجھے شہباز سے یہ پوچھنا ہے کہ حمزہ خان سے کیا بات ہوئی!"

"وہ تو خیر میں تمہیں بتا دوں گا ارشاد، مگر مجھے افسوس ہے کہ تمہاری پیش کش میں فی الحال قبول نہیں کر سکتا۔" میں نے واضح الفاظ میں کہہ دیا۔

''کوئی بات نہیں دوست! جیسا کہ میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میر
دروازے تمہارے لیے ہمیشہ کھلے ملیں گے۔'' ارشاد نے یہ کہہ کر اپنے کوٹ کی جیب
ہاتھ ڈالا اور اپنا وزیٹنگ کارڈ مجھے دیتے ہوئے بولا۔ ''میری پیش کش سے قطع نظر اگر
زندگی کے کسی بھی مرحلے پر تمہیں کسی دوست کی ضرورت محسوس ہو تو بلا جھجک میرے پا
چلے آنا۔ اس کارڈ میں میرے دفتر اور گھر کے پتے موجود ہیں اور ٹیلیفون نمبر بھی ہیں۔ ا
میں پھر کراچی آیا تو تم سے ضرور ملوں گا۔ تمہارا پتہ اور ٹیلی فون نمبر مجھے معلوم ہو گیا ہے۔''
میں یہ سن کر چونک اٹھا۔ ''تمہیں کس سے معلوم ہوا میرا پتا اور فون نمبر؟'' میں
سوال کیا۔

''ابھی تمہارے آنے سے کچھ دیر پہلے فون پر حمزہ خان کے دست راست کمال
میری بات ہو رہی تھی۔ مجھے اسی سے تمہارا پتا اور فون نمبر......''

یہ سنتے ہی میں اچھل پڑا اور درمیان ہی میں ارشاد کی بات کاٹ کر بول اٹھا۔ ''
دیر پہلے کی بات ہے؟''

''زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ پہلے کمال نے فون کیا تھا۔'' ارشاد نے بتایا۔

''تمہیں یقین ہے کہ وہ کمال ہی تھا؟'' میں نے پوچھا کیوں کہ میرے نزدیک
ناممکن بات تھی۔

''ہاں ہاں، پہلے بھی متعدد بار فون پر اس سے میری بات ہو چکی ہے۔ میں ا
آواز اچھی طرح پہچانتا ہوں۔'' ارشاد زور دے کر بولا۔

''ارشاد! تمہیں یقیناً دھوکا ہوا ہے۔ وہ کمال نہیں ہو سکتا! کوئی اور ہو گا وہ!''
پُریقین لہجے میں کہنے لگا۔

''اس نے مجھ سے آئندہ ٹرپ کے بارے میں پوچھا تھا۔ مجھ سے اس سلسلے میر
خان یا اس کے دست راست کمال کے سوا کوئی اور معلوم نہیں کر سکتا تھا! لیکن یہ بات سمجھ
نہیں آئی کہ تم اس بات پر کیوں بہ ضد ہو، مجھ سے فون پر بات کرنے والا کمال نہیں کو
تھا! یہ معاملہ کیا ہے؟''

میں چکرا کر رہ گیا۔ ارشاد کو بھلا مجھ سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی کہ کمال
اسے فون کیا تھا؟ اگر وہ سچ بول رہا تھا تو یہ ممکن کیسے تھا؟ ڈیفنس سے ارشاد کے پاس
میں مجھے پون گھنٹا لگا تھا اور میں کمال کو اس سے پہلے قتل کر چکا تھا۔ پھر وہ پندرہ منٹ پہلے
پر ارشاد سے کس طرح بات کر سکتا تھا؟ ان حالات میں ارشاد کو حقیقت سے آگاہ کرنا

نہیں؟ ابھی میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا تھا کہ کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔

''پروین! جاؤ دیکھو، ویٹر چائے لے کر آیا ہوگا۔ دروازہ کھول دو۔'' ارشاد نے
پروین سے کہا!

''پروین! جاؤ دیکھو، ویٹر چائے لے کر آیا ہوگا۔ دروازہ کھول دو۔'' ارشاد نے
پروین سے کہا۔

پروین کرسی سے اٹھی اور دروازہ کھولنے چل گئی۔ ٹی ٹرالی لے کر آنے والا ویٹر ہی
تھا۔ ویٹر چلا گیا تو ارشاد نے مجھے مخاطب کیا۔ ''شہباز! تم نے میرے سوال کا جواب نہیں
دیا۔ کمال نے بھی میرے ایک سوال کا جواب نہیں دیا تھا۔ جب میں نے اس سے تمہارا پتا
معلوم کیا تو وہ بولا، اگر میں تم سے فون پر بات کروں تو یہ نہ بتاؤں کہ تمہارا پتا یا فون نمبر مجھے
اس سے معلوم ہوا ہے۔ میں نے کمال سے اس کی وجہ پوچھی تو وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ پھر
اس نے دوبارہ اپنی بات دہرا کے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ مجھے اس پر بڑی حیرت ہوئی
اور اب تم مجھے حیرت میں مبتلا کر رہے ہو! آخر بات کیا ہے؟ کچھ تو بتاؤ! ویسے بھی اب ہماری
روانگی میں کم وقت رہ گیا ہے۔ ابھی ایئر پورٹ بھی پہنچنا ہے۔''

اس دوران میں پروین چائے کے کپ میرے اور ارشاد کے سامنے رکھ چکی تھی۔
میں نے چائے کا کپ اٹھا کر ایک گھونٹ لیا اور ارشاد کو کچھ نہ بتانے کا فیصلہ کیا۔ اس کا ایک
سبب پروین بھی تھی۔ میں بلاوجہ کیوں ان دونوں کے سامنے اعتراف قتل کر لیتا؟

میں نے یہ بات برابر کرنے کے لیے فوری طور پر ارشاد کو ایک کہانی گھڑ کر سنا دی۔
''حمزہ خان سے میں نے کمال کی شکایت کر دی تھی استفسار پر کمال نے گزشتہ رات کو پیش
آنے والے واقعے کا اعتراف کر کے مجھ سے معافی مانگ لی تھی۔ کمال نے مجھ سے اپنی
توہین و ذلت کا انتقام لینے کی غرض سے یہ قدم اٹھایا تھا۔ حمزہ خان کا دست راست ہونے کے
سبب پولیس کے محکمے میں بھی اس کا اثر و رسوخ ہے۔ حمزہ خان نے کمال کو یہ تاکید کی تھی کہ وہ
میرے پتے یا فون نمبر کا سراغ لگانے کی کوشش نہ کرے۔ مجھے اسی لئے یقین نہیں آ رہا تھا کہ
میرا پتا اور فون نمبر تمہیں کمال ہی نے بتایا ہوگا۔ اتنی جلدی اس نے کس طرح معلوم کر لیا،
مجھے تو اس بات پر حیرت ہے، وہ بھی ایسی صورت میں جب کہ حمزہ خان نے اسے ایسا کرنے
سے منع کیا تھا!''

''اب تم نے اصل بات بتائی نا!'' ارشاد بولا۔ ''کمال نے اسی وجہ سے مجھے تاکید کی
تھی کہ تمہیں نہ بتاؤں، تمہارا پتا اور فون نمبر کس نے دیا ہے! اس سے بہرحال ایک بات

ہو گئی شہباز کہ کمال تمہاری ٹوہ میں لگا ہوا ہے۔ تمہیں اس کی طرف سے محتا
ہنے کی ضرورت ہے۔"

ارشاد کی بات سن کر میں دل ہی دل میں ہنسا۔ وہ مجھے ایک ایسے شخص کی طرف
ہنے کی تاکید کر رہا تھا جسے میں خود موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔ اس کے باو
رے لیے الجھن کا سبب بنی رہی کہ ارشاد سے کمال کی آواز میں بات کرنے وا

اتنا اندازہ مجھے بہر حال تھا کہ کمال کی جگہ ارشاد سے بات کرنے والے حمزہ
ہاس آدمی ہی رہا ہو گا ورنہ اسے میرا پتہ اور فون نمبر کیسے معلوم ہوتا! میرے خیال
جہ یہی ممکن تھی کہ حمزہ خان کسی مصلحت کے تحت ابھی کمال کے قتل کو چھپانا چاہتا
آواز کی نقل کر لینا میری نظر میں مشکل تو تھا ناممکن نہیں۔ میں نے بہر حال ارش
مئن کر دیا کہ کمال کی طرف سے چوکنا رہوں گا۔ معاً مجھے ناہید کا خیال آیا۔ و
تھی اور مجھے اس سے جدا ہوئے کئی گھنٹے ہوئے تھے۔ میں نے اسے فون کیا تو
بجتی رہی۔ ناہید نے ریسیور نہیں اٹھایا۔ میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں
۔ وہ فلیٹ میں ہوتی تو ضرور ریسیور اٹھاتی۔ پھر وہ کہاں گئی؟ یہی ایک سوال
ذہن پر ضربیں لگانے لگا۔

☆======☆======☆

ابھی تک ریسیور میرے ہاتھ ہی میں تھا۔ میں نے سلسلہ منقطع نہیں کیا تھا
میں مجھے یہ خیال بھی آیا تھا کہ ناہید باورچی خانے یا واش روم میں ہو سکتی ہے
ہی دوسری طرف سے ریسیور اٹھا لیا گیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، ناہید
آواز سنائی دی۔ ''کیا تم گونگے ہو جو بولتے نہیں؟''

میں نے حیرت سے کہا۔ ''ہیلو ناہید! میں شہباز بول رہا ہوں۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو
؟'' میں نے پوچھا۔

''وہی جو آدھے گھنٹے کے اندر تین چار مرتبہ فون کر چکا ہے۔ میں یہ سوچ کر
ہوں کہ تم ہو گے، مگر بار بار ہیلو کہنے پر بھی وہ کچھ نہیں بولتا اور پھر لائن کا
اس بار تم نے فون کیا تو میں یہی سمجھی کہ پھر اسی نے فون کیا ہو گا۔ خیر خاک
سے بول رہے ہو؟''

''ارشاد کے ہوٹل سے بات کر رہا ہوں۔'' میں نے بتایا۔

''کب تک آ رہے ہو؟'' ناہید نے دریافت کیا۔

''بس یہاں سے چلنے ہی والا ہوں۔ اچھا خدا حافظ!'' میں نے یہ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

وقتی طور پر میں جس تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا، وہ ناہید سے بات کر کے ختم ہو گئی۔ سو میں نے سکون کا سانس لیا۔ میں نے ریسیور رکھا ہی تھا کہ ارشاد اٹھ کر میرے قریب آ گیا۔ پہلے اس نے روم سروس سے ٹی ٹرالی لے جانے کو کہا، پھر کاؤنٹر کا نمبر ملا کر کسی پورٹر کو بھیجنے کے لیے کہنے لگا۔ میں دیکھ چکا تھا کہ اس کا سامان تیار تھا۔ یوں بھی اب ساڑھے بارہ بجنے والے تھے۔

ارشاد نے بات کر لی تو میں اس سے مخاطب ہوا۔ ''اجازت ہے؟''

ارشاد نے مجھے گلے سے لگا لیا اور بولا۔ ''جن حالات میں تم سے ملاقات ہوئی وہ مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔''

''ہاں میں بھی تمہیں نہیں بھولوں گا۔'' جواباً میں نے بھی کہہ دیا۔

''اور مجھے؟'' اسی وقت پروین بول اٹھی۔

''تمہیں بھول جانے کی کوشش کروں گا۔'' میں یہ کہتے ہوئے مسکرا کر دروازے کی طرف بڑھا۔

''اور مجھے یقین ہے شہباز کہ تم اپنی اس کوشش میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکو گے۔'' پروین کے لہجے میں اعتماد تھا۔

میں نے ''خدا حافظ'' کہا اور رخصتی انداز میں ان دونوں کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلا دیا۔

وہ دونوں بھی ایک ساتھ بولے، خدا حافظ!

کمرے کا دروازہ کھول کر میں باہر نکل آیا۔ لفٹ کے ذریعے میں نیچے پہنچا اور پھر ہوٹل سے نکل کر اپنی کار کی طرف قدم بڑھانے لگا۔ ابھی تک میرا ذہن کمال کے خلاف توقع قتل میں الجھا ہوا تھا۔ ارشاد نے مجھے کمال کے بارے میں بتایا تھا کہ حمزہ خان کا دست راست تھا۔ حمزہ خان نے اپنے دست راست سے محروم ہو جانے کے باوجود کسی دکھ کا اظہار نہیں کیا تھا۔ میرے لیے یہ بات عجیب ہی تھی۔ کار ڈرائیو کرتے ہوئے میں سوچنے لگا، کیا حمزہ خان کی نظر میں انسانی زندگی کی کوئی اہمیت نہیں؟ اس نے محض میری ذہانت اور بہادری کا امتحان لینے کی خاطر ایک شخص کو قربان کر دیا تھا۔ آئندہ بھی وہ یہ خطرناک کھیل میرے ساتھ بھی تو کھیل سکتا تھا۔ اب تو مجھے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ اس کا کاروبار کیا ہے! ان

حالات میں یہی مناسب تھا کہ جلد از جلد اس کے چنگل سے نکل جاتا۔ میں انہی خیالوں میں کھویا ہوا کلفٹن پہنچ گیا۔ اپنی بلڈنگ کے کمپاؤنڈ میں کار کو ایک طرف پارک کر کے میں اترا اور کار کا دروازہ مقفل کیا، پھر اردگرد نظر ڈال کر اپنے فلیٹ کی طرف قدم بڑھا دیے۔

کال بیل کی آواز سن کر ناہید نے فوراً دروازہ نہیں کھولا حالانکہ میں نے اس کے قدموں کی چاپ سن لی تھی۔

''شکر ہے کہ تم آ گئے۔'' ناہید نے دروازہ کھولتے ہی کہا۔

''کیوں، کیا ہوا؟'' میں نے اندر قدم رکھتے ہوئے پوچھا۔

''یہ ٹیلی فون تو عذاب بن گیا ہے۔ ہر پانچ منٹ کے بعد گھنٹی بجنے لگتی ہے۔'' ناہید نے بتایا، پھر دروازہ بند کر کے میرے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

''اب گھنٹی بجی تو میں ریسیور اٹھاؤں گا۔'' میں بولا۔

''تم کپڑے بدل لو تو پھر کھانا کھاتے ہیں۔'' ناہید کہنے لگی۔ ''میں نے کھانا پکا لیا ہے۔ فریز کھول کر دیکھا تو اس میں گوشت بھی رکھا تھا۔''

ہمارے سوٹ کیس سوزو نے اس کمرے میں رکھے تھے جہاں ڈبل بیڈ پڑا تھا۔ وہاں مجھے سوٹ کیس نظر نہ آئے تو میں نے دوسرے کمرے کا رخ کیا۔ میں یہ دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ ناہید اس کمرے کو بطور خواب گاہ استعمال کرنا نہیں چاہتی اور اسی نے سوٹ کیس دوسرے کمرے میں رکھے ہوں گے۔

دوسرے کمرے میں مجھے سوٹ کیس رکھے ہوئے دکھائی دے گئے۔ اپنا سوٹ کیس کھول کر میں نے ایک شلوار سوٹ نکالا اور واش روم میں چلا گیا۔ کپڑے بدلتے ہوئے میری نگاہ فلش ٹینک پر پڑی تو مجھے گزشتہ رات کا واقعہ یاد آ گیا۔ کپڑے بدلتے ہی میں نے فلش ٹینک کا ڈھکنا اٹھا کر اس کا جائزہ لیا۔ پھر میں واش روم کی اچھی طرح تلاشی لے کر باہر نکل آیا۔ مجھے وہاں کوئی قابل اعتراض شے نظر نہیں آئی تھی۔ میرے ذہن میں جس خدشے نے سر ابھارا تھا، اس سے میں نے ناہید کو بھی بے خبر نہیں رکھا، میں پورے فلیٹ کی تلاشی لینا چاہتا تھا۔ مجھے ارشاد کے یہ الفاظ یاد تھے کہ حمزہ خان اپنے آدمیوں کو بے نکیل نہیں چھوڑتا۔

ابھی ہم باورچی خانے کی تلاشی لینے کے لیے وہاں داخل ہوئے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

''دیکھ لو، پھر آ گیا اس گونگے کا فون!'' ناہید غصیلی آواز میں بولی۔

''میں دیکھتا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں تیز قدمی سے اس کمرے کی طرف بڑھ گیا جہاں

ٹیلی فون سیٹ رکھا تھا۔ کمرے میں داخل ہو کر میں نے ریسیور اٹھا لیا اور بولا۔ ''ہیلو!'' دوسری طرف خاموشی چھائی رہی تو میں نے جھنجلا کر کہا۔ ''بولو نا یار، کون ہو تم؟'' اسی وقت لائن کاٹ دی گئی۔ مجھے ریسیور رکھنا پڑا۔

میں واپس ناہید کے پاس باورچی خانے میں پہنچا تو اس نے پوچھا۔ ''کچھ پتہ چلا، فون کرنے والا کون تھا؟''

''نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''لیکن میں ایک بات ضرور سوچ رہا ہوں۔ یہاں کا فون نمبر حمزہ خان اور اس کے آدمیوں ہی کو معلوم ہے۔ ایسی صورت میں ان کے سوا اور کون یہاں فون کر سکتا ہے!''

''مگر اس کا کوئی مقصد بھی تو ہوا!'' ناہید بولی۔

''مقصد!'' میں بڑبڑایا اور پھر فون کرنے کا مقصد میری سمجھ میں آ گیا۔ میں نے جو نتیجہ اخذ کیا تھا، اگر واقعی ویسا ہی تھا تو اب فون کی گھنٹی نہیں بجنی چاہیے تھی۔ اس کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے ناہید سے کہا۔ ''اب فون نہیں آئے گا۔''

''یہ تم کس طرح یقین سے کہہ سکتے ہو؟'' یہ سوال کرتے ہوئے ناہید کے لہجے میں حیرت تھی۔

''حمزہ خان یا اس کے آدمی یہ معلوم کرنا چاہتے ہوں گے کہ میں یہاں پہنچا کہ نہیں! اب فون پر میری آواز سن کر انہیں میرے یہاں پہنچنے کا پتا چل گیا ہوگا۔'' میرے ذہن میں جو بات آئی تھی، وہ میں نے ناہید کو بھی بتا دی۔ ''میری طرف سے حمزہ خان بہر حال غافل رہنا نہیں چاہتا ہوگا۔''

''جو کچھ بھی ہو شہباز ہمیں اس خطرناک شخص کے جال سے نکلنا ہی پڑے گا۔'' ناہید فکرمند سی نظر آنے لگی۔

''وہ تو خیر طے ہے، فی الحال تو ہمیں اس فلیٹ کی تلاشی لینی ہے۔'' میں بولا۔

''ابھی تم نے یہ بھی نہیں بتایا کہ حمزہ خان سے تمہاری کیا بات ہوئی!''

''بتا دوں گا وہ بھی!'' میں نے جھک کر ایک کیبنٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ کیبنٹ میں مرتبان رکھے تھے۔

پھر ناہید بھی میرا ہاتھ بٹانے لگی۔ پورے فلیٹ کی تلاشی لینے میں ہمیں زیادہ وقت نہیں لگا کیوں کہ ضروریات زندگی کے سامان اور فرنیچر کے سوا وہاں کچھ اور نہیں تھا۔ تمام الماریاں خالی پڑی تھیں۔ ان میں مجھے صرف ہینگر لٹکے ہوئے دکھائی دیے۔

"اب کھانا نکال لو!" میں مطمئن آواز میں بولا۔ "کھانا کھا کر ہم سوٹ کیسوں ۔
اپنا سامان نکال کر الماریوں میں رکھ دیں گے۔ کچھ دن تو ہمیں یہاں گزارنے ہیں نا!ا
طرح کوئی چیز نکالنے کے لیے ہمیں بار بار سوٹ کیس نہیں کھولنے پڑیں گے۔"

اقرار میں سر ہلا کر ناہید باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی اور میں کھانے کی میز
آ بیٹھا۔

اس روز پہلی بار میں نے ناہید کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھایا۔ کھانا خوش ذائقہ تھا۔ مٹ
نے اسی لیے تعریف کرنے میں بخل سے کام نہ لیا۔

گزشتہ رات ہم صرف چند گھنٹے سو پائے تھے۔ سیر ہو کر کھانا کھانے سے طبیعت ک
اور بوجھل ہو گئی۔ میں نے اسی لیے ناہید سے کہا۔ "کیا خیال ہے ناہید، کچھ دیر ہم سو نہ لیں
ہمیں یہاں کام ہی کیا ہے! سو کر اٹھنے کے بعد سامان سیٹ کر لیں گے۔"

"ہاں نیند تو مجھے آ رہی ہے، مگر حمزہ خان سے تمہاری گفتگو جاننے کی بے چینی ب
ہے۔" ناہید بولی۔

"دونوں میں سے ایک ہی کام ہو سکتا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "م
خیال ہے کہ فی الحال ہم سو جائیں تو اچھا ہے۔ باتیں کرنے کو بہت وقت ہے ہمار۔
پاس۔" ہم دونوں اٹھ کر اس کمرے میں آ گئے جہاں دو سنگل بیڈ پڑے تھے البتہ ٹیلی فو
برابر والے کمرے میں تھا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی پھر نہیں ب
تھی۔ دونوں ہی بیڈوں پر چادریں، تکیے اور کمبل موجود تھے۔ ہم ان پر دراز ہو گئے
حالانکہ خنکی نہیں تھی، پھر بھی ناہید نے اپنے جسم پر ایک چادر کھینچ لی۔ میں نے چادر نہیں
اوڑھی اور آنکھیں بند کر لیں۔

ذرا ہی دیر میں میری آنکھ لگ گئی۔ اس کی وجہ گزشتہ شب کی بے خوابی ہی تھی۔ پھر
شام ہی کو سو کر اٹھے۔ پہلے میں ہی جاگا تھا۔ سامنے ہی لگے وال کلاک پر میری نگاہ پڑی
ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ میں نے ناہید کو آواز دی تو وہ بھی اٹھ بیٹھی۔

باری باری ہم دونوں نے واش روم میں جا کر منہ دھویا اور پھر میرے کہنے پر ناہ
چائے بنانے چلی گئی۔ دودھ کے پیکٹ، انڈے، مکھن، جام، جیلی سبھی چیزیں فریج میں تھیں
اس لیے ناہید کو کسی طرح کی کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔ میں کمرے میں بستر پر
دراز تھا کہ ناہید وہیں چائے بنا کر لے آئی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس کے ہاتھ سے چائے
کی پیالی لیتے ہوئے بولا۔ "میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا، کبھی ایسا دن بھی آئے گا

چوہدری اسلم کی نوجوان و حسین بیٹی مجھے چائے بنا کر پلائے گی۔"

"کون چوہدری اسلم؟" ناہید نے بے نیازی سے کہا۔ "میں تو اس نام کے کسی آدمی
کو نہیں جانتی۔"

"ناہید! اس طرح خون کے رشتے تو نہیں ٹوٹ جاتے۔"

"لیکن میں اپنے ماضی سے ہر رشتہ توڑ چکی ہوں شہباز! اب تمہی میرا ماضی بھی ہو،
حال اور مستقبل بھی!" ناہید یہ کہتے ہوئے میرے ہی قریب بیڈ پر بیٹھ گئی۔ میں چائے کے
گھونٹ لیتے ہوئے سوچنے لگا کہ ناہید کو سب کچھ بتا دینا چاہیے یا نہیں؟ میرے ہاتھوں کمال
کا قتل بہر صورت کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔

"تم کن سوچوں میں گم ہو؟" مجھے خاموش دیکھ کر ناہید پوچھنے لگی۔

"کوئی خاص بات نہیں۔" میں نے چونک کر جواب دیا۔

"کچھ تو ہے ورنہ تم اتنے چپ چپ نہ ہوتے! کیا حمزہ خان سے کوئی ایسی بات ہوئی
ہے جو تم مجھے بتانا نہیں چاہتے؟"

"تم..... تم تو میرے ہی وجود کا ایک حصہ ہو ناہید!" میں جذباتی ہو گیا۔ "اور آدمی
اپنے آپ سے کیا چھپا سکتا ہے!" پھر حمزہ خان کی کوٹھی میں جو کچھ ہوا تھا، میں نے سب کچھ
ناہید کو بتا دیا اور آخر میں کہا۔ "یقین کرو ناہید اگر میں اسے موت کے گھاٹ نہ اتارتا تو وہ
مجھے مار دیتا۔"

"میری نظر میں تم قاتل نہیں ہو شہباز! تم نے ایک قاتل سے اپنی جان بچائی ہے۔
اس سلسلے میں تمہیں نہ تو میرے سامنے اپنی صفائی پیش کرنی چاہیے، نہ اپنے ضمیر پر کوئی بوجھ
لینے کی ضرورت ہے۔ میں چند ہی روز میں تمہیں اچھی طرح جان چکی ہوں، بالکل اس طرح
جیسے اپنے آپ کو جانتی ہوں۔ تم کسی کو قتل نہیں کر سکتے! مجھے تمہارے اوپر پورا بھروسہ ہے
شہباز!" ناہید نے پُر اعتماد آواز میں یہ کہتے ہوئے میرا ہاتھ تھام لیا۔

میرے دل سے ایک بوجھ سا ہٹ گیا۔ میں ناحق اندیشوں کا شکار ہو رہا تھا۔ چائے
کی خالی پیالیاں ناہید باورچی خانے میں رکھ آئی تو ہم دونوں مل کر سوٹ کیسوں کا سامان
الماریوں میں رکھنے لگے۔ کمرے میں لکڑی کی دو الماریاں تھیں۔ ان میں سے ایک میں
نے اور دوسری ناہید نے لے لی۔

میرا سوٹ کیس خالی ہو چکا تھا۔ اب میرے ہاتھ میں وظائف والی ڈائری تھی۔ میں
اسے بھی الماری میں رکھنے والا تھا کہ ناہید بول اٹھی۔ "اسے باہر ہی رہنے دو شہباز!"

"وہ کس لئے؟ تم اسے دیکھ تو چکی ہو!" میں نے کہا۔

"بتا دوں گی، فی الحال تم یہ ڈائری میری مسہری کے سرہانے رکھ دو۔"

"تمہارے ارادے مجھے کچھ خطرناک معلوم ہو رہے ہیں۔" میں دھیرے سے ہ
کر بولا۔

"میرا کوئی خطرناک ارادہ نہیں۔"

"پھر بھی!" میں نے وضاحت چاہی۔

"دراصل اس ڈائری میں ایک ایسا وظیفہ لکھا ہوا ہے جس پر عمل کر کے ہم اُ
خطرناک آدمی کے چنگل سے نکل سکتے ہیں۔ میں تمہاری غیر موجودگی میں اس پر خاصا غو
خوض کر چکی ہوں۔ ہمیں جو مہلت ملی ہے، اسے گنوانا نہیں چاہئے۔" ناہید نے یہ کہتے ہو
الماری بند کر دی۔ وہ اپنا سامان الماری میں رکھ چکی تھی۔ میں نے ڈائری کو باہر ہی ر
دیا۔

"تم نے جو سوچا ہے، کیا مجھے نہیں بتاؤ گی؟" میں نے ناہید سے سوال کیا۔

"کیوں نہیں!" وہ میرے قریب آ گئی اور میرے ہاتھ سے ڈائری لے لی، پھر ا
نے ڈائری کے اوراق پلٹنے شروع کر دیئے۔

میں سمجھ گیا کہ ناہید کو کسی خاص وظیفے کی تلاش ہے اس لیے بولا۔ "بیٹھ کر اطمینان۔
ڈائری دیکھ لو۔" یہ کہتے ہوئے میں بیڈ پر بیٹھ گیا۔

ناہید نے بھی میری تقلید کی، وہ میرے بالکل ہی قریب بیٹھی تھی اس لیے میری نظر
بھی ڈائری کے صفحات پر تھیں۔ میں وظیفوں کے اوپر لکھے ہوئے عنوانات پڑھتا جا رہا تھ
ذرا ہی دیر میں ناہید کو مطلوبہ وظیفہ مل گیا۔ اس نے ڈائری کے اوراق پلٹنے بند کر دیئے۔

"وظیفہ کمی بیشئ عمر!" میں اس وظیفے کا عنوان دیکھ کر حیرت سے بولا۔ "اس وظ
پر تو ہم پہلے بھی گفتگو کر چکے ہیں، ناہید! یہ تو بہت خطرناک ہے۔"

"معلوم ہے مجھے۔" ناہید پُرسکون آواز میں کہنے لگی۔ "مگر شہباز، ہمیں حمزہ خان
گرفت سے نکلنے کے لیے یہ خطرہ مول لینا ہی پڑے گا۔ ویسے اس وقت میں وظیفہ پڑھنے
شرائط میں ایک خاص بات دیکھنا چاہتی ہوں، جہاں تک مجھے یاد ہے، وظیفہ پڑھنے
لیے کوئی ایسی شرط نہیں ہے کہ دو افراد ایک ساتھ ایک جگہ یہ وظیفہ نہیں پڑھ سکتے۔"

"لیکن اس سے مقصد کیا ہے تمہارا؟" میں نے دریافت کیا۔

"پہلے تم مجھے ڈائری میں درج عبارت پڑھ تو لینے دو، باقی باتیں بعد میں ہو جا

گی۔"

میں خاموش ہو گیا اور وہ بہ غور عبارت پڑھنے لگی۔ جب وہ عبارت پڑھ چکی تو اس
کے چہرے سے دبے دبے سے جوش کا اظہار ہونے لگا۔

"مجھے ٹھیک ہی یاد تھا شہباز! وظیفے میں ایسی کوئی شرط نہیں۔" ناہید کے لہجے سے خوشی
جھلک رہی تھی۔ پھر اس نے خود ہی کچھ پوچھے بغیر کہنا شروع کیا۔ "شہباز! میں اور تم ایک ہی
کشتی میں سوار ہیں۔ جو خطرہ تمہارے لیے ہے، میں بھی اس کا سامنا کروں گی۔ یہ تم بھی
جانتے ہو اور میں بھی کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ پھر کیوں نہ ہم ایک
ساتھ ہی یہ وظیفہ پڑھنا شروع کر دیں۔ اگر کوئی خطرہ ہوا تو ہم دونوں ہی کے لیے ہوگا۔"

"ہرگز نہیں ناہید! یہ وظیفہ پڑھ کر میں اپنی زندگی تو خطرے میں ڈال سکتا ہوں لیکن
تمہاری زندگی کو داؤ پر نہیں لگا سکتا!" میں فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

"تم شاید یہ بھول رہے ہو شہباز کہ صرف تمہیں یہ پُراسرار قوت حاصل ہو گئی تو اس
سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔"

"وہ کیسے؟" میں نے سوال کیا۔

"ایسے شہباز کہ تم تن تنہا تو حمزہ خان کے چنگل سے نہیں نکلو گے، ظاہر ہے مجھے بھی
اپنے ساتھ لے جاؤ گے۔ ایسی صورت میں میرے ذریعے حمزہ خان کے آدمی بہت آسانی
سے تم تک پہنچ جائیں گے۔ اگر بدلی ہوئی شکل یا عمر کے سبب وہ تمہیں نہ پہچان سکے تو تمہارا
سراغ لگانے کی خاطر مجھے اپنی گرفت میں لے لیں گے۔ اگر ایسا ہوا تو تم کیا کرو گے؟ میری
وجہ سے تم ہمیشہ خطرے کا شکار رہو گے۔ بولو، کیا میں غلط کہہ رہی ہوں۔"

ناہید کی بات سن کر میں لاجواب سا ہو گیا۔ اس کا اندیشہ غلط نہیں تھا۔

"شہباز!" مجھے خاموش دیکھ کر وہ پھر بولی۔ "تمہارے ذہن سے غالباً ایک اور
بات نکل گئی ہے ایک اور شخص بھی تمہاری اور میری جان کا دشمن ہے۔ چوہدری اسلم کے
سفاک کارندوں سے بچنا بھی تو ہمارے لیے ضروری ہے۔ وہ بھی تو ہمیں شہروں شہروں
تلاش کرتے پھر رہے ہوں گے۔ تم اپنی عمر کم یا زیادہ کر کے ان کی نظروں سے چھپ گئے تو
میں کیسے بچوں گی؟ ضروری تو نہیں وہ سامنے آ کر ہی مجھ پر حملہ آور ہوں۔ دور رہ کر بھی تو وہ
مجھے گولی کا نشانہ بنا سکتے ہیں!"

"خدا نہ کرے۔" میں بے ساختہ بول اٹھا۔ "تم ایسی باتیں کیوں کر رہی ہو ناہید؟"

"اس لئے شہباز کہ تم حقائق کو اچھی طرح سمجھ سکو۔" ناہید نے کہا۔ "ہمارے لیے یہ

ایک سنہری موقع ہے۔ تمہیں حمزہ خان نے ایک مہینے کی مہلت دی ہے جس میں سے آج دن گزر چکا ہے۔ وظیفے کی مدت اکیس دن ہے۔ اگر ہم کل ہی سے وظیفہ پڑھنا شروع دیں تو ایک مہینے سے پہلے ہی وظیفہ پورا ہو سکتا ہے۔ تمہیں اس عرصے میں کچھ کرنا بھی نہو ہے، پھر وظیفہ شروع کرنے میں کیا دشواری ہے؟''

ناہید کے پیہم اصرار نے مجھے الجھن میں ڈال دیا۔ میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھ وظیفے کی شرائط میں سے ایک شرط پابندی وقت کے ساتھ پانچوں وقت کی نمازیں پڑھنا تھا۔ اس فلیٹ میں کوئی جانماز نہیں تھی۔ میں ابھی تذبذب کا شکار ہی تھا کہ ناہید نے میر توجہ اپنی طرف مبذول کرائی۔ میں نے کہا۔ ''ہاں بولو!''

''تم جا کر دو جانمازیں تو خرید لاؤ شہباز! ہم کل ہی صبح سے نماز پڑھنی شروع دیتے ہیں۔'' ناہید بولی۔

''ہمیں صبح فجر کے وقت جگائے گا کون؟'' میں کسی نہ کسی طرح اس معاملے کو ٹ چاہتا تھا۔ کچھ اور نہیں تو مجھے یہی بہانہ سوجھ گیا۔

''صرف ایک ہی دن کی تو بات ہے۔ پھر زوال کا وقت گزرنے سے نمازِ فجر ت ہمیں وظیفہ پڑھنے کے لیے جاگنا ہی ہوگا۔'' ناہید نے جواب دیا۔ ''فجر کی نماز پڑھ کر نا کے بعد ہم سو جایا کریں گے۔ دوپہر ایک بجے تک سو لئے تو بہت ہے۔ ہماری نیند پوری جایا کرے گی۔ رہا دو وقت کا کھانا تو سالن کسی بھی روز پکا کر کئی دن کے لیے فریزر میں رکھ سکتا ہے۔ دو افراد کے لئے روٹیاں ڈالنا کون سا مسئلہ ہے! اس سے قطع نظر پابندی ساتھ نماز پڑھنے کی شرط وظیفہ شروع کرنے کے بعد ہے۔ وظیفہ ہم کل رات سے پڑ شروع کریں گے۔ میں تو احتیاطاً کل ہی صبح سے نماز پڑھنا چاہتی تھی۔ تمہارے سوال کا ا جواب یہ بھی ہے کہ تم کوئی ٹائم پیس خرید لاؤ۔ اس طرح ہم اطمینان سے سو سکتے ہیں۔ آئ بھی یہ ٹائم پیس ہمارے کام آ سکتا ہے۔''

پیسوں کی کوئی کمی نہیں تھی کہ میں یہ عذر کر دیتا۔ مجھے بازار جانے کے لیے تیار ہونا پڑا۔ سوز و مجھے مارکیٹ دکھا ہی چکا تھا جو وہاں سے زیادہ دور نہیں تھی۔ اس کے باوجود نے کار ہی میں مارکیٹ تک جانا بہتر سمجھا۔ راستے میں مجھے خیال آیا کہ بستروں پر بچھا کے لیے چادریں بھی خرید لوں۔ دونوں بستروں پر جو چادریں بچھی ہوئی تھیں، ان کے مزید چادریں نہیں تھیں۔ وہ چادریں میلی ہو جاتیں تو بستروں پر ہم کیا بچھاتے! جلد مارکیٹ تک پہنچ گیا۔

مارکیٹ خاصی بڑی تھی۔ وہاں ضروریاتِ زندگی کی تمام ہی اشیاء کی دکانیں تھیں۔ مجھے جن چیزوں کی ضرورت تھی، آسانی سے مل گئیں۔ ہاں یہ چیزیں مجھے کچھ مہنگی ضرور لگیں۔ شاید اس کی وجہ وہ علاقہ تھا جہاں غالباً پیسے والے ہی رہتے تھے۔ میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ چراغ کے لیے روئی کی ضرورت بھی پڑے گی۔ میں نے اسی لئے روئی کا ایک پیکٹ بھی خرید لیا۔ چراغ کے واسطے تیل بھی درکار ہوتا، لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ باورچی خانے میں سرسوں کا تیل تھا یا نہیں! اگر ضرورت ہوتی تو آئندہ روز بھی تیل خریدا جا سکتا تھا۔ کسی کٹوری یا چھوٹے برتن میں تیل اور روئی کی بتی بنا کر ڈالی جا سکتی تھی۔ ذہنی طور پر بڑی حد تک اب میں وظیفہ پڑھنے پر آمادہ ہو چکا تھا ورنہ مجھے ایک ایک مطلوبہ چیز کا خیال نہ آتا۔ مارکیٹ سے لوٹ کر آنے کے بعد میں نے پہلے ناہید سے تیل ہی کے بارے میں پوچھا۔

پتا لگا کہ باورچی خانے میں سرسوں کا تیل موجود تھا۔ ناہید نے اسی وقت برتنوں میں سے ایک کٹوری بھی ڈھونڈ نکالی، پھر بڑی دلچسپی اور شوق کے ساتھ روئی کی ایک بتی بنائی، کٹوری میں تیل ڈالا اور چراغ جلا دیا۔

''تم تو ابھی سے اس طرح ساری تیاریاں کر رہی ہو جیسے اسی وقت وظیفہ شروع کرنا ہے۔'' میں ہنستے ہوئے بولا۔

''اچھا ہے نا! عین وقت پر تو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔'' وہ یہ کہتے ہوئے مسکرائی۔

''سوچ لو ناہید، اب بھی وقت ہے۔ تم ایک بڑے خطرے کو دعوت دے رہی ہو۔'' میں نے اپنی دانست میں اسے آخری بار سمجھایا۔

''خوب اچھی طرح سوچ لیا ہے شہباز!'' اس کی آواز سے اطمینان جھلک رہا تھا۔ ''ہماری نیت صاف ہے اور ہم کسی غلط ارادے سے یہ وظیفہ شروع نہیں کر رہے۔ اللہ نیتوں کا حال بخوبی جانتا ہے، اس سے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ہماری مدد کرے گا۔ ہمارا مقصد محض اپنی زندگی بچانا اور برائی کی راہ سے ہٹنا ہے۔ ظاہر ہے کہ حمزہ خان تمہیں برائی اور بدی کے راستے پر ڈالنا چاہتا ہے اور تم اس پہ راضی نہیں۔ پھر کیا ڈرنا!...... ارے ہاں یاد آیا، سالن تو میں نے دونوں وقت کے لیے پکا لیا تھا، لیکن ابھی روٹیاں بھی تو ڈالنی ہیں۔ تم جو چادریں خرید کر لائے ہو، انہیں میری الماری میں رکھ دو، میں باورچی خانے میں جا رہی ہوں۔''

''اور یہ ٹائم پیس بھی اندر کمرے ہی میں رکھ دیتا ہوں۔ رات کو سونے سے پہلے

الارم لگالیں گے۔'' میں اٹھتے ہوئے بولا۔ اس رات ناہید کھانا کھاتے ہی پھر وظائف ڈائری کھول کر بیٹھ گئی۔

''کیا پھر کوئی خاص بات دیکھ رہی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔ وظیفے کے الفاظ یاد کر رہی ہوں۔'' ناہید نے بتایا۔ ''مجھے یہ الفاظ یا جائیں تو تم بھی یاد کر لینا۔''

دوسرے دن صبح کیوں کہ ہمیں جلدی اٹھنا تھا اس لیے دیر تک نہیں جاگے۔ میں صبح ساڑھے پانچ بجے کا الارم لگا دیا تھا۔ یوں بھی مجھے صبح جلدی ہی اٹھنے کی عادت تھی جب سے گاؤں چھوٹا سونے اور جاگنے کا کوئی وقت نہیں رہا تھا۔ پے در پے پیش آنے وا واقعات سے اب کہیں جا کے نجات ملی تھی۔ رات کو میں بہت سکون سے سویا اس لئے الارم کی آواز سنتے ہی میری آنکھ کھل گئی۔ ناہید بھی جاگ اٹھی۔ ہم دونوں ہی نے وضو کر نماز پڑھنے میں دیر نہیں لگائی۔ نماز پڑھ کر میرے دل کو بہت سکون محسوس ہوا۔

شیونگ کا سامان میں نے سوٹ کیس سے نکال کر واش روم میں رکھ دیا تھا۔ رو کرنا اور نہانا بھی میرے معمولات میں شامل تھا۔ شیو بنانے کے بعد میں نے برش کیا او نہانے کے لیے واش روم میں گھس گیا۔ نہا کر میں نے کپڑے بدلے اور باہر آ گیا۔ دوران میں ناہید دانت وغیرہ مانجھ چکی تھی۔ اس نے بھی اپنے لیے الماری سے ایک شلوار سوٹ نکال لیا تھا۔ غسل کر کے وہ بھی کپڑے بدل ہی کے واش روم سے باہر آئی تھ

''بھوک تو نہیں لگ رہی تھی؟'' ناہید نے واش روم سے نکلتے ہی مجھ سے معلوم کیا

''نہیں ناہید! اتنی جلدی بھی کیا ہے! آرام سے ناشتہ بنا لینا۔'' میں نے کہا۔ ''یہ شلوار سوٹ اچھا لگ رہا ہے جو تم نے پہنا ہے۔''

''بھول گئے، تمہاری ہی پسند سے تو خریدا تھا۔'' ناہید مسکرا کر بولی اور پھر ناشتہ بنا باورچی خانے میں چلی گئی۔

اسی روز دوپہر کو ایک قریبی مسجد میں جا کر میں نے فجر سے عشاء تک کی نمازوں صحیح اوقات معلوم کر لئے۔ وظیفے کی شرائط کے مطابق کسی بھی وقت کی نماز قضا نہیں چاہئے تھی۔ ناہید نے اس دن اپنا زیادہ وقت کئی طرح کے سالن پکانے میں گزارا۔ فر میں اس نے تقریباً ایک ہفتے کا سالن پکا کر رکھ دیا۔ وظیفے میں جو عربی الفاظ پڑھنے انہیں میں نے بھی ناہید کی طرح یاد کر لیا۔ اب آخری مسئلہ یہ طے کرنا رہ گیا تھا کہ وظیفہ جگہ پڑھا جائے! اس جگہ کو تبدیل نہیں ہونا تھا۔

عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد میں نے ناہید سے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ''وظیفہ پڑھنے کے لیے میرے خیال میں نشست گاہ سب سے مناسب جگہ ہے۔''

ناہید نے میرا مشورہ قبول کر لیا۔ ہر چند کہ نشست گاہ صاف ستھری پڑی تھی، پھر بھی ناہید نے اس کی مزید جھاڑ پونچھ کر دی اور وہاں اگر بتیاں جلا دیں۔ اس نے مجھ سے دوپہر کو دیگر سامان کے ساتھ اگر بتیاں بھی منگوائی تھیں۔ وقت سے پہلے ہی اس نے نشست گاہ میں دو جانمازیں ذرا فاصلے سے بچھا دیں۔ ان دونوں جانمازوں کے سامنے بالکل درمیان میں ناہید نے ایک کرسی پر چراغ جلا کر رکھ دیا۔ وظیفہ پڑھتے ہوئے ہم دونوں کو اسی چراغ کی لو پر نظر رکھنی تھی۔

بارہ بجنے میں اب صرف پانچ منٹ باقی رہ گئے تھے۔ وقت قریب آنے کے ساتھ ساتھ میرے دل کی دھڑکنوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ احتیاطاً ہمیں سوا بارہ بجے وظیفہ پڑھنا شروع کرنا تھا تاکہ زوال کا وقت پوری طرح گزر جائے اور اس میں کوئی احتمال نہ رہے۔ نشست گاہ میں جانے سے پہلے ہم نے ایک مرتبہ پھر ڈائری نکال کر وظیفے کے الفاظ دیکھ لئے۔ صبح فجر کے وقت تک ہمیں یہی الفاظ دہراتے رہنا تھا۔

ہر کمرے کی طرح نشست گاہ میں بھی وال کلاک موجود تھا۔ میری اور ناہید کی نظریں اسی کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ وہ ہمارے سامنے والی دیوار ہی پر لگا ہوا تھا۔ چراغ کی مدھم روشنی میں بھی اس کی سوئیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ نشست گاہ میں صرف چراغ کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ یہ بھی اس وظیفے کی شرائط میں سے ایک شرط تھی کہ جس جگہ وظیفہ پڑھا جائے وہاں چراغ کے سوا کوئی اور روشنی نہ ہو۔ اسی احتیاط کے پیش نظر ہم نے اگر بتیاں تک بجھا دی تھیں۔

میں سر پر وہ ٹوپی اوڑھے جانماز پر بیٹھا تھا جو گزشتہ روز ہی خریدی تھی۔ ناہید کے سر پر دوپٹہ تھا۔

خدا خدا کر کے سوا بارہ بجے اور ہم نے وظیفہ پڑھنا شروع کر دیا۔ اس سے پہلے ہم نے ایک دوسرے پر آخری نظریں ڈالی تھیں، پھر ہماری نظریں جلتے ہوئے چراغ کی لو پر جم گئی تھیں۔ وظیفہ شروع کرتے ہی میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ شاید اس کا سبب متوقع خطرات تھے۔

مجھے اور ناہید دونوں ہی کو علم تھا کہ ابتدائی دو راتوں میں کچھ نہیں ہونا۔ میں نے اسی لئے جلد خود پر قابو پا لیا اور وظیفہ پڑھتا رہا۔

رات آہستہ آہستہ سفر طے کرتی ہوئی کاروانِ صبح سے جا ملی۔ دور کہیں سے ''اللہ اک
کی صدا بلند ہوئی۔ فجر کی اذان ہو رہی تھی۔ وظیفے کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ میں نے وظیفے
الفاظ دہرانا ترک کر دیئے اور سامنے جلتے ہوئے چراغ سے اپنی نظریں ہٹا لیں۔

''اللہ کا شکر ہے شہباز کہ پہلی رات گزر گئی اور ہم اپنے مقصد میں کامیاب رہے''
ناہید نے مجھے مخاطب کیا اور اٹھ کر چراغ بجھا دیا۔

''ہاں ناہید!'' میں بھی یہ کہہ کر جا نماز سے اٹھا۔

چراغ بجھنے سے نشست گاہ میں اندھیرا ہو گیا تھا۔ میں نے اسی لئے ٹیوب جلا دی۔

''تمہیں واش روم جانا ہے؟'' ناہید نے پوچھا۔ میں نے اقرار میں سر ہلا دیا تو
بولی۔ ''تم ہو آؤ، پھر میں جاؤں گی۔''

کئی گھنٹے ایک ہی جگہ ایک ہی حالت میں بیٹھے بیٹھے جسم شل سا ہو گیا تھا، ذہن پر نین
غبار بھی تھا۔ میں نشست گاہ سے نکل آیا۔ کچھ ہی دیر میں واش روم سے باہر آ کر میں دو
نشست گاہ کی طرف بڑھ گیا۔ اب میں وضو بھی کر چکا تھا۔ مجھے فجر کی نماز پڑھنی تھی۔
جب دو رکعت سنت پڑھ چکا تھا تو ناہید بھی وضو کر کے آ گئی۔ دو فرض پڑھ کر میں نے جا
اٹھائی اور اسے تہہ کر کے ایک صوفے کی پشت پر ڈال دیا۔ پھر اپنی عادت کے مطابق
نے شیو کر کے برش کیا اور نہانے کے لیے واش روم میں گھس گیا۔ غسل کر کے کچھ تا
محسوس ہوئی۔

اس عرصے میں ناہید ناشتہ بنا چکی تھی۔ ہم نے ناشتہ کیا اور سونے کے لیے کمرے
آ گئے۔ احتیاطاً میں نے دوپہر ایک بجے کا الارم لگایا۔ بستر پر لیٹتے ہی نیند نے آنکھوں
جال بننا شروع کر دیئے۔

پھر ہم دوپہر کو الارم کی آواز سن کر ہی جاگے۔ یہ ہمارے لیے بہترین صورت حال
کہ کوئی بھی ہمارے معمولات میں داخل اندازی کرنے والا نہیں تھا۔

''کیا خیال ہے شہباز، کھانا تو ظہر کی نماز پڑھ کر ہی کھاؤ گے؟'' ناہید نے دریا
کیا۔

''ہاں نماز پڑھ کر ہی کھائیں گے۔'' میں نے جواب دیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''اتنے میں آٹا گوندھ کر رکھ دیتی ہوں کہ ٹھہر جائے۔'' ناہید یہ کہتے ہوئے
سے نکل گئی۔

میں بھی کمرے سے باہر آ کے واش روم کے قریب واش بیسن پر وضو کرنے لگا۔

اس وقت باورچی خانے میں تھی۔

ظہر کی نماز پڑھ کر ناہید نے روٹیاں ڈال دیں۔ ہم دونوں ہی کم خوراک تھے۔
ہمارے لیے تین روٹیاں کافی ہوتی تھیں۔ کھانا کھا کر ہم پھر سونے کے کمرے میں آ گئے
کیوں کہ ابھی ہماری نیند پوری نہیں ہوئی تھی۔ ہم عصر کے وقت تک آرام سے سو سکتے تھے
جس میں ابھی تقریباً سوا دو گھنٹے باقی تھے۔ میں نے ایک مرتبہ پھر شام ساڑھے چار بجے کا
الارم لگا دیا کہ ہم کہیں سوتے ہی نہ رہ جائیں۔ عصر کا وقت ویسے بھی تنگ ہوتا ہے۔ ٹائم پیس
خاصا کام آ رہا تھا۔

شام کو اٹھ کر ہم نے عصر کی نماز پڑھی، پھر چائے پی تو گویا تازہ دم ہو گئے۔ اب
ہماری نیند پوری ہو چکی تھی اور ہم رات بھر جاگ سکتے تھے۔

یہ کچھ ہمارے ساتھ ہی نہیں بلکہ ہر آدمی کا مزاج تغیر پسند ہوتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی
کہ میں نے مغرب کی نماز پڑھ کر ناہید کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ کہیں باہر گھوم پھر آئیں۔
عشاء کی نماز ہم واپس آ کر پڑھ سکتے تھے۔ یوں بھی عشاء پڑھنے کے لیے خاصا وقت ہوتا
ہے، نماز قضا نہ ہوتی۔

''شہباز! کبھی میں نے سمندر نہیں دیکھا، معلوم نہیں یہاں سے کتنی دور ہو گا!'' ناہید
میری تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے کہنے لگی۔

''میرا خیال ہے ناہید کہ سمندر یہاں سے قریب ہی ہو گا۔ ایک مرتبہ ہمارے گاؤں
سے ایک شخص کسی عزیز کے پاس کراچی آیا تھا۔ اس کی زبانی میں نے سنا تھا کہ وہ کلفٹن پر
سمندر کی سیر کرنے گیا تھا۔ ہمارے پاس کار تو ہے نا! گھوم پھر کر ہم خود ہی دیکھ لیں گے کہ
سمندر کدھر ہے، نہیں تو کسی سے معلوم کر لیں گے۔ اس بہانے میں بھی سمندر دیکھ لوں گا۔''

جلدی کپڑے بدل کر ہم جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ فلیٹ کے دروازے کو قفل
کر کے ہم کار میں آ بیٹھے۔

کمپاؤنڈ کے گیٹ سے نکلتے ہوئے میں نے کچھ سوچ کر چوکیدار کے قریب کار رک
لی۔ چوکیدار کو میں نے سلام کیا تو اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس نے بڑے پرجوش آواز میں
میرے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ سولہ نمبر کے فلیٹ ہی میں آئی ہے نا! ہم سب
کی خبر رکھتی ہے۔''

''ہاں خان صاحب!'' میں اس کی بات سن کر مسکرایا، پھر پوچھا۔ ''ہمیں یہ معلوم کرنا
تھا کہ ساحل سمندر تک پہنچنے کے لیے کس راستے سے جانا پڑے گا؟''

"تم کو ابھی اتنا سا بات کا خبر نہیں!" چوکیدار نے اظہار حیرت کیا۔ "تھوڑا ہی دور ہے سمندر! اس روڈ سے نکل کر تم ڈبل روڈ پر پہنچ گی اور پھر الٹے ہاتھ سے سیدھی سمندر تک پہنچ جائے گی۔ سمجھ گئی کہ نہیں۔"

"بالکل سمجھ گیا خان صاحب! آپ کا بہت بہت شکریہ۔" یہ کہتے ہی میں نے کا آگے بڑھا دی۔

چوکیدار نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ہم چند ہی منٹ میں اس جگہ تک پہنچ گئے جہاں خا چہل پہل اور رونق تھی۔ وہاں ویسا ہی سماں تھا جیسے گاؤں میں کوئی میلا لگتے وقت نظر آ تھا۔ کار ایک طرف پارک کر کے ہم بھی اس میلے کے تماشائیوں میں شامل ہو گئے۔ سمند اس جگہ سے خاصے فاصلے پر تھا اور ہم بلندی پر تھے۔ اس وقت زیادہ تر لوگ ساحل سمند سے واپس آ رہے تھے۔ سمندر کو قریب سے دیکھنے کے شوق میں ہم پختہ سیڑھیوں سے نیچے اترتے چلے گئے۔ ہمارے ساتھ چند ہی لوگ ادھر جا رہے تھے۔ بائیں سمت ہمیں بجلی سے چلنے والے جھولے بھی نظر آئے۔

پختہ راستے اور سیڑھیوں سے اتر کر ہمیں ایک کچا اور ریتلا میدان عبور کرنا پڑا۔ اس کے بعد ہی ایک پکی سڑک نظر آئی جس پر گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ مجھے راستہ معلوم نہیں تھا ورنہ میں بھی وہاں تک پیدل آنے کی بجائے کار ہی میں آتا۔ سڑک پار کرتے ہی ہمیں چھوٹی سی دیوار دکھائی دی جو دور تک چلی گئی تھی۔ اس دیوار پر لوگ چڑھے ہوئے تھے ا وہاں سے سمندر کا نظارہ کر رہے تھے۔ ہم بھی دیوار پر چڑھ گئے۔ دیوار کے دوسری جان گہرے نشیب میں دیوار سے نیچے تک بڑے بڑے پتھر پڑے ہوئے تھے۔ انہی پتھروں سے کچھ فاصلے پر تاحدِ نظر سمندر نظر آ رہا تھا۔ سمندر کی موجوں کا ساحل تک آنا اور پھر لو جانا مجھے بہت اچھا لگا۔ ابھی اس قدر اندھیرا نہیں پھیلا تھا کہ ہمیں موجیں نظر نہ آتیں۔ پھر بھی منظر کچھ دھندلا دھندلا سا تھا۔ ناہید بھی میری طرف اس فضا کے سحر میں کھوئی ہوئی تھی۔

"کبھی سرِ شام یا دن کے وقت یہاں آ کے سمندر کا نظارہ کریں گے۔" میں نے ناہ کو مخاطب کیا۔

"ہاں اب واپس چلو، پھر کبھی آئیں گے۔" ناہید نے آس پاس نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔

میں نے بھی محسوس کر لیا کہ اب ہمارے ارد گرد کم ہی لوگ رہ گئے ہیں۔ ہم دیوار سے اتر آئے اور جس راستے سے وہاں تک پہنچے تھے، اسی سے لوٹ آئے۔ اوپر خاصی چہل پہل

تھی۔ وہاں ہمیں کئی چھوٹے بڑے ہوٹل بھی دکھائی دیئے۔

"ناہید! آؤ یہیں کسی ہوٹل میں کھانا کھا لیتے ہیں۔ یوں بھی ساحل سمندر تک جانے آنے میں تم تھک گئی ہو گی۔ واپس فلیٹ پہنچ کر کہاں روٹیاں پکاؤ گی!"

میری بات ناہید نے مان لی اور ہم او ساڑھے بجے کے ایک ہوٹل میں آ بیٹھے۔ وہاں ہم نے کڑھائی گوشت کھایا اور چائے پی کر اٹھ آئے۔

ہوٹل سے اٹھ کر ہم اس طرف بڑھ رہے تھے جہاں اپنی کار کھڑی کی تھی کہ معاً ہمارے سامنے سے تیزی کے ساتھ ایک کار گزری اور میں اچھل پڑا۔ اس کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کی میں نے صرف ایک جھلک دیکھی تھی۔ اسی ایک جھلک نے میرے اعصاب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے اس کار کو ڈرائیو کرنے والا کمال ہو، وہی کمال جو میرے ہاتھوں قتل ہو چکا تھا۔

"نا...... ناہید! تم...... تم نے کچھ دیکھا؟" میں نے بہ مشکل ناہید کو مخاطب کیا۔

"کیا؟" ناہید نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ابھی جو...... جو کار ہمارے سامنے سے گزری تھی۔ اس...... اس میں بیٹھے ہوئے شخص کو دیکھا تھا تم نے؟" میرے حواس اب تک قابو میں نہیں آئے تھے۔

"نہیں تو" ناہید نے جواب دیا۔ "لیکن آپ اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟ کون تھا اس کار میں؟"

"مجھے یوں...... یوں لگا تھا ناہید کہ...... کہ جیسے اس کار کو چلانے والا کمال ہو۔" میں نے بتا ہی دیا۔

"کمال!" ناہید چونک اٹھی۔ "مگر یہ...... یہ کس طرح ممکن ہے؟"

"اسی پر تو مجھے حیرت ہے۔" میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"یہ تمہارا وہم ہو گا شہباز!...... یقیناً وہم ہوا۔"

"ہاں مجھے بھی اب یہی معلوم ہو رہا ہے ورنہ وہ...... وہ کمال کس طرح......" میں کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ جو بات میری زبان سے نکلنے والی تھی، بر سرِ عام نہیں کہی جا سکتی تھی۔ میرا ذہن الجھ کے رہ گیا کہ میری نظریں کس طرح دھوکا کھا سکتی ہیں! اگر مجھے نظر آنے والا کمال نہیں تو اس کا ہم شکل تھا؟

اپنے اس خیال کا اظہار میں نے ناہید سے کیا تو وہ بولی۔ "یہ بھی ہو سکتا ہے۔" یہی ہو گا۔ میں نے اپنے دل کو تسلی دی۔ کوئی مردہ بھلا کس طرح کار ڈرائیو کر سکتا

ہے!

☆======☆======☆

پھر ہم دونوں وہاں مزید نہیں رکے اور اپنی کار میں بیٹھ کر واپس آ گئے۔

فلیٹ کا دروازہ کھولتے ہی خلاف توقع مجھے ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی سنائی دی۔

''ناہید! تم دروازہ بند کر کے آؤ، میں فون اٹینڈ کرتا ہوں۔'' میں یہ کہتا ہوا تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ ٹیلی فون سیٹ ڈبل بیڈ والے کمرے میں تھا۔ میں اس کی لائٹ جلا کر سرہانے ایک تپائی پر رکھے ہوئے فون کی طرف بڑھا۔ قریب پہنچ کر میں نے ریسور اٹھاتے ہی کہا۔ ''ہیلو!''

''ہیلو شہباز! میں پشاور سے بول رہا ہوں۔ گزشتہ ایک گھنٹے سے میں کئی مرتبہ تمہیں فون کر چکا ہوں، مگر......''

ارشاد کی آواز سن کر میں نے سکون کا سانس لیا اور اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ''میں اور ناہید ذرا ساحل سمندر تک گھومنے گئے تھے اور سناؤ، تم ٹھیک تو ہو؟ میری یاد کیسے آ گئی آج؟'' میں یہ کہتا ہوا قریبی بیڈ پر بیٹھ گیا۔ اسی وقت میں نے ناہید کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس کے چہرے پر فکرمندی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ میں نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر اسے بتایا۔ ''پشاور سے ارشاد کا فون ہے۔''

میری بات کے جواب میں ارشاد کہنے لگا۔ ''تمہیں بھولا ہی کون ہے جان من! پروین تو روز ہی تمہارا ذکر کرتی رہتی ہے۔ اس وقت بھی وہ تمہاری آواز سننے کو بے چین نظر آ رہی ہے۔ میں نے بس یوں ہی تمہاری خیریت معلوم کرنے کے لئے فون کیا تھا۔ کیسی گزر رہی ہے؟ ابھی کام شروع تو نہیں کیا ہوگا۔''

''ٹھیک ہوں۔ تمہیں معلوم ہی ہے کہ کام ایک مہینے بعد شروع ہوگا۔'' میں بولا۔

''پروین سے بات کرو گے؟ اسے ریسور دے دوں؟''

''دے دو، کرلوں گا بات!'' میں نے طویل سانس لیا۔

چند لمحے بعد دوسری جانب سے پروین کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو شہباز! میں تمہاری پروین بول رہی ہوں۔''

''میری نہیں، ارشاد کی پروین! کیا تمہاری قریب کی نظر کمزور ہے جو تمہیں ارشاد نظر نہیں آ رہا!''

''مجھے تو بس سوتے جاگتے تمہی نظر آتے ہو شہباز! کیا خبر تم مجھے یاد کرتے ہو گے کہ

نہیں۔''

''کچھ لوگوں کو بھلا دینا ہی اچھا ہوتا ہے۔ تم بھی مجھے بھلا دو۔''

''کاش ایسا ممکن ہوتا شہباز! تمہیں پالینے کی تمنا کبھی میرے دل سے نہیں نکل سکتی! میں اس کوشش میں ہوں کہ جلد تم سے ملاقات کی صورت نکل آئے۔'' پروین بولی۔ ''ارشاد نے کچھ آس بندھائی تو ہے۔ شاید ابھی دو ہفتے اور لگ جائیں۔''

''یعنی تم لوگ دو ہفتے کے بعد پھر کراچی آ رہے ہو؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''ہاں۔'' پروین نے جواب دیا، پھر مزید کہا۔ ''کیا تمہیں یہ سن کر ذرا بھی خوشی نہیں ہوئی! میں نے تو ارشاد سے یہ بھی کہا ہے کہ اس بار ہم دونوں تمہارے ہی پاس ٹھہریں گے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے لیے اوپر والے سے اجازت لینی پڑے گی۔ سمجھ گئے نا کہ اوپر والے سے میرا کیا مطلب ہے!''

یہ سن کر میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں سی بجنے لگیں کیونکہ ان دونوں کا ہمارے پاس رہنا کسی طرح بھی مناسب نہیں تھا۔ ہم نے جو وظیفہ شروع کیا تھا، وہ اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا۔ ''اوپر والے'' سے اس کی مراد حمزہ خان ہی تھا۔ مصلحتاً فون پر وہ حمزہ خان کا نام نہیں لے رہی تھی۔

''تم اپنی کہو، تمہیں تو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے؟''

''مجھے تو نہیں البتہ ناہید کو اس پر ضرور اعتراض ہو سکتا ہے۔''

''وہ کیوں؟''

''اس لیے کہ وہ میری بیوی ہے اور ہر بیوی تم جیسی عورتوں سے اپنے شوہر کو بچا کر رکھنا چاہتی ہے۔''

''جب اوپر والے سے تمہارے ساتھ رہنے کی اجازت مل جائے گی تو پھر ناہید کو بھی یہ کڑوا گھونٹ پینا ہی پڑے گا۔ اچھا خدا حافظ! میں پھر کسی وقت فون کروں گی۔''

اس سے پہلے کہ میں مزید کچھ کہتا لائن بے جان ہوگئی۔ خواہ مخواہ بیٹھے بٹھائے اس عورت نے مجھے فکر میں مبتلا کر دیا تھا۔

میں نے ریسور کو کریڈل پر رکھ دیا تو ناہید میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھنے لگی۔ ''کیا ہوا شہباز تم کچھ گھبرائے ہوئے سے لگ رہے ہو!''

''وہ بلا جو ٹل گئی تھی، پھر نازل ہونے والی ہے۔'' میں نے یہ کہہ کر پروین اور ارشاد کی آمد سے ناہید کو آگاہ کر دیا۔

"تو اس میں فکرمند ہونے کی کیا بات ہے؟ وہ آتے ہیں تو آیا کریں ہمیں کیا!" ناہید نے بے پروائی سے بولی۔

میری فکرمندی کی جو وجہ تھی، وہ بھی میں نے ناہید کو بتادی تو اس کا چہرہ اتر گیا۔

"یہ تو واقعی ہمارے لیے ایک مسئلہ ہو جائے گا۔" ناہید کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگی۔ "جب تک ہم وظیفہ پورا نہ کرلیں، کسی کو یہاں نہیں آنا چاہئے۔"

"اس کا فیصلہ تو اب حمزہ خان ہی کرسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسی نے ہمیں یہاں رہنے کی جگہ دی ہے۔ میں اس سے یہ بات کہہ تو سکتا ہوں لیکن ضروری نہیں کہ وہ میری بات مان ہی جائے۔" میں نے اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے خدشے کا اظہار کیا۔

"یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ کیا صورت پیش آتی ہے۔" میں نے یہ کہہ کہ ٹھنڈا سانس بھرا۔

پھر وہ رات بھی گزر گئی۔ اس کے بعد اگلا دن گذشتہ روز ہی کی طرح سوتے جاگتے گزرا۔ مغرب کی نماز پڑھ کر گھومنے پھرنے کی غرض سے ہم کار میں بیٹھ کر شہر کی طرف نکل گئے تاکہ اس شہر کے راستوں سے کچھ تو آشنائی ہو جائے۔ صدر سے ہم پوچھتے پاچھتے قائداعظم کے مقبرے تک پہنچ گئے اور وہاں فاتحہ پڑھی۔ واپسی میں ایک جگہ رک کر ہم نے کباب پراٹھا کھایا۔ کھانے میں یہ تبدیلی ہمیں اچھی لگی۔ نو بجے ہم اپنے فلیٹ میں واپس آگئے۔

عشاء کی نماز پڑھ کر میں نے ناہید سے کہا۔ "آج تیسری رات ہے۔ ہمارے صبر اور امتحان کا وقت شروع ہونے والا ہے۔ یہ بات اچھی طرح اپنے ذہن میں بٹھا لو ناہید کہ وظیفہ پڑھتے ہوئے جو کچھ تمہیں نظر آئے گا، حقیقتاً اس کا کوئی وجود نہیں ہوگا۔ اسے تم فریب نظر سمجھ کر اپنے ذہن سے جھٹک دینا اور کسی بھی صورت میں وظیفہ پڑھنا ترک نہ کرنا!" میرا لہجہ تاکیدی تھا۔ "تم چاہو تو پھر ڈائری نکال کر پڑھ لو۔"

"ہاں مجھے کچھ یاد تو ہے کہ ڈائری میں تیسری رات کا ذکر تھا۔ پھر بھی مزید دیکھے لیتی ہوں۔" ناہید یہ کہہ کر اٹھی اور الماری سے ڈائری نکال کر لے آئی۔ ڈائری کا وہ ورق اس نے موڑ دیا تھا کہ ضرورت پڑنے پر فوراً مطلوبہ وظیفہ مل جائے۔ ڈائری کھول کر وہ عبارت پر نظر ڈالنے لگی۔ جن الفاظ کی میں نے اسے یاددہانی کرائی تھی، وہ اس کی نظر سے گزرے تو انہیں بلند آواز میں پڑھنے لگی۔ "وظیفہ پڑھنے والے کو تیسری رات سے طرح طرح کی بھیانک شکلیں اور ایسے خوفناک مناظر دکھائی دے سکتے ہیں کہ اس کی حرکت قلب بند ہو

ہ۔ جن افراد کا دل کمزور ہو، وہ ہرگز یہ وظیفہ نہ پڑھیں۔ اس سے ان کی زندگی خطرے
سکتی ہے۔ سات راتیں......"

"بس ناہید!" اسے میں نے بقیہ عبارت پڑھنے سے روک دیا۔ "فی الحال اتنا کافی
جب ہمیں وظیفہ پڑھتے ہوئے سات راتیں گزر جائیں گی تو آگے کے لیے احتیاطی
ر پر غور کریں گے۔ ان الفاظ کا حاصل یہ ہے جو تم نے ابھی پڑھے ہیں کہ تمہیں اپنے
قابو میں رکھنا پڑے گا۔"

"جب ہمیں یہ معلوم ہے کہ سب کچھ فریب نظر ہوگا تو پھر ڈرنے کی کیا بات ہے!"
کے لہجے میں حوصلے کا اظہار ہو رہا تھا۔

"بس یہی بات ذہن میں رکھنی ہے۔ انشاء اللہ تم کامیاب رہوگی۔" میں نے اس کی
افزائی کی۔

ناہید نے مقررہ وقت سے پہلے ہی چراغ کا تیل دیکھ لیا اور جانمازیں بچھا دیں۔ پھر
ت آہی گئے کہ جب ہم نے وظیفہ شروع کر دیا۔ ناہید کو اچھی طرح سمجھانے کے باوجود
ل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس کا سبب خود ناہید ہی تھی۔ مجھ پر جو گزرتی وہ میں بھگت
لین اصل فکر مجھے ناہید کی تھی۔ اگر کوئی خوفناک منظر دیکھ کر اس کے دل کی دھڑکن رک
تو میں کہیں کا نہ رہتا۔ ذہن سے ان اندیشوں کو جھٹکنے کے لیے میں نے اپنی تمام تر توجہ
پڑھنے پر لگا دی۔

ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ چراغ کی لو جیسے میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔
ے میں گھپ اندھیرا ہو گیا۔

یہ صورت حال میرے لئے خلاف توقع ہی تھی۔ میں یہ سمجھا کہ چراغ بجھ گیا ہے۔
کے باوجود میں نے اپنی نظریں اس جگہ سے نہ ہٹائیں۔ وظیفہ کی شرط یہی تھی کہ نظریں
کی لو سے نہ ہٹیں، لیکن چراغ غائب ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ وظیفہ پڑھتے ہوئے
ٹھ کر چراغ دوبارہ جلا دینا چاہئے۔ عین اس لمحے اچانک مجھے پھر چراغ دکھائی دینے

اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ چراغ بجھا نہ کمرے میں اندھیرا ہوا تھا۔ وہ صرف نظر کا
ھا۔ اسی وقت چراغ کے بالکل سامنے مجھے ناہید فضا میں معلق نظر آئی۔ اس کے ہاتھ
رسی سے بندھے ہوئے تھے، منہ پر ایک سیاہ کپڑا بندھا تھا۔ یہ بھی فریب نظر ہے میں
چا اور وظیفہ پڑھتا رہا۔ چند لمحے ہی گزرے تھے کہ بھیانک شکل والا لمبا تڑنگا ایک

سیاہ فام اپنے ہاتھ میں تیز دھار لمبا چھرا لئے نمودار ہوا۔ اس نے میرے دیکھتے دیکھتے ناہی
کی ٹھوڑی کو اس طرح اوپر اٹھایا جس طرح جانوروں کو قربان کرتے ہیں۔ سیاہ فام کے
ہاتھ میں موجود چھرے کی دھار روشنی پڑنے پر چمک رہی تھی۔ اس نے چھرے کی دھار ناہی
کی گردن پر رکھ دی اور پھر اس کا ہاتھ حرکت میں آیا۔ وہ کسی جانور کی طرح ناہید کا گلا کاٹ
رہا تھا۔ گردن سے خون کا فوارہ سا بلند ہوا اور جیسے کسی نے میرے دل کو مٹھی میں بھینچ لیا۔ و
ایسا ہی دل ہلا دینے والا دہشت ناک منظر تھا۔ سیاہ فام کا ہاتھ رکا نہیں۔ اس نے ناہید ک
گردن کاٹ کر ایک ہاتھ سے سر کے بال پکڑ لئے۔ اب اس کے ہاتھ میں ناہید کی کٹی ہو
گردن لٹک رہی تھی اور گردن سے خون ٹپک رہا تھا۔ جب اس سیاہ فام نے ناہید کی گرد
میری طرف اچھال دی تو میرے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ اس کے باوجود مجھے
احساس تھا کہ نہ چراغ کی طرف سے نظریں ہٹانی ہیں، نہ وظیفہ پڑھنا ترک کرنا ہے۔
ہوئی گردن کے ساتھ ہی ناہید کا بقیہ جسم بھی میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اب سیاہ فام بھ
نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس یقین کے باوجود کہ میں نے جو کچھ دیکھا حقیقت سے اس کا کوئی تعلق
نہیں تھا، میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

مجھے نہیں معلوم کہ ناہید پر اس وقت کیا گزر رہی تھی! ذرا دیر میں چراغ ایک بار
میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تو میں سمجھ گیا کہ اب مجھے کوئی اور بھیانک منظر دکھائی دے
والا ہے۔ میرا یہ اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا۔ چند ہی لمحے گزرے تھے کہ ناہید مجھے ایک ای
بھیانک وجود کی گرفت میں تڑپتی ہوئی نظر آئی جسے نہ تو درندہ کہا جا سکتا ہے، نہ ہی آدمی۔
بن مانس سے ملتا جلتا تھا۔ اس کے سارے جسم پر بڑے بڑے سیاہ بال تھے۔ چھوٹی چھو
آنکھوں کی جگہ دو سوراخ تھے جن کی گہرائی میں انگارے سے دہک رہے تھے، بقیہ چہرہ
آدمی جیسا ہی تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے ناہید کا منہ دبا رکھا تھا۔ بالوں بھرے اس کے ہا
کے لمبے ناخن کسی درندے کے ناخنوں کی طرح تیز، نوکیلے اور آگے سے مڑے ہو
تھے۔ اپنے دوسرے ہاتھ کے نوکیلے ناخن اس نے ناہید کے پیٹ پر مارے، میں نے ناہ
پیٹ پھٹتے دیکھا۔ اسی کے ساتھ خون بہنے لگا۔ ناہید کے پھٹے ہوئے پیٹ میں اس نے
ہاتھ ڈال دیا۔ پھر جب اس کا لہولہان ہاتھ باہر نکلا تو اس میں مجھے دل نظر آیا۔ ناہید کا تڑ
ہوا جسم اب ساکت ہو چکا تھا۔ اس درندے نے ناہید کے جسم کو ایک طرف پھینک دیا اور
منہ کھولا۔ مجھے اس کے بڑے بڑے دانت دکھائی دیئے۔ آنکھوں کی جگہ سوراخوں
دہکتے ہوئے انگاروں سے شعلے لپکنے لگے۔

صبح ہونے سے پہلے ایک مرتبہ پھر مجھے ایسا ہی ہولناک منظر دکھائی دیا۔ ناہید مجھے انتہائی
ک صورت والے ایک آدمی کے چنگل میں نظر آئی۔ وہ یا تو بے ہوش تھی یا گہری نیند میں
یکن چند ہی لمحے بعد یہ دونوں باتیں غلط ثابت ہوئیں اور منظر بدل گیا۔ اب طویل قامت
ک صورت والا آدمی زمین پر پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس نے ناہید کے ماتھے پر بڑی سی
ہنی کیل کی نوک رکھی۔ کیل کو وہ ایک ہاتھ سے پکڑے ہوئے تھا۔ اس کے دوسرے ہاتھ
تھوڑا تھا۔ کیل پر اس نے ہتھوڑے سے ضربیں لگائیں اور وہ آدھی سے زیادہ ناہید کی
ں میں اتر گئی۔ ناہید اگر زندہ ہوتی تو ظاہر ہے تڑپتی، لیکن ایسا نہیں ہوا۔
معاً اس خبیثت نے میری طرف دیکھا اور ہتھوڑا اس کے ہاتھ سے نکل کر میری طرف
کھائی دیا۔ میں اچھل پڑا، مگر چراغ کی طرف سے نگاہ نہیں ہٹائی۔ ہتھوڑا جانے کہاں
ب ہو گیا۔ خوفناک صورت والے کے ہاتھ میں اب مجھے ایک خنجر نظر آ رہا تھا۔ اس نے
کا ایک ہاتھ خنجر سے کاٹ کر میری طرف پھینکا، پھر اسی طرح جسم کے دوسرے حصے
کاٹ کر میری طرف اچھالتا رہا۔ ہر طرف مجھے ناہید کے جسم کے ٹکڑے بکھرے نظر
ہے تھے۔ کہیں اس کا کٹا ہوا ہاتھ پڑا تھا تو کہیں پیر۔ آخر میں اس نے گردن کاٹ کر بھی
کر دی مگر اسی پر اکتفا نہیں کیا خنجر سے اس نے ناہید کے دونوں کان باری باری کاٹے
ہیں میرے اوپر پھینک دیا، پھر دونوں آنکھوں میں بھی خنجر کی نوک گھسیڑ کر ڈھیلے باہر
لے۔ درندگی کا یہ کھیل اس وقت ختم ہوا جب وہ شیطان اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ناہید
کٹے ہوئے سر کو زمین پر دے مارا۔ اسی کے ساتھ ناہید کا سر پھٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہو
اور مغز باہر نکل کر الگ جا پڑا۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ اسی دوران میں مجھے ہلکی سی کوئی آواز بھی سنائی نہیں دی تھی۔
یک پھر اندھیرا چھا گیا۔ جب مجھے دوبارہ چراغ نظر آیا تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کے
دیر بعد اذان کی آواز سنائی دی اور میں نے وظیفہ پڑھنا بند کر دیا، لیکن میرا جسم اب تک
پ رہا تھا۔ جس طرح کوئی بھیانک خواب دیکھ کر آنکھ کھلنے کے باوجود ذہن پر کوئی اثر
رہتا ہے، میری حالت بھی ویسی ہی تھی۔ کئی بار کوشش اور ہمت کرنے کے بعد ہی میں
از سے اٹھنے میں کامیاب ہوا۔

جب میں لڑکھڑاتے قدموں سے ٹیوب لائٹ جلانے کے لیے آگے بڑھا تو ناہید کی
بتی ہوئی آواز سنائی دی۔ "شہ...... شہباز!"

"گھبراؤ مت ناہید، میں ابھی آیا، ذرا لائٹ جلا دوں"۔ میں ہمت کر کے بولا۔

بہت مشکل سے میں دیوار تک پہنچا اور سوئچ آن کر دیا۔ نشست گاہ میں تیز روشنی پھیل گئی۔

میں جب ناہید کی طرف پلٹا اور اس کے چہرے پر میری نظر پڑی تو چونک اٹھا۔ خوف کی زیادتی سے اس کے سرخ ہونٹ سفید پڑ گئے تھے، چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ میں اس کے قریب پہنچا تو وہ میرے ہاتھوں میں آ گئی۔

''ناہید!...... ناہید!'' میں نے اسے آوازیں دیں، مگر وہ اپنے ہوش وحواس کھو چکی تھی۔

میں تقریباً دوڑتا ہوا باہر گیا اور ایک گلاس پانی بھر کے لے آیا۔ پانی کے چھینٹے میں نے اس کے چہرے پر مارے تو وہ ہوش میں آئی۔

''خود کو سنبھالو ناہید!'' میں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ ''بھول جاؤ وہ سب کچھ جو تم نے دیکھا ہے۔''

پھر ناہید نے خوفزدہ آواز میں رک رک کر مجھے جو بتایا وہی تھا جو میں بھی دیکھ چکا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ ناہید نے مجھے تین مرتبہ نہایت بھیانک انداز میں قتل ہوتے دیکھا تھا۔ گویا اسے میں اور وہ مجھے نظر آئی تھی۔

''یہی سب کچھ میں نے بھی دیکھا ہے ناہید! مگر مجھے تم دکھائی دی تھی۔ اٹھو کہیں فجر کی نماز قضاء نہ ہو جائے۔'' میں نے اسے اٹھنے میں مدد دی۔ ''ہم یہ باتیں پھر بھی کر سکتے ہیں۔ اگر نماز کا وقت نکل گیا تو تو سارے کیے دھرے پر پانی پھر جائے گا۔''

میری بات سن کر ناہید کے نیم مردہ جسم میں جیسے جان آ گئی۔ وہ بولی۔ ''تم...... تم ٹھیک کہتے ہو۔''

ناہید کو دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا اس کے جسم کا سارا خون کسی نے نچوڑ لیا ہے۔

چراغ بجھا کر میں اسے سہارا دیے ہوئے نشست گاہ سے باہر لے آیا تو اس نے کہا۔

''اب میں خود چل سکتی ہوں شہباز!''

ذرا ہی دیر کے بعد ہم دونوں پھر نشست گاہ میں آ کر فجر کی نماز پڑھ رہے تھے۔ ناہید کی حالت پہلے کی نسبت بڑی حد تک سنبھل چکی تھی۔ اس کے باوجود وہ میری طرح کھڑی ہو کر نماز نہیں پڑھ سکی۔ اس نے بیٹھ کر نماز پڑھی۔

ہم نماز پڑھ کر دعا مانگ چکے تو میں نے ناہید کو مخاطب کیا۔ ''تم ناشتہ تو بنا لوگی نا!''

ناشتہ بنانے میں اس کا ہاتھ کسی حد تک میں نے بٹایا۔ میں اپنے معمولات سے فارغ

ہو چکا تھا۔ اب کیونکہ ایسی کوئی جلدی نہیں تھی اور ہمیں ناشتہ کر کے سونا ہی تھا اس لیے میرے مشورے پر ناہید کچھ دیر کو کمرے میں جا کر لیٹ گئی تھی۔ اس سے ناہید کے اعصاب پر اچھا پڑا تھا۔

میں نے ناشتہ کرتے ہوئے دانستہ اسے چھیڑا۔ ''منع کر رہا تھا کہ بی بی مان جاؤ مگر بی بی کے کان پر جوں ہی نہیں رینگ رہی تھی۔ اب پتا چلا!''

''ہاں واقعی شہباز! خواب میں بھی کبھی مجھے ایسے بھیانک منظر دکھائی نہیں دیے۔'' ناہید نے اعتراف کیا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

''یہ خواب ہی تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ یہ خواب تمہیں کھلی آنکھوں سے نظر آیا تھا۔'' میں نے یہ کہہ کر شوخی دکھائی۔ ''پڑھو گی وظیفہ!''

''کیوں نہیں، بالکل پڑھوں گی! تم نے مجھے بزدل سمجھ رکھا ہے!'' وہ دھیرے سے ہنس دی۔

''ابھی تو بی بی، معاملہ صرف دیکھنے کی حد ہے جب کان بھی بجنے لگے تو پتا چلے گا تمہیں! شکر ہے کہ تم وظیفہ پڑھتے وقت بے ہوش نہیں ہوئی!''

''اچھا ایمانداری سے یہ بتاؤ شہباز، کیا تمہیں بالکل ڈر نہیں لگا؟''

''ڈر تو لگا مگر اتنا نہیں کہ صبح ہوتے ہی تمہاری طرح لمبا لمبا لیٹ جاتا۔''

میری چھیڑ چھاڑ کا ناہید پر خوشگوار اثر ہوا۔ میں نے اسے ہنسانے کے لیے کئی لطیفے بھی سنائے۔ اس کے چہرے کی سرخی لوٹ آئی تو میرا دل کچھ مطمئن ہوا۔

☆======☆======☆

اب میں نے یہ معمول بنالیا تھا کہ مغرب کے بعد ناہید کو ساتھ لئے گھومنے نکل جاتا۔ رات کا کھانا بھی ہم باہر کھاتے اور نو دس بجے تک لوٹ آتے۔ اس روز بھی میں نے ایسا ہی کیا۔ حمزہ خان نے اس دوران میں ایک بار بھی مجھ سے رابطہ نہیں کیا، نہ خود مجھے اس کی ضرورت پیش آئی تھی۔ اس نے مجھے جو مہلت دی تھی، اس پر قائم تھا۔ میں اس موقع سے پورا فائدہ اٹھا رہا تھا۔ مجھے اس پر یقین تھا کہ وظیفہ مکمل ہو گیا تو پھر وہ میری اور ناہید کی گرد کو بھی نہ پا سکے گا۔ گزرے ہوئے دنوں میں ایک بات البتہ مجھے محسوس ہوئی تھی کہ جب بھی میں فلیٹ سے نکلتا ہوں تو کچھ لوگ مجھ پر نظر رکھتے ہیں۔ یہ لوگ بدلتے رہتے تھے۔ حمزہ خان کے سوا مجھ سے کسی اور کو کیا دلچسپی ہوتی کہ میری نقل و حرکت پر نظر رکھتا! مجھے پوری طرح آزادی دینے کے باوجود وہ بہر حال میری طرف سے غافل نہیں تھا۔ یہ بات علم میں ہونے پر بھی مجھے اس کی کوئی خاص پرواہ نہیں تھی۔ اب تک ناہید کو میں نے یہ بات نہیں بتائی تھی۔ اس دن سلیٹی رنگ کی ایک کار میں بڑے بڑے بالوں والا ایک شخص ہماری نگرانی کر رہا تھا۔

''ناہید! تمہیں ایک تماشا دکھاؤں!'' میں دھیرے سے ہنستے ہوئے بولا۔

''کیسا تماشا؟'' اس نے سوال کیا۔

''عقبی آئینے میں دیکھو، ایک کار ہمارے پیچھے لگی ہوئی ہے میں اپنی کار کو اگلے چوراہے سے بائیں جانب موڑوں گا تو سلیٹی کار بھی ادھر ہی مڑے گی۔ میں نے کار کی رفتار بڑھائی تو تعاقب کرنے والا بھی یہی کرے گا۔'' میں نے بتایا۔

''مگر شہباز، یہ کون ہے؟'' یہ پوچھتے ہوئے ناہید فکر مند سی ہو گئی۔ ''تم کیسے جانتے ہو اسے؟''

میں نے جواب میں ناہید کو ساری بات بتادی۔

ناہید ٹھنڈا سانس بھر کر کہنے لگی۔ ''تم نے پہلے نہیں بتایا۔''

''اس لیے کہ میرے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ تعاقب کرنے والے ہم سے

ہیں کہتے نا! حمزہ خان اگر مجھے نظر میں رکھنا چاہتا ہے تو اس سے مجھے کیا فرق پڑتا
ہیں نے گویا ناہید کو مطمئن کرنے کی غرض سے کہا۔

''بعد میں تو اس سے فرق پڑ سکتا ہے۔'' ناہید بولی۔ ''ہم فرار کس طرح ہوں گے؟''

''میرا خیال ہے کہ ہمیں اس میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ فرض کرو، میں چھ
بن جاؤ اور تم پچاس برس کی ایک عورت تو حمزہ خان کے آدمی ہمیں کس طرح پہچانیں
پچاس برس کی عورت کسی بچے کو گود میں لیے جاتی دکھائی دے گی تو وہ کیسے شک کر سکتے
لو؟''

''ہاں یہ بات تو ہے۔'' اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ پھر کہا۔ ''مگر شہباز، ہمیں اس
پہلے ہی سے تیاری کرنی پڑے گی۔''

''مثلاً کس طرح کی تیاری؟'' میں نے دریافت کیا۔

''مختلف عمروں کے بچوں کے کپڑے بھی ہمیں پہلے سے خرید کر اپنے پاس رکھنے
گے۔'' ناہید نے جواب دیا۔

''یہ کوئی اہم مسئلہ نہیں۔'' میں بولا۔ ''وظیفہ پورا ہونے کے بعد ہمارے پاس ان
ن کے لیے خاصا وقت ہوگا۔'' یہ کہتے ہوئے چوراہے سے میں نے بائیں سڑک پر
موڑ لی۔

''تم ٹھیک ہی کہہ رہے تھے، اس نے بھی اپنی کار ادھر ہی موڑ لی ہے۔'' ناہید نے
ی کی۔

''اب اسے بھول جاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''آٹھ بج رہے ہیں کہیں چل کر کھانا کھاتے

''اس طرف ہم پہلے کبھی نہیں آئے۔ معلوم نہیں کون سا علاقہ ہے!''

''دکانوں پر لگے ہوئے بورڈ پڑھتی جاؤ، خود ہی پتا چل جائے گا۔'' یہ کہتے ہوئے
ر ایک بینک کے بورڈ پر پڑی۔ بورڈ پر اس بینک کا نام لکھا تھا اور اس کے ساتھ
روڈ برانچ'' لکھا ہوا نظر آرہا تھا۔ میں نے کار کی رفتار کم کرتے ہوئے ناہید کی توجہ
ف مبذول کرائی۔

''ہاں تم نے یہ اچھی ترکیب بتائی۔''

''یہ ترکیب تو خیر اپنی جگہ ہے ناہید، مگر راستے بھی ذہن میں رکھا کرو۔''

''وہ تو اس صورت میں زیادہ بہتر طور پر یاد رہ سکتے ہیں جب تمہاری بجائے میں کار

ڈرائیو کروں۔"

"تو میں نے تمہیں کار چلانے سے کب منع کیا ہے! واپسی میں تم ہی کار چلانا۔" مجھے معلوم تھا کہ ناہید کو بھی ڈرائیونگ آتی ہے۔

اسی وقت مجھے ایک ہوٹل دکھائی دے گیا۔ میں نے اس کے سامنے کار روک دی۔ ہم دونوں کار سے اتر کر ہوٹل میں کھانا کھانے داخل ہو گئے۔

وہاں سے واپسی پر ناہید نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور کچھ فاصلہ طے کر کے کہنے لگی۔ "تم نے پیٹرول نہیں دیکھا، ختم ہونے والا ہے۔ یہ دیکھو۔" اس نے ایک ڈائل کی طرف اشارہ کیا۔ "اب کوئی پیٹرول پمپ پڑا تو وہاں سے بھروالیں گے۔ اچھا یہ بتاؤ کہ اب چلنا کدھر ہے؟"

"جدھر سے آئے تھے۔" میں یہ کہہ کر اسے راستہ بتانے لگا۔ کچھ ہی دور چل کر ایک پیٹرول پمپ نظر آیا تو وہاں سے میں نے بہ قدرِ ضرورت پیٹرول بھروالیا۔

گاڑی پھر سڑک پر دوڑنے لگی تو ناہید نے کچھ سوچتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔

"شہباز! میرے ذہن میں ایک اور بات آرہی ہے۔"

"بولو، کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"حمزہ خان کے مقابلے میں ہم ارشاد کے چنگل سے بہ آسانی نکل سکتے ہیں۔" ناہید نے جواب دیا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو ناہید!" میں نے اس کے خیال سے اتفاق کیا۔ "کاروباری تعلق سے قطع نظر ارشاد نے یہ پیشکش بھی کی تھی کہ ہم جتنا عرصہ چاہیں، اس کے پاس رہ سکتے ہیں لیکن اس میں ایک قباحت ہے۔ ارشاد کو حمزہ خان سے یہی بات کرنی پڑے گی کہ وہ مجھے اپنا شریک کار بنانا چاہتا ہے۔ حمزہ خان اسی صورت میں مجھ سے دست بردار ہونے پر آمادہ ظاہر کرسکتا ہے۔ اس کے علاوہ اب تک حمزہ خان نے مجھ پر جو رقم خرچ کی ہے یا مجھے د ہے وہ بھی مع سود کے وصول کرنا چاہے گا۔ ان تمام باتوں کے باوجود ایسا اب اسی وقت ممکن ہے کہ جب ارشاد کراچی آجائے۔ اس کے لیے مجھے بھی ارشاد سے یہ وعدہ کرنا پڑے گا میں اس کا شریک کار بننے پر آمادہ ہوں۔ پروین نے بتایا ہے کہ دو ہفتے بعد ارشاد کی آ متوقع ہے۔ اگر واقعی وہ دو ہفتے بعد آگیا تو وظیفہ پورا ہونے میں گنتی کے چند روز رہ جا گے۔ حمزہ خان کی گرفت سے بہ آسانی اور کسی خطرے کے بغیر نکلنے کے لیے بہرحال یہ ا راستہ ہے، لیکن اسی صورت میں کہ ارشاد اور پروین ہمارے ساتھ نہ ٹھہریں۔ خیر!

ہیں، کیا ہوتا ہے!"

میں اور ناہید اسی طرح کی باتیں کرتے ہوئے کلفٹن پہنچ گئے۔ اپنی بلڈنگ کا رخ کرنے سے پہلے میں اس پیٹرول پمپ تک پہنچ گیا جو سوزو نے مجھے دکھایا تھا۔ وہاں سے میں نے کار کی ٹنکی فل کرائی۔ اس کے لیے مجھے ادائیگی کے بجائے صرف دستخط کرنے پڑے۔

اپنے فلیٹ پہنچنے کے بعد ہم نے وضو کر کے عشاء کی نماز پڑھی۔ پھر ناہید کو میں سمجھانے لگا کہ وہ گزشتہ رات کی طرح قطعی طور پر خوفزدہ نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی یہ فطرت بنائی ہے کہ وہ خود کو وقت اور حالات کے مطابق ڈھال لیتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ہم نے آئندہ چند راتیں کسی نہ کسی طرح گزار لیں۔ اس عرصے میں ہمیں بڑے بھیانک مناظر دکھائی دیئے، مگر ہم نے کوئی پرواہ نہیں کی۔ ہمارے معمولات حسبِ سابق جاری رہے اور پھر وظیفے کی آٹھویں رات آہی گئی۔ میں نے اس رات بھی وظیفے والی ڈائری نکال لی اور ناہید کو اس میں درج شدہ عبارت پڑھ کر سنانے کی خاطر اسے کھول لیا۔

"سنو ناہید!" میں نے اس کو مخاطب کیا۔ "تمہیں معلوم ہے کہ آج وظیفے کی آٹھویں رات ہے!"

"ہاں ہاں معلوم ہے!......م لہو، کیا کہنا چاہتے ہو!" ناہید بولی۔

"دراصل میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہمیں اب ایک نئے امتحان سے گزرنا ہے۔" میں نے ڈائری میں درج عبارت پڑھنا شروع کی۔ "سات راتیں گزر جانے پر بھیانک شکلوں کے ساتھ ساتھ انتہائی ڈراؤنی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں گی۔ کبھی تیز آندھی اور طوفان کے جھکڑ چلتے محسوس ہوں گے اور کبھی کوئی درندہ وحشت ناک آواز نکال کر وظیفہ پڑھنے والے پر حملہ آور ہوتا نظر آئے گا۔ کبھی ایسا معلوم ہوگا کہ زلزلہ آگیا اور مکان زمین بوس ہونے والا ہے۔ وظیفے پر عمل کرنے والا اگر جانماز سے اٹھ گیا یا اس نے خوفزدہ ہو کر وظیفہ پڑھنا چھوڑ دیا تو اس کا زندہ بچنا ناممکن ہے۔ وظیفہ پڑھتے ہوئے جو بھی وہ دیکھے یا سنے، اسے فریبِ بصارت اور فریبِ سماعت ہی سمجھے۔" ڈائری میں سے متعلقہ عبارت پڑھ کر میں نے مزید کہا۔ "اب مجموعی طور پر صرف چودہ راتیں ہی باقی رہ گئی ہیں جن میں سے آخری تین راتیں بھی انشاء اللہ گزار ہی لیں گے۔ ایک بات تم اپنے ذہن میں بٹھا لو ناہید کہ تمہیں اب پہلے سے کہیں زیادہ ہمت اور حوصلے سے کام لینا ہوگا۔"

"تم میری طرف سے کیوں اتنے فکر مند دکھائی دے رہے ہو شہباز!" ناہید الٹا مجھی کو سمجھانے لگی۔ "یہ کڑا وقت بھی گزر ہی جائے گا۔ پھر تم یہ کیوں بھول رہے ہو، میرے ہی اصرار پر تو وظیفہ پڑھنے کے لیے آمادہ ہوئے تھے۔ بالکل مت گھبراؤ، اللہ نے چاہا تو کچھ نہیں ہوگا۔"

"خدا تمہاری زبان مبارک کرے۔" میں بے اختیار بولا۔ "بس تم جو بھی دیکھو اور سنو اسے دھوکہ ہی سمجھنا۔ وظیفہ ہر حال میں پڑھتی رہنا۔"

پھر وہ لمحات آ ہی گئے کہ جب ہم نے وظیفے کا آغاز کر دیا۔ چند ہی لمحے سکون سے گزرے ہوں گے کہ اچانک میں نے کسی درندے کی غراہٹ سنی۔ یہ غراہٹ شیر کی غراہٹ سے مشابہ تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کمرے میں وہ خطرناک درندہ گھس آیا ہے۔ پھر ایک دم شیر کی دہاڑ سنائی دی اور پھر مجھے اپنے سامنے ہی شیر نظر آ گیا۔ غیر معمولی طور پر وہ ببر شیر خاصا تندرست اور توانا معلوم ہوتا تھا۔ خوف کی وجہ سے میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس نے خوفناک انداز میں اپنا منہ کھولا اور پھر مجھ پر جست لگا دی۔ میں غیر ارادی طور پر جھک گیا، لیکن اپنی نظریں چراغ کی طرف سے نہیں ہٹائیں اور نہ وظیفہ پڑھنا چھوڑا۔

اسی وقت مجھے ایک اور دہشت ناک منظر دکھائی دیا۔ مجھے ویسا ہی ایک اور شیر نظر آیا جو ناہید کے سینے پر چڑھ بیٹھا تھا۔

"بچاؤ!...... مجھے بچاؤ شہباز!" ناہید مجھے مدد کے لیے پکارنے لگی۔

پھر ناہید سے وہ شیر اس طرح کھیلنے لگا جیسے کوئی بلی، چوہے سے کھیلتی ہے۔ وظیفہ پڑھتے ہوئے میں نے یہ سوچ کر اپنے دل کو تسلی دی کہ جو کچھ مجھے دکھائی اور سنائی دے رہا ہے، محض فریب ہے، حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ ناہید کی چیخیں کسی تیز دھار خنجر کی طرح میری سماعت میں اترتی رہیں، میرے احساس کو جھنجوڑتی رہیں، لیکن میں نے کوئی پروا نہیں کی۔

"شہباز! یہ کوئی فریب نہیں، حقیقت ہے۔ یہ شیر مجھے مار ڈالے گا۔ خدا کے واسطے مجھے بچالو!" ناہید فریاد کرنے لگی۔

ناہید کی آہ وزاری اور فریادوں کے باوجود میں اپنی جگہ سے نہ ہلا تو میری آنکھوں کے سامنے شیر نے ناہید کو بھنبھوڑنا شروع کر دیا۔ ناہید کی دردانگیز اور بھیانک چیخوں سے کمرا گونجنے لگا۔ جگہ جگہ پنجے مار کر شیر نے ناہید کے جسم کو لہولہان کر دیا۔ پھر اس نے بڑی بے دردی سے ناہید کے ایک ہاتھ کو چبا ڈالا۔ میری مجبوری یہ تھی کہ میں اپنی آنکھیں بھی بند

نہیں کر سکتا تھا۔ اگر وہ منظر واقعی حقیقی ہوتا تو چبالئے جانے پر ناہید بے ہوش ہو جاتی، مگر ایسا نہیں ہوا۔ وہ بری طرح تڑپ رہی تھی۔ اسے شیر نے چیر پھاڑ ڈالا اور آخر کار اس کی گردن میں اپنے بڑے بڑے نکیلے دانت اتار دیئے۔ میں اپنی جگہ بیٹھا ہوا یہ روح فرسا منظر دیکھتا رہا۔

چند ساعتیں مزید گزری ہوں گی کہ زبردست تیز آندھی سی چلنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی اندھیرا چھا گیا۔ ہوا سے گویا چراغ بجھ گیا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میں بھی تیز ہوا کے ساتھ اڑ جاؤں گا۔ بے اختیار کسی چیز کا سہارا لینے کے لیے میرے دونوں ہاتھ اِدھر اُدھر اٹھے، لیکن میں نے سامنے سے نظر نہیں ہٹائی جہاں چراغ رکھا تھا۔ یکا یک بجلی کی اتنی تیز کڑک سنائی دی کہ میں اچھل پڑا۔ مجھے یوں محسوس ہوا تھا کہ کہیں بہت قریب ہی بجلی گری ہو۔ بجلی کے بار بار کڑکنے اور آندھی کے شور سے میرے کانوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے۔ خاصی دیر تک یہی دل ہلا دینے والی آوازیں آتی رہیں، پھر ایک دم موت کی سی خاموشی چھا گئی۔ اپنے تیز سانسوں کے سوا اب مجھے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

ذرا ہی دیر میں بڑی زور کی گڑگڑاہٹ ہوئی۔ اس سے مجھے دوبارہ چراغ جلتا نظر آنے لگا۔ گڑگڑاہٹ کے ساتھ ہی زمین ہلنے لگی۔ میری نگاہ سامنے اٹھی ہوئی تھی۔ چراغ کے پیچھے جو دیوار تھی، اس میں شگاف پڑ گیا۔ زلزلہ! میرے ذہن میں ایک لفظ گونجا۔ مجھے یاد آیا کہ زلزلے کے وقت کسی کھلے میدان میں نکل انا چاہئے، لیکن میں اپنی جگہ سے نہیں اٹھا۔ اس کمرے کی دیواریں ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگیں اور یہ لگا کہ بس اب چھت گرنے ہی والی ہے۔

رات بھر ایسی ہی دہشت ناک آوازیں اور خوفناک مناظر دل کو دہلاتے رہے۔ پھر بھی میں ثابت قدم رہا اور خدا خدا کر کے اذان کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ میں نے وظیفہ پڑھنا چھوڑ دیا۔ غیر ارادی طور پر میرے منہ سے نکلا۔ "یا اللہ تیرا شکر ہے۔"

بائیں جانب جانماز پر ناہید بیٹھی تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی حالت مجھے اپنے آپ سے زیادہ غیر معلوم ہوئی۔

اس روز بھی ناہید اپنے ہوش وحواس قائم نہ رکھ سکی۔ میں بڑی مشکل سے اسے ہوش میں لایا تا کہ فجر کی نماز پڑھ سکے۔ ناہید نماز پڑھ چکی تو میں نے اسے لٹا دیا۔ اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ ناشتہ بنا سکے۔ اپنے معمولات سے فارغ ہو کر میں نے ہی ناشتہ بنایا۔ گذشتہ رات ہی کو میں نے ڈبل روٹی لا کر رکھ دی تھی۔

ناشتہ کرتے ہوئے ناہید نحیف آواز میں بولی۔ ''شہباز! میری وجہ سے تمہیں ناحق تکلیف اٹھانا پڑ رہی ہے۔ کوشش کے باوجود میں خوفزدہ ہونے سے بچ نہیں سکی۔ مت پوچھو کہ اس وقت میرے دل پر کیا گزری جب ایک خوفناک شیر تمہیں چیر پھاڑنے والا تھا اور ......اور تم مجھے مدد کے لیے پکار رہے تھے!''

ناہید کا چہرہ زرد پڑا ہوا تھا۔ میں بولا۔ ''اور بالکل اسی کیفیت سے میں گزرا ہوں۔ دراصل ہم دونوں کے لیے اس دنیا میں ایک دوسرے سے زیادہ کوئی اور عزیز نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تم مجھے اور میں تمہیں انتہائی خطرناک صورت حال میں دیکھتا ہوں۔ بہرحال یہ رات بھی گزر ہی گئی۔ تم خود کو سنبھالو ناہید!''

''ہاں کوشش...... کوشش تو کر رہی ہوں۔'' ناہید کی آواز سے نقاہت جھلک رہی تھی۔

اس دن ناہید سو کر اٹھی تو حالت قدرے بہتر تھی۔ اسے میں نے روٹیاں نہیں ڈالنے دیں اور مارکیٹ سے روٹیاں لے آیا۔ ظہر کی نماز ہم پہلے ہی پڑھ چکے تھے۔ اس لئے نیند پوری کرنے اور رات کو پھر جاگنے کے لئے سو گئے۔ سونے سے ناہید کے اعصاب پر اچھا اثر پڑا۔ پھر میں نے بھی اس کی دل جوئی کی اور خود چائے بنا کر پلائی۔ پانچوں وقت کی نماز اب ہمارے معمول میں شامل تھی۔ ہم ابھی چائے پی ہی رہے تھے کہ خلاف توقع فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

''میرا خیال ہے کہ پشاور سے ارشاد یا پردین نے فون کیا ہوگا۔'' میں یہ کہتے ہوئے اٹھا اور اندر کمرے میں چلا گیا۔

ریسیور اٹھاتے ہی دوسری طرف سے بھاری اور جانی پہچانی حمزہ خان کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو!''

''ہیلو جناب!'' میں فوراً بولا۔

''شہباز، کل رات کو تم آٹھ بجے تک میری کوٹھی پر پہنچ جاؤ!'' حمزہ خان کا لہجہ حکمیہ تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا۔ ''تمہیں اپنے دو غیر ملکی مہمانوں سے ملوانا ہے جو کل شام تک ایک فلائٹ کے ذریعے نیویارک سے یہاں پہنچنے والے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آئندہ تمہیں امریکہ بھیجوں تو وہ تمہارے لیے اجنبی نہ ہوں۔ انہیں ایک ہفتے تک کراچی میں رہنا ہے، پھر وہ واپس چلے جائیں گے۔ ان سے تمہارے ذاتی تعلقات ہمارے کاروبار کے لیے سودمند ثابت ہوں گے۔ میرا فیصلہ اسی لیے یہ ہے کہ وہ دونوں یہ ایک ہفتہ تمہارے ہی ساتھ رہ کر گزاریں۔ تمہاری حیثیت ان کے میزبان کی ہوگی۔ ان کے آرام و آسائش

ں کی نہیں چھوڑنی۔ یہ باتیں میں فون پر یوں بتا رہا ہوں کہ ان لوگوں کی موجودگی میں یہ سب کچھ نہیں کہہ سکوں گا۔ ان کی میزبانی پر جو اخراجات ہوں گے، میں برداشت گا۔ تم جب آؤ گے تو تمہیں ایک لفافہ مل جائے گا جس میں دس ہزار روپے ہوں ں سمجھتا ہوں کہ اتنے روپے کافی ہوں گے۔''

حمزہ خان کی بات سن کر میرے ہوش اڑ گئے اور میں بے اختیار بول اٹھا۔ ناب، میں اس فلیٹ میں تنہا تو نہیں رہتا۔ میرے ساتھ اس فلیٹ میں میری بیوی بھی ہے۔''

''تو کیا ہوا؟'' حمزہ خان کی بھاری آواز میں سختی آ گئی۔

''وہ ان اجنبی غیر ملکیوں کے ساتھ ایک ہی چھت کے نیچے کیسے رہ سکتی ہے؟''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو، میں اب بھی نہیں سمجھا۔''

''جناب! میں ان لوگوں کو اپنے ساتھ اس فلیٹ میں نہیں رکھ سکتا۔'' میں نے صاف کہہ دیا۔ ''آپ انہیں کسی ہوٹل میں ٹھہرا دیں۔''

''شہباز!'' غصے کی زیادتی کے سبب حمزہ خان تقریباً چیخ اٹھا۔ ''تم شاید واقف نہیں ہو ا انکار سننے کا عادی نہیں ہوں۔ جو لوگ انکار کرتے ہیں۔ میں ان کے انکار کو اقرار لنے کی طاقت رکھتا ہوں۔ کیا تم میری طاقت آزمانا چاہتے ہو۔'' اس کے لہجے میں ا۔

''نہیں جناب!'' میں نے تحمل سے کہا۔ ''میں آپ کی طاقت سے آگاہ ہوں...... پ میری مجبوری کو سمجھنے کی کوشش کریں۔''

''آخر کیا مجبوری ہے تمہارے ساتھ؟'' حمزہ خان نے بھاری آواز میں کہا۔ اس کے ں خفگی عیاں تھی۔ ''کیا شادی شدہ لوگوں کے پاس مہمان نہیں آتے؟ کیا تمہاری بیوی تی ہے یا غیر مردوں کے سامنے نہیں آتی؟ یاد رکھو شہباز! تم جس اپارٹمنٹ میں اپنی کے ساتھ رہ رہے ہو، وہ میں نے ہی تمہیں دیا ہوا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم حکم پر چوں چرا کیوں کرنے لگے ہو۔ تمہارے ہاتھ خون میں رنگے ہوئے ہیں۔ ں چاہوں تو ابھی اور اسی وقت پولیس تمہیں کمال کے قتل کے سلسلے میں گرفتار کر سکتی میرے پاس تمام ثبوت موجود ہیں، جو تمہیں قاتل ثابت کریں گے...... پھر تمہارا ا کیا ہوگا؟''

ریسیور پر میری گرفت سخت ہو گئی تھی۔ میں ہونٹ بھینچے حمزہ خان کی باتیں سن رہا تھا۔

میرے خیال کے مطابق درپیش مسئلہ اتنا سنگین نہیں تھا کہ حمزہ خان اس طرح آپے سے باہر ہو جاتا۔ غیر ملکی مہمانوں کو ہوٹل میں ٹھہرانے کا مشورہ دے کر میں نے گویا اس کے غصے کو ہوا دی تھی..... لیکن میرا خیال ہے اصل مسئلہ یہ نہیں تھا۔

میں نے خود پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ ''آپ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں جناب! میں نے ایسی کیا غلطی کر دی کہ.....''

''مجھے حکم عدولی ہرگز پسند نہیں ہے۔'' حمزہ خان نے سخت لہجے میں میری بات کاٹی۔ ''تم نے بہت بڑی غلطی کی ہے اور تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ آئندہ ایسی غلطی نہ دہراؤ۔ میں جو حکم دوں، تمہیں اس کی تعمیل کرنی ہے۔ اس سلسلے میں کوئی مشورہ یا تاخیر تمہارے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے..... اور میں نے یہ سب باتیں اس لیے کی ہیں کہ تم اپنی اوقات مت بھولو۔ سمجھ گئے.....؟ کل رات آٹھ بجے تک تمہیں میری کوٹھی پر ہونا چاہیے۔''

اس کے ساتھ ہی دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہو گیا۔ کئی باتیں میری سمجھ میں آ گئی تھیں۔ ساحل سے واپسی پر میں نے کار چلاتے ہوئے جس شخص کو کمال کا ہم شکل سمجھا تھا اب مجھے یقین سا ہونے لگا تھا کہ وہ حقیقتاً کمال ہی تھا۔ وہ مرا نہیں تھا بلکہ حمزہ خان کی کوٹھی پر محض ڈراما کیا گیا تھا تاکہ بعد میں مجھے بلیک میل کر کے اپنے مقاصد میں استعمال کیا جا سکے۔ فون پر حمزہ خان کی گفتگو سے میں نے یہی اندازہ لگایا کہ وہ اپنے تئیں مجھے مکمل طور پر بے دست و پا کر کے اپنے احکامات پر چلانا چاہتا ہے۔ جس طرح اس نے معمولی سی بات پر مجھے دھمکانے کے بعد کمال کے قتل کا حوالہ دیا تھا، فوراً میرے ذہن میں گویا ایک گرہ سی کھل گئی تھی۔ کیونکہ اب تک میرے یہ الجھن دور نہیں ہو سکی تھی کہ حمزہ خان کی کوٹھی میں کمال جیسا شخص اتنی آسانی سے میرے ہاتھوں کیونکر قتل ہو گیا تھا..... اور اس پر حمزہ خان کا غیر معمولی رویہ.....؟

کمال اس کا خاص آدمی تھا اور اس کی موت کو اس نے خوش دلی سے قبول کر کے میرے نشانے کو سراہا تھا۔ اس وقت یہ بات مجھے عجیب ضرور لگی تھی لیکن میں نے اس پر غور کرنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ اب میں کافی حد تک اس معاملے کو سمجھ چکا تھا۔

''کیا بات ہے شہباز؟'' ناہید کی آواز سن کر میں اپنے خیالات سے چونکا۔ وہ چائے کا کپ ہاتھ میں پکڑے دروازے پر کھڑی تھی اور غور سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ ''کچھ پریشان لگ رہے ہو۔''

''ہاں۔'' میں نے گہرا سانس لے کر کہا۔ ''میں واقعی بہت پریشان ہوں۔''

''اللہ خیر کرے۔'' وہ جلدی سے اندر آ گئی اور کپ میز پر رکھ کر میرے قریب پہنچ گئی۔ ''کیا مسئلہ ہے..... تم کس پریشانی کی بات کر رہے ہو؟ فون کس کا تھا؟''

''پہلے ہی دن سے پریشانیاں اور مسائل ہمارا پیچھا کر رہے ہیں۔'' میں نے دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''ایک مسئلے سے جان نہیں چھوٹتی، دوسرا سامنے آن کھڑا ہو جاتا ہے۔''

''آخر ہوا کیا ہے؟'' ناہید روہانسی ہو گئی۔ ''کس کا فون تھا؟'' اس نے اپنا سوال دہرایا۔

''حمزہ خان کا۔'' میں نے جواب دیا۔

''حمزہ خان کا.....! کیا کہہ رہا تھا؟'' میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرم آواز میں کہا۔

''تم پریشان مت ہو۔ آؤ، ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔''

چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ ناہید نے کپ اٹھا کر کچن میں جاتے ہوئے کہا۔ ''تم بیٹھو، میں تمہارے لیے اور چائے بنا کر لے آتی ہوں۔ پھر باتیں کریں گے۔''

اس کے جانے کے بعد میں مسلسل سوچتا رہا۔ مجھے ارشاد کی باتیں یاد آنے لگیں۔ اس نے کہا تھا کہ حمزہ خان کے لیے کام کرنے سے پہلے یہ ذہن میں رہے کہ اس دلدل میں قدم رکھنے کے بعد بندہ اس میں دھنستا ہی چلا جاتا ہے۔ اس سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔ میں نے یہ سوچ کر ہامی بھر لی تھی کہ مجھے سہارے کی ضرورت تھی اور خیال تھا کہ بعد میں جرائم کی دنیا سے کنارہ کش ہونے کی کوشش کروں گا۔ ناہید کے مشورہ پر ہم دونوں نے ''وظیفہ کی بیشی عمر'' شروع کیا تھا۔ ہم نے حمزہ خان کی گرفت سے نکلنے کے لیے ہی اسے شروع کیا تھا، لیکن اب..... ایسا لگتا تھا کہ شاید ہم اس وظیفے کو جاری نہ رکھ سکیں گے۔

اس خیال سے ہی میرے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ اکیس دن کے وظیفے میں تعطل کا نتیجہ ناقابل تلافی نقصان کی صورت میں بھی نکل سکتا تھا۔ یہ تو سامنے کی بات تھی کہ اس فلیٹ میں کسی اور کی موجودگی میں ہم وظیفہ جاری نہیں رکھ سکتے تھے اور آٹھ راتوں کے بعد ہم وظیفے کی جگہ بھی تبدیل نہیں کر سکتے تھے۔ نہ جانے اب کیا ہونے والا تھا.....؟

ناہید نے میرے سامنے میز پر چائے کا کپ رکھ دیا اور صوفے پر بیٹھ کر بولی۔ ''ہاں، اب بتاؤ، حمزہ خان کیا کہہ رہا تھا؟''

میں نے اسے ساری بات بتا دی۔

''یہ تو واقعی پریشانی والی بات ہے۔'' ناہید نے میرے خاموش ہونے پر کہا۔ ''اگر ہم وظیفہ نہ کر رہے ہوتے تو یہاں کسی کے رہنے پر ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا تھا...... اب کیا ہو گا شہباز؟''

''ظاہر ہے اس صورت حال میں ہم وظیفہ جاری نہیں رکھ سکیں گے۔'' میں نے گہرا سانس لے کر کہا۔

''لل...... لیکن...... یہ کس طرح ممکن ہے شہباز؟'' ناہید ایک دم خوفزدہ ہو گئی تھی۔

''مجبوری ہے۔ فی الحال ہم وظیفہ جاری نہیں رکھ سکتے۔ آئندہ کبھی موقع ملا تو پھر سے اس کمل کرنے کی کوشش کریں گے۔'' میں نے کہا۔

''وظیفے میں تو لکھا تھا کہ وظیفہ ادھورا چھوڑنے پر عامل کو شدید قسم کے نقصان کا سامنا کرنا پڑے گا...... اس کی جان بھی جا سکتی ہے۔''

''ہاں، لیکن ہم آج رات وظیفہ شروع ہی نہیں کریں گے۔'' میں نے کہا۔ ''اس طرح ہماری آٹھ دن کی محنت ضائع ہو گی......''

''میں سمجھی نہیں۔'' ناہید نے جلدی سے میری بات کاٹی۔ ''اگر ہم آج رات وظیفہ شروع ہی نہ کریں تو کیا اس طرح وظیفہ ادھورا نہیں رہ جائے گا؟ ہمیں کوئی نقصان نہیں ہو گا؟''

میں نے غور سے اس کی بات سنی اور چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے چند لمحے سوچتا رہا۔ ''میرا خیال ہے ایسا نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''وظیفے کو ادھورا چھوڑنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اگر کسی رات وظیفے کے دوران ڈراؤنی اور ہیبت ناک شکلیں دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوتے اور وظیفے کے الفاظ دہرانا بند کر دیتے تو ہمیں نقصان ہی ہو سکتا تھا۔ یا اگر ہماری نظریں چراغ کی لو سے ہٹ جاتیں تب ہی کچھ ہو سکتا تھا۔ جیسے، ہمیں جو بھیانک مناظر نظر آئے تھے...... زلزلے کا آنا، بن مانس نما درندے کا نظر آنا جو اپنے لمبے ناخنوں سے تمہیں چیر پھاڑ رہا تھا۔ تمہیں میرے متعلق بھی ایسے مناظر نظر آئے تھے۔ اس دوران میں اگر ہم ڈر کر اٹھ کھڑے ہوتے، وظیفے کے الفاظ دہرانا بند کر دیتے تو شاید ہمارا حشر وہی ہوتا جو ہمیں نظر آیا تھا۔'' میں نے کہہ کر جھرجھری لی۔ ان ہیبت ناک مناظر کو یاد کر کے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ یہی کیفیت ناہید کی بھی تھی۔

''ہاں۔'' ناہید نے دھیرے سے کہا۔ ''جب میں نے دیکھا کہ ایک خوفناک شیر تمہیں چیرنے پھاڑنے والا تھا اور تم مدد کے لیے مجھے پکار رہے تھے تو کوشش کے باوجود میں

د پر قابو نہیں رکھ سکی تھی اور خوفزدہ ہو گئی تھی۔''

''اس دوران میں اگر تم خوفزدہ ہو کر اٹھ کھڑی ہوتیں یا چراغ کی لو سے نظریں ہٹا بتیں تو لوگوں کو ہماری کٹی پھٹی لاشیں ہی ملتیں۔'' میں نے کہا۔ ''لوگ ضرور حیران ہوتے لہ اس پوش علاقے کے ایک فلیٹ میں شیر کہاں سے آ گیا تھا۔''

''مجھے تو ڈر لگ رہا ہے شہباز!'' ناہید نے کہا۔ اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔ 'کچھ ہو نہ جائے......''

میں نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کچھ نہیں ہو گا۔ بھی ہم عصر کی نماز پڑھنے کے بعد کہیں گھومنے چلیں گے۔ کسی قسم کے خوف کو اپنے ذہن میں جگہ مت دو۔ ہمیں ہر قسم کے حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے ہم حمزہ خان کے اشاروں پر چلتے ہوئے جرائم کی دلدل میں ھنستے چلے جائیں گے؟'' ناہید نے انتہائی مایوسی سے کہا۔

''نہیں ناہید! ہم یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں گے۔'' میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''فی الحال ہم حمزہ خان کے کسی جرم میں شریک نہیں ہوئے۔ اس سے پہلے کہ وہ ہمیں استعمال کرے، ہم اس کی دسترس سے دور، کسی محفوظ مقام پر چلے جائیں گے۔''

''ہم نے اسی لئے تو وظیفہ شروع کیا تھا......''

''میں نے سوچ لیا ہے کہ اب ہم کسی وظیفے پر عمل نہیں کریں گے۔'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''جب تک ہم کسی ایسی جگہ نہیں پہنچ جاتے ہیں جہاں آزادانہ طور پر اپنی زندگی کی ابتدا کر دیں۔ یہاں سے نکلنے کے لیے ہمیں اپنی ذہانت اور زور بازو پر اعتقاد کرنا پڑے گا۔''

''میں ہر قدم پر تمہارا ساتھ دوں گی۔'' ناہید نے جذبات سے مغلوب لہجے میں کہا۔

پھر ہم دونوں نے وضو کر کے عصر کی نماز ادا کی اور اس کے بعد فلیٹ سے نکل کر پیدل ہی بے مقصد مختلف سڑکوں پر گھومتے رہے۔ رات آٹھ بجے ایک ریسٹوران میں کھانا کھا کر ہم واپس اپنے فلیٹ پہنچے تو عشاء کا وقت ہو رہا تھا مغرب کی نماز قضا ہو چکی تھی جو ہم نے عشاء کے ساتھ ہی ادا کی۔

ہم کمرے میں آ کر کچھ دیر باتیں کرتے رہے پھر جلد ہی نیند کی آغوش میں چلے گئے۔

☆======☆======☆

وہ ایک دیو قامت پرندہ تھا جو میرے اور ناہید کے گرد منڈلا رہا تھا۔ اس کی شکل اور

جسامت گدھ سے مشابہ تھی، لیکن وہ عام گدھ سے سینکڑوں گنا بڑا تھا۔ اس کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سے ایسا شور پیدا ہو رہا تھا کہ کانوں کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ ناہید اور میں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے پوری قوت سے بھاگ رہے تھے۔ تاحدِ نگاہ چٹیل میدان تھا اور ہم اس پرندہ نما عفریت سے بچنے کے لیے دوڑ رہے تھے۔

اچانک ناہید کا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا وہ ٹھوکر کھا کر منہ کے بل گری اور دور تک گھسٹتی چلی گئی۔ میں اسے اٹھانے کے لیے لپکا لیکن وہ زمین پر گھسٹتی، رگڑ کھاتی مجھ سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ جیسے وہ پہاڑ کی بلندی سے بڑی تیز رفتار سے نیچے گر رہی ہو۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ زمین مسطح تھی اور وہ بدستور آگے لڑھکتی جا رہی تھی۔ میں پوری قوت سے دوڑ کر بھی ناہید تک نہیں پہنچ پا رہا تھا۔

پروں کی پھڑ پھڑاہٹ کا شور بڑھتا جا رہا تھا پھر مجھے احساس ہوا کہ ناہید اس دیوقامت پرندے کے پروں سے پیدا ہونے والے جھکڑوں کی وجہ سے زمین پر گھسٹتی جا رہی ہے۔

اس خیال سے میں ایک دم ٹھہر گیا اور غور کرنے لگا۔ واقعی اب پرندہ ناہید کے اوپر منڈلا رہا تھا اور وہ رفتہ رفتہ گھسٹتی ہوئی مجھ سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے ناہید کے قریب جانے کے لیے ایک بار پھر اس کی طرف دوڑنا چاہا لیکن میں اپنے قدموں کو جنبش تک نہ دے سکا۔ میں نے گھبرا کر اپنے پیروں کی طرف دیکھا اور میری چیخ نکل گئی۔ میرے پیر ٹخنوں تک زمین میں دھنسے ہوئے تھے۔ میں نے زور لگا کر اپنے پیر زمین سے نکالنا چاہے لیکن ناکام رہا۔ مایوسی اور بے بسی کے عالم میں، میں نے نظر اٹھا کر ناہید کی طرف دیکھا تو دہشت سے کانپ کر رہ گیا مکروہ صورت، گدھ نما عفریت اب ناہید پر جھپٹ رہا تھا۔

ناہید نے اس سے بچنے کے لیے اپنے جسم کو سمیٹ لیا لیکن اس حالت میں بھی اس کا وجود زمین پر اِدھر اُدھر گھسٹتا رہا۔

''شہباز......!'' اچانک فضا میں ناہید کی دہشت ناک چیخ بلند ہوئی۔ ''بچاؤ...... شہباز، مجھے اس بلا سے بچاؤ......''

اس کی چیخیں بلند ہوتی جا رہی تھیں اور میں اپنی جگہ پر زمین میں ''گڑا'' کھڑا تھا۔ لاکھ کوشش کے باوجود میں اپنے پیر زمین سے آزاد نہیں کرا سکا تھا۔ اس وقت میں اپنی چیخوں پر قابو نہ رکھ سکا جب میں نے دیکھا کہ پرندے نے فضا میں گردش کرتے ہوئے یکایک اپنے پر سمیٹے اور بڑی تیزی سے ناہید پر لپکا اور اس کے جسم میں پنجے گاڑ کر بلند ہو گیا۔ میں

ید کی چیخیں سن رہا تھا۔ پرندہ اسے اپنے پنجوں میں اٹھائے اب میرے اوپر چکرانے لگا ۔تب مجھے ایسا لگا جیسے بارش ہونے لگی ہو۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ مجھ پر خون کی بارش رہی تھی۔ میرا چہرہ تر ہو گیا۔ دراصل پرندے کے تیز نوکیلے پنجے ناہید کے جسم میں پیوست ے اور اس کے جسم سے خون ابل ابل کر بارش کی صورت میں مجھ پر اور میرے اردگرد گر رہا

میں دھاڑیں مار مار کر رونے لگا لیکن کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ میرے پاؤں زمین نے ڑے ہوئے تھے۔ یکایک پرندے نے ناہید کے جسم کو چھوڑ دیا اور وہ میرے سامنے، ل میرے قریب زمین پر آن گری۔ اس کا وجود لہولہان تھا۔ وہ بری طرح چیخ رہی تھی۔ ے مدد کے لیے پکار رہی تھی۔ پرندے نے ایک بار پھر غوطہ لگایا اور ناہید پر جھپٹا۔

''شہباز......!'' ناہید کی چیخ پھڑ پھڑاہٹ اور شور پر حاوی تھی۔ ''بچاؤ...... شہباز مجھے اس بلا سے بچاؤ......''

یکایک میری آنکھ کھل گئی۔ میرا پورا جسم پسینے سے تر تھا اور آنکھ کھلنے کے باوجود شتناک خواب کا اثر میرے ذہن پر باقی تھا۔ میرے کانوں میں اب بھی ناہید کی یں گونج رہی تھیں۔ ''شہباز......! بچاؤ...... مجھے اس بلا سے بچاؤ۔''

میں اچھل پڑا۔ وہ خواب میں سنائی دینے والی چیخوں کی بازگشت نہیں تھی بلکہ ناہید یقیناً چیخ رہی تھی۔ میں نے اس کے بیڈ کی طرف دیکھا تو دہل کر رہ گیا۔ زیرو پاور کی نیلگوں م روشنی میں ناہید کا جسم کسی نادیدہ وجود سے برسرِ پیکار تھا۔ وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر گویا خود و بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کا لباس بے ترتیب تھا اور بال بُری طرح بکھرے ہوئے ھے۔ وہ بیڈ پر تڑپ رہی تھی اور مدد کے لیے مجھے پکار رہی تھی۔ اس کی گھٹی گھٹی چیخیں کمرے ں گونج رہی تھیں۔ ''شہباز...... بچاؤ...... مجھے اس بلا سے بچاؤ......''

میں تڑپ کر اٹھا اور اس کے بیڈ پر گیا اور اس کے تڑپتے ہوئے وجود کو اپنی بانہوں ں سمیٹ لیا۔ ''ناہید...... ہوش میں آؤ...... یہ کیا ہو رہا ہے تمہیں؟''

یکایک اس کا جسم ساکت ہو گیا اور وہ آنکھیں کھول کر خالی خالی نظروں سے مجھے یکھنے لگی۔ اس کا وجود کپکپا رہا تھا۔ بے اختیار اس نے چھت کی طرف دیکھا جیسے اسے اوپر سی کی موجودگی کا احساس ہو رہا ہو۔ میں نے نرم آواز میں پوچھا۔ ''تم نے کوئی ڈراؤنا واب دیکھا ہے؟''

''خواب......؟'' اس نے سوالیہ انداز میں جواب دیا۔

"ہاں، تم نیند میں چیخ رہی تھیں۔"

وہ چند لمحے مجھے گھورتی رہی پھر نظریں جھکا کر کسمسائی۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میں ب تک اسے اپنی بانہوں کی گرفت میں لئے ہوئے تھا۔ میں نے نرمی سے اسے بستر پر لٹا دیا ر اٹھ کر لائٹ آن کر دی۔ پھر میں کولر سے اس کے لیے پانی کا گلاس بھر لایا۔ چند گھونٹ لے کر اس نے گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ اسے دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی طویل بیماری سے اٹھی ہو۔ اس کی رنگت سرسوں کی طرح زرد ہو رہی تھی۔

"خود کو سنبھالو ناہید!" میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "تم نے خواب میں ایسا کیا دیکھ لیا کہ اس طرح چیخنے لگی تھیں؟"

پھر ناہید نے خواب کے بارے میں رک رک کر مجھے جو کچھ بتایا لفظ بہ لفظ وہی تھا جو میں نے خواب میں دیکھا تھا۔ گویا ہم دونوں نے بالکل ایک ہی خواب دیکھا تھا۔

"وہ پرندہ گدھ سے ملتا جلتا تھا لیکن اس کی جسامت......"

وہ جھرجھری لے کر خاموش ہو گئی۔ پھر میں نے اسے اپنے خواب کے بارے میں بتایا تو وہ حیرت اور خوف سے بیٹھی میری طرف دیکھتی رہی۔

"کتنی عجیب بات ہے شہباز ہے نا......؟" کافی دیر کی خاموشی کے بعد ناہید نے کہا۔

"ہاں، بہت عجیب اور خوفناک۔" میں نے اس کی تائید کی۔ پھر میں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ تین بج رہے تھے۔ "اچھا ناہید، اب سو جاؤ۔" میں نے کہا۔ "فجر کی نماز کے لیے ہمیں اٹھنا بھی ہے۔"

میں ٹیوب لائٹ آف کرنے کے لیے سوئچ بورڈ کی طرح بڑھا تو اچانک ناہید نے کہا۔ "اسے جلنے دو۔"

"کیوں؟"

"اندھیرے میں...... مجھے نیند نہیں آئے گی۔"

مجھے ایسا لگا کہ جیسے وہ "اندھیرے میں مجھے ڈر لگے گا" کہتے کہتے بات بدل گئی تھی حالانکہ کمرے میں بالکل اندھیرا نہیں رہتا تھا۔ زیرو کا بلب جلتا رہتا تھا لیکن میں نے اس کی کیفیت کو دیکھتے ہوئے ٹیوب لائٹ آف نہیں کی اور اپنے بیڈ پر آ کر لیٹ گیا۔ مجھے تیز روشنی میں نیند نہیں آتی لیکن ناہید کی کیفیت کے مدنظر میں نے بازو اپنی آنکھوں پر رکھا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ تھوڑی دیر پہلے دیکھے ہوئے وحشت ناک خواب کے اثرات میرے

ہصاب پر اب بھی باقی تھے۔ میں نہ جانے کتنی دیر تک اس پُراسرار "اتفاق" کے بارے ں سوچتا رہا جو مشترکہ خواب کی صورت میں ناہید اور میرے ساتھ پیش آیا تھا۔

وہ نیند آنے سے پہلے والی خوشگوار کیفیت تھی۔ رفتہ رفتہ غنودگی نیند میں ڈھلنے لگی...... لخت مجھے احساس ہوا جیسے میں کسی بلندی سے نیچے گر رہا ہوں۔ میرے پورے جسم کو جھٹکا لگا ر جب میں نے آنکھیں کھولیں تو میں بیڈ کی پٹی کو مضبوطی سے تھامے ہوئے تھا۔ جاگنے کے باوجود میرے ذہن میں خود کو بلندی سے گرنے سے بچانے کا خیال تھا۔ میرا دل گویا لق میں دھڑک رہا تھا اور جسم پر کپکپی طاری تھی۔ میں کئی لمحے اسی حالت میں پڑا رہا۔ پھر 'دھپ' کی آواز سن کر چونکا اور اس طرف دیکھا جہاں سے آواز آئی تھی۔

ناہید بیڈ سے نیچے گر پڑی تھی اور اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر اسے اٹھنے میں مدد دی۔

"یہ...... یہ کیا ہو رہا ہے شہباز......!" ناہید نے خوفزدہ آواز میں کہا اور رو پڑی۔

یرا ذہن بھی بری طرح سے الجھ گیا تھا۔ میں ایک ہی بات سوچ رہا تھا کہ یقیناً ناہید نے بھی نیند کی حالت میں خود کو بلندی سے گرتے ہوئے محسوس کیا ہو گا اور خود کو بچانے کے لیے اِدھر اُدھر ہاتھ مارنے کے سبب بیڈ سے گر پڑی ہو گی۔ بعد میں میرے اس خیال کی ناہید نے تصدیق کر دی تھی۔ اس نے بھی ایسا ہی محسوس کیا تھا جو نیند کی حالت میں، میں نے کیا تھا۔

میں کافی دیر تک اسے بہلانے کی کوشش کرتا رہا۔ کچی نیند سے اس طرح جاگنے کے سبب میرے سر میں درد ہو رہا تھا۔ یقیناً ناہید بھی ایسا ہی محسوس کر رہی تھی۔ میں نے اٹھتے ہوئے اس سے کہا۔ "تم یہیں بیٹھو، میں چائے بنا کر لاتا ہوں۔"

"ہاں، چائے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔" ناہید نے کمزور آواز میں کہا اور خود بھی اٹھنے لگی۔ "چائے میں بنا کر لاتی ہوں۔"

"نہیں، نہیں۔" میں نے اسے لیٹے رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تم آرام سے لیٹی رہو۔ میں چائے بنا کر لاتا ہوں۔"

"میں بھی کچن میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔" اس نے کہا تو میں سمجھ گیا کہ وہ کمرے میں تنہا رہ جانے کے خیال سے خوفزدہ تھی۔ میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ میں کچن میں پہنچ کر چائے بنانے لگا اور وہ سنک سے منہ پر چھینٹے مار کر چہرے کو پونچھتی ہوئی میرے قریب اسٹول پر بیٹھ گئی۔

چائے پینے کے دوران ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ میں اپنے رویے اور

''ہاں، تم نیند میں چیخ رہی تھیں۔''

وہ چند لمحے مجھے گھورتی رہی پھر نظریں جھکا کر کسمسائی۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میں ب تک اسے اپنی بانہوں کی گرفت میں لئے ہوئے تھا۔ میں نے نرمی سے اسے بستر پر لٹا دیا راٹھ کر لائٹ آن کر دی۔ پھر میں کولر سے اس کے لیے پانی کا گلاس بھر لایا۔ چند گھونٹ لے کر اس نے گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ اسے دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی طویل بیماری سے اٹھی ہو۔ اس کی رنگت سرسوں کی طرح زرد ہو رہی تھی۔

''خود کو سنبھالو ناہید!'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ''تم نے خواب میں ایسا کیا دیکھ لیا کہ اس طرح چیخنے لگی تھیں؟''

پھر ناہید نے خواب کے بارے میں رک رک کر مجھے جو کچھ بتایا لفظ بہ لفظ وہی تھا جو میں نے خواب میں دیکھا تھا۔ گویا ہم دونوں نے بالکل ایک ہی خواب دیکھا تھا۔

''وہ پرندہ گدھ سے ملتا جلتا تھا لیکن اس کی جسامت......''

وہ جھرجھری لے کر خاموش ہوگئی۔ پھر میں نے اسے اپنے خواب کے بارے میں بتایا تو وہ حیرت اور خوف سے بیٹھی میری طرف دیکھتی رہی۔

''کتنی عجیب بات ہے شہباز! ہے نا......؟'' کافی دیر کی خاموشی کے بعد ناہید نے کہا۔

''ہاں، بہت عجیب اور خوفناک۔'' میں نے اس کی تائید کی۔ پھر میں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ تین بج رہے تھے۔ ''اچھا ناہید، اب سو جاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''فجر کی نماز کے لیے ہمیں اٹھنا بھی ہے۔''

میں ٹیوب لائٹ آف کرنے کے لیے سوئچ بورڈ کی طرف بڑھا تو اچانک ناہید نے کہا۔ ''اسے جلنے دو۔''

''کیوں؟''

''اندھیرے میں...... مجھے نیند نہیں آئے گی۔''

مجھے ایسا لگا کہ جیسے وہ ''اندھیرے میں مجھے ڈر لگے گا۔'' کہتے کہتے بات بدل گئی تھی حالانکہ کمرے میں بالکل اندھیرا نہیں رہتا تھا۔ زیرو کا بلب جلتا رہتا تھا لیکن میں نے اس کی کیفیت کو دیکھتے ہوئے ٹیوب لائٹ آف نہیں کی اور اپنے بیڈ پر آ کر لیٹ گیا۔ مجھے تیز روشنی میں نیند نہیں آتی لیکن ناہید کی کیفیت کے مدنظر میں نے بازو اپنی آنکھوں پر رکھا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ تھوڑی دیر پہلے دیکھے ہوئے دہشت ناک خواب کے اثرات میرے

عصاب پر اب بھی باقی تھے۔ میں نہ جانے کتنی دیر تک اس پُراسرار ''اتفاق'' کے بارے ں سوچتا رہا جو مشترکہ خواب کی صورت میں ناہید اور میرے ساتھ پیش آیا تھا۔

وہ نیند آنے سے پہلے والی خوشگوار کیفیت تھی۔ رفتہ رفتہ غنودگی نیند میں ڈھلنے لگی......

لحت مجھے احساس ہوا جیسے میں کسی بلندی سے نیچے گر رہا ہوں۔ میرے پورے جسم کو جھٹکا لگا ر جب میں نے آنکھیں کھولیں تو میں بیڈ کی پٹی کو مضبوطی سے تھامے ہوئے تھا۔ جاگنے ے باوجود میرے ذہن میں خود کو بلندی سے گرنے سے بچانے کا خیال تھا۔ میرا دل گویا لق میں دھڑک رہا تھا اور جسم پر کپکپی طاری تھی۔ میں کئی لمحے اسی حالت میں پڑا رہا۔ پھر 'دھپ'' کی آواز سن کر چونکا اور اس طرف دیکھا جہاں سے آواز آئی تھی۔

ناہید بیڈ سے نیچے گر پڑی تھی اور اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر اسے اٹھنے میں مدد دی۔

''یہ...... یہ کیا ہو رہا ہے شہباز......!'' ناہید نے خوفزدہ آواز میں کہا اور رو پڑی۔

یرا ذہن بھی بری طرح سے الجھ گیا تھا۔ میں ایک ہی بات سوچ رہا تھا کہ یقیناً ناہید نے بھی نیند کی حالت میں خود کو بلندی سے گرتے ہوئے محسوس کیا ہوگا اور خود کو بچانے کے لیے اِدھر اُدھر ہاتھ مارنے کے سبب بیڈ سے گر پڑی ہوگی۔ بعد میں میرے اس خیال کی ناہید نے تصدیق کر دی تھی۔ اس نے بھی ایسا ہی محسوس کیا تھا جو نیند کی حالت میں، میں نے کیا تھا۔

میں کافی دیر تک اسے بہلانے کی کوشش کرتا رہا۔ کچی نیند سے اس طرح جاگنے کے سبب میرے سر میں درد ہو رہا تھا۔ یقیناً ناہید بھی ایسا ہی محسوس کر رہی تھی۔ میں نے اٹھتے ہوئے اس سے کہا۔ ''تم یہیں بیٹھو، میں چائے بنا کر لاتا ہوں۔''

''ہاں، چائے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔'' ناہید نے کمزور آواز میں کہا اور خود بھی اٹھنے لگی۔ ''چائے میں بنا کر لاتی ہوں۔''

''نہیں، نہیں۔'' میں نے اسے لیٹے رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''تم آرام سے لیٹی رہو۔ میں چائے بنا کر لاتا ہوں۔''

''میں بھی کچن میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔'' اس نے کہا تو میں سمجھ گیا کہ وہ کمرے میں تنہا رہ جانے کے خیال سے خوفزدہ تھی۔ میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ میں کچن میں پہنچ کر چائے بنانے لگا اور وہ سنک سے منہ پر چھینٹے مار کر چہرے کو پونچھتی ہوئی میرے قریب ا اسٹول پر بیٹھ گئی۔

چائے پینے کے دوران ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ میں اپنے رویے اور

گفتگو سے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ جو خواب ہم دونوں نے دیکھے تھے ان سے زیادہ خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ خواب صرف خواب ہوتا ہے اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

ہم کمرے میں آ کر بھی سونے کے بجائے باتیں کرتے رہے۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ ناہید کے ذہن پر چھایا ہوا خواب کا خوف کسی حد تک کم ہو گیا۔ فجر کی اذان سن کر ہم نے اٹھ کر وضو کیا اور نماز پڑھ کر اپنے اپنے بیڈ پر لیٹ گیا۔ معمول کے مطابق ہمیں ناشتہ کرنا چاہئے تھا لیکن آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی اور نیند کے آنے سے ہم خوفزدہ بھی تھے کہ نہ جانے اب خواب میں کیسا دہشت ناک منظر ہمیں خوفزدہ کر جائے۔ ناہید کے ذہن میں بھی یقیناً یہی خیال تھا، لیکن وہ اسے ظاہر نہیں کر رہی تھی۔ آخر کار میری آنکھوں کی چبھن بڑھتی گئی اور میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

☆======☆======☆

بہت سکون کی نیند آئی تھی۔ ساڑھے دس بجے کے قریب میری آنکھ کھلی۔ سب سے پہلے میری نظر ناہید کے بیڈ پر گئی اور میں یکدم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ناہید اپنے بستر پر نہیں تھی۔ اسی لمحے باتھ روم کا دروازہ کھلا اور میں نے سکون کی گہری سانس لی۔ ناہید نے دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔ ''کیسی نیند آئی......؟'' وہ گویا یہ جاننا چاہتی تھی کہ پھر تو میں نے کوئی خوفناک خواب نہیں دیکھا۔

میں نے جماہی لیتے ہوئے سکون سے کہا۔ ''بہت اچھی، گہری اور پُرسکون نیند آئی......اور تمہیں؟''

''مجھے بھی۔'' اس نے جواب دیا۔ ''دس منٹ پہلے ہی میری آنکھ کھلی تھی۔ اچھا، اب تم تیار ہو کر جلدی سے کچن میں آ جاؤ۔ میں ناشتہ تیار کرتی ہوں۔'' میں اٹھ کر باتھ روم میں چلا گیا اور ناہید کچن کی طرف بڑھ گئی۔ ناشتے کے دوران میں نے ناہید کو بتایا کہ میں صدر جا کر بینک سے کچھ رقم نکلوانا چاہتا ہوں۔ میں نے اس سے کہا کہ اگر وہ بھی میرے ساتھ چلنا چاہے تو جلدی سے تیار ہو جائے۔

''نہیں، میں یہیں رہوں گی۔'' ناہید نے جواب دیا۔ ''میں کچھ وقت اور سونا چاہتی ہوں۔ ویسے شہباز! تم بڑی رقم بینک سے نکلوا کر گھر میں رکھ دو۔ بار بار بینک جانے سے بچ جاؤ گے۔''

''گھر میں بڑی رقم رکھنا مناسب نہیں ہے۔''

''کچھ نہیں ہوتا۔'' ناہید نے لاپروائی سے کہا۔ ''ہمیں کسی بھی وقت رقم کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ تم ایسا کرو کہ کم سے کم پچیس ہزار نکلوا لو۔''

''اچھی بات ہے۔'' میں نے جواباً اس کی تائید کی۔ اس کی بات کسی حد تک مناسب تھی۔ ہم کسی بھی وقت کوئی قدم اٹھا سکتے تھے۔ کچھ رقم ہمارے پاس موجود ہو گی تو ہماری پریشانیاں کم ہو سکتی تھیں۔

میں ناشتہ کر کے چیک بک اور گاڑی کی چابیاں اٹھا کر باہر آ گیا۔ بینک پہنچ کر میں نے پچیس ہزار روپے نکلوائے اور ضرورت کی کچھ چیزیں خریدنے کے لیے اپنی گاڑی کو کسی مارکیٹ کی طرف موڑ لیا۔ شاپنگ سینٹر سے نکل کر میں نے واپسی کا ارادہ کیا لیکن پھر ایک خیال کے آنے پر رین بو سینٹر کی طرف چل دیا۔ ایک بار سوزو، انڈین فلمیں اور پاکستانی اسٹیج شو کی وڈیو کیسٹیں دلانے کے لیے مجھے یہاں لایا تھا۔ وہاں سے میں نے دس مختلف کیسٹیں خریدیں۔

اس کے بعد میں مختلف سڑکوں پر گاڑی دوڑاتا رہا۔ میرا ذہن درپیش مسائل پر مسلسل سوچ رہا تھا۔ گاڑی مناسب رفتار سے سڑک پر رواں دواں تھی۔ میں اپنے خیالات میں اس قدر الجھا ہوا تھا کہ اس طرف دھیان دے ہی نہیں سکا کہ میں کن علاقوں سے گزر کر اب یہاں پہنچ گیا ہوں۔

اچانک میں ایک شخص کو دیکھ کر چونک گیا۔ میں نے اس کی صرف ایک ہی جھلک دیکھی تھی۔ وہ یقیناً کمال تھا جو حمزہ خان کی کوٹھی پر میرے ہاتھوں ''مقتول'' ہو چکا تھا۔ میں نے گاڑی سڑک کے کنارے کھڑی کر دی...... نیچے اتر کر میں نے پیچھے کی طرف دیکھا...... وہ صد فی صد کمال تھا۔ وہ دکانوں کے سامنے بنے فٹ پاتھ پر چلا آ رہا تھا اور اس کا رخ میری ہی طرف تھا۔ تب میں چونک گیا۔ مجھے احساس ہوا کہ وہ ایک آدمی کے پیچھے چل رہا تھا۔ وہ شخص تھری پیس سوٹ میں تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک پیکٹ تھا جس پر پھولدار کاغذ چڑھا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس پیکٹ میں کسی کو دینے کے لیے کوئی تحفہ ہو۔ عموماً تقریبات میں ایسے گفٹ پیکٹ لے جاتے ہیں۔

کمال کی حرکات سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہ اب بس جھپٹ کر اس شخص کے ہاتھوں سے پیکٹ چھین کر دوڑ لگا دے گا۔ میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا اس کی طرف بڑھنے لگا۔ میں کسی طرح اس پر قابو پانا چاہتا تھا اور پھر حمزہ خان پر واضح کرنا چاہتا تھا کہ میں ان کی چال میں نہیں آیا اور وہ آئندہ کمال کے قتل کے سلسلے میں مجھے بلیک میل نہ کرے۔

اچانک کمال نے چند لمبے ڈگ بھر کر اپنے اور اس شخص کے درمیان قائم فاصلے کو ختم کیا اور اس کے قریب پہنچ کر اس کے ہاتھ سے پیکٹ جھپٹ لیا...... لیکن اس سے پہلے کہ کمال وہاں سے بھاگ سکتا، اچانک پیچھے کچھ فاصلہ رکھ کر چلنے والے دو آدمی چیختے ہوئے اس کی طرف دوڑے۔ اس کا مطلب تھا کہ پیکٹ والے شخص کے پیچھے کچھ اور لوگ بھی لگے ہوئے تھے غالباً کمال کو اس بات کا علم نہیں تھا۔ میں چوکنا ہو گیا۔ اب یقیناً کمال وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرتا۔ میں اس کا پیچھا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

اچانک وہ کچھ ہو گیا جس کی مجھے توقع نہیں تھی۔ ایک دم کمال نے دوڑ لگا دی اور بالکل میرے سامنے سے گزرتا چلا گیا۔ پیچھے دوڑنے والے دونوں آدمیوں میں سے ایک نے پستول نکال کر کمال پر گولی چلا دی، کمال چیختا ہوا گرا، پیکٹ اس کے ہاتھ میں تھا۔

فائر کرنے والا شخص اب میرے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے دوبارہ فائر کرنے کے لیے ہاتھ سیدھا کیا لیکن اسے گولی چلانے کا موقع نہیں مل سکا۔ میں جو ایک کار کی آڑ میں کھڑا ہو گیا تھا، اچھل کر تقریباً اڑتا ہوا اس کے اوپر جا گرا اور اسے ساتھ لیتا ہوا نیچے گرا۔ اس سے پہلے کہ نیچے گرا ہوا آدمی سنبھل سکتا میں نے اس کا پستول والا ہاتھ اپنی گرفت میں لے لیا اور اس دوران میں بے اختیار میری نظر ایک لمحے کے لئے کمال کی طرف اٹھ گئی۔

وہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا بھی لیکن دوبارہ گر گیا۔ اس کی ٹانگ میں گھٹنے سے ذرا اوپر گولی لگی تھی جس سے خون بہہ رہا تھا۔ صرف ایک لمحے کے لیے میں کمال کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں اپنے نیچے دبے ہوئے آدمی کے ہاتھ سے پستول چھیننے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کشمکش میں ٹریگر دب گیا۔ گولی سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی ایک کار کے ٹائر میں لگی اور ٹائر ایک دھماکے سے پھٹ گیا۔ میں اس کا پستول والا ہاتھ مروڑنے لگا دفعتاً میرے سر پر ایک زوردار ٹھوکر لگی۔ یہ ٹھوکر دوسرے آدمی نے ماری تھی۔ میرا دماغ جھنجھنا اٹھا۔ میں نے گھوم کر دیکھا، وہ شخص دوسری ٹھوکر مارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اپنا سر جھٹکے سے ایک طرف ہٹا لیا۔ یہ ٹھوکر میرے نیچے دبے ہوئے شخص کے سر پر لگی۔ وہ بلبلا اٹھا۔ پستول پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے پستول چھینا اور اٹھنے کی کوشش کی۔ دوسرے شخص کے ہاتھ میں بھی پستول تھا لیکن شاید وہ گولی چلائے بغیر مجھے زیر کر لینا چاہتا تھا اور اب اس نے مجھے اٹھتے دیکھا تو مجھ پر پستول تان لیا لیکن میں بھی اب نہتا نہیں تھا۔ نیچے گرے ہوئے شخص کا پستول میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر ٹریگر دبا دیا۔ گولی سامنے کھڑے ہوئے شخص کے دائیں

ڈھے میں لگی۔ پستول اس کے ہاتھ سے گر گیا اور وہ لڑکھڑا کر چند قدم پیچھے کھڑی کار سے ٹکرایا۔

فائرنگ سے بازار میں بھگدڑ سی مچ گئی تھی۔ لوگ اِدھر اُدھر بھاگ کھڑے ہوئے ہے۔ تھری پیس سوٹ والا شخص، جس کے ہاتھ سے کمال نے بیگ چھینا تھا، وہ بھی چیختا ہوا ب طرف بھاگ رہا تھا۔ میں اٹھ کر دوڑتا ہوا کمال تک پہنچ گیا جو اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اس کی ٹانگ سے بہتے ہوئے خون کو دیکھا۔ اس کی سفید پینٹ ن میں تر ہو رہی تھی۔ اس نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''یہ پیکٹ اٹھاؤ...... اور یہاں سے نکل ؤ...... بب...... باس...... سیدھے باس کے پاس جانا......''

''اگر میں تمہیں اس حالت میں چھوڑ گیا تو تم ''دوبارہ'' مر جاؤ گے۔'' میں نے سرد جے میں کہا جس میں طنز بھی تھا۔ اس حالت میں بھی میرے دل میں اس کے لیے ہمدردی کی ق تک نہیں تھی۔

''جج...... جو کچھ ہوا...... باس کے حکم پر ہوا......'' تکلیف کی شدت سے الفاظ رک رک کر ن کے ہونٹوں سے نکل رہے تھے۔ ''مم...... میں دل سے تمہاری قدر کرتا ہوں...... تم ہادر آدمی ہو...... اگر ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔''

ابھی اس کا جملہ مکمل ہوا تھا کہ فضا پے در پے فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔ کمال کے جسم کو جھٹکے لگ رہے تھے۔ تین فائر ہوئے تھے اور چلائی جانے والی تینوں گولیاں کمال کے جسم میں پیوست ہو گئی تھیں۔ میں نے سامنے دیکھا۔ وہ آدمی جس نے سب سے پہلے کمال کی ٹانگ پر گولی چلائی تھی اور جس سے میں نے پستول چھینا تھا...... وہ اپنے زخمی ساتھی کا پستول لیے کھڑا تھا۔ وہ تین گولیاں چلا چکا تھا جو کمال کو لگی تھیں۔ میں نے اسے چوتھی گولی چلانے کا موقع نہیں دیا۔ میں نے پستول والا ہاتھ اٹھا کر ٹریگر دباتا چلا گیا۔ میں نے پوری کوشش کی تھی کہ میری چلائی ہوئی گولی اس کے لیے جان لیوا ثابت نہ ہو۔ میں نے اس کے پیروں پر گولیاں چلائی تھیں۔ میں نے بھی یکے بعد دیگرے تین گولیاں چلائی تھیں جن میں سے غالباً ایک ہی اس کی پنڈلی میں لگی تھی۔ وہ چیختا ہوا ڈھیر ہو گیا۔

کمال ختم ہو چکا تھا۔ اب وہاں رکنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میں نے وہ پیکٹ اٹھا لیا جس کے لیے کمال نے جان دے دی تھی۔ عین اسی لمحے پولیس سائرن کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ میں نے گردن اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ قرب و جوار میں کوئی نہیں تھا۔ سب لوگ جان کے خوف سے بھاگ گئے تھے۔ سڑک کی دوسری طرف دکانوں کے سامنے کچھ لوگ

جمع تھے اور اسی طرف دیکھ رہے تھے۔

میری گاڑی قریب ہی دوسری گاڑیوں کے درمیان کھڑی تھی۔ فوری طور پر میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ اپنی گاڑی میں وہاں سے فرار ہونا خطرناک ہوگا۔ کوئی بھی اس کا نمبر نوٹ کرسکتا تھا اور پھر پولیس بلا تاخیر حمزہ خان تک پہنچ جاتی۔ وہ گاڑی حمزہ خان کی ہی دی ہوئی تھی اور یقیناً اسی کے نام رجسٹر ہوگی۔ کھلی سڑک پر پولیس کی گاڑی میرے پیچھے آسکتی تھی۔

سائرن کی آواز قریب آتی جارہی تھی۔ میں نے ایک ہاتھ میں پستول اور دوسرے ہاتھ میں پیکٹ سنبھالا اور اپنے پیچھے دکانوں اور عمارتوں کے درمیان تنگ گلی میں گھس گیا اور اندھا دھند بھاگنے لگا۔ ایک گٹر کا مین ہول کھلا ہوا دیکھ کر میں نے پستول اس میں پھینک دیا اور ایک دوسری گلی میں گھس گیا۔

کئی گلیوں سے گزر کر میں کافی دور نکل آیا اور بھاگنا موقوف کر کے لمبے لمبے ڈگ بھر کر چلنے لگا اور سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ رات کا وقت ہوتا تو شاید میں تاریکی میں پولیس کو چکمہ دے کر ان کے قریب سے ہی نکل جاتا لیکن یہ دن کا وقت تھا۔ میں جن گلیوں سے گزر رہا تھا، وہ میرے لیے بالکل اجنبی تھیں۔ مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ میں ان گلیوں میں چکراتا ہوا دوبارہ اسی جگہ نہ پہنچ جاؤں جہاں سے بھاگا تھا یا کسی موڑ پر پولیس سے سامنا نہ ہو جائے۔

اب میں تیز تیز قدموں سے چل رہا تھا۔ ان گلیوں میں بعض لوگوں نے مجھے دیکھا بھی، لیکن کسی نے مجھ پر توجہ نہیں دی۔ کیوں کہ یہاں تک فائرنگ کی آواز نہیں پہنچی تھی اور انہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ مین روڈ کی طرف کوئی ہنگامہ ہو چکا ہے۔

آخر کار میں کئی گلیوں سے گزر کر ایک کشادہ سڑک پر نکل آیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ یہاں صورت حال معمول پر تھی۔ مجھے سخت الجھن ہونے لگی۔ ایسے موقع پر علاقے سے ناواقفیت کے سبب میں کسی بھی مشکل میں گرفتار ہوسکتا تھا۔ مجھے اپنی گاڑی کی بھی فکر تھی جو ''موقع واردات'' کے بالکل قریب چھوڑ آیا تھا، لیکن میں یہ سوچ کر خود کو تسلی دیتا رہا کہ حمزہ خان اپنے کسی کارندے کے ذریعے گاڑی منگوالے گا۔ ویسے بھی وہاں پہلے ہی کئی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔

میں اردگرد دیکھتا ہوا تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ مجھے کسی خالی رکشا یا ٹیکسی کی تلاش تھی تاکہ میں جلد سے جلدی اس علاقے سے نکل جاؤں۔ آخر کار مجھے ایک خالی ٹیکسی پان

سگریٹ کے ایک کیبن کے سامنے کھڑی نظر آگئی۔ ٹیکسی ڈرائیور کیبن سے پان لے کر اسے اپنے کلے میں دبا کر انگلیوں پر لگا کتھا سر کے بالوں سے پونچھتا ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔

میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گیا۔ ''ڈیفنس چلو۔'' میں نے ڈرائیور سے کہا۔ ڈرائیور نے ایک دم پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات تھے۔ گویا میں نے اس کی اجازت کے بغیر ٹیکسی میں بیٹھ کر غلطی کی ہو۔

''اسی روپے ہوں گے؟'' ڈرائیور نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ جیسے وہ مجھے دھتکار رہا ہو۔

''اسی روپے.....؟ ہاں، ٹھیک ہے..... چلو'' میں نے کہا اور اس کے چہرے کے تاثرات میں اچانک تبدیلی آگئی۔ شاید اس کا خیال تھا کہ میں کرایہ کم کراؤں گا اور وہ فوراً مجھے اپنی ٹیکسی سے اتر جانے کو کہہ دے گا۔

ٹیکسی چل پڑی۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھ کر علاقے کی شناخت کرنے کی کوشش کرنے لگا لیکن مجھے مایوسی ہوئی شاید میں اس طرف پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ دس منٹ تک چلنے کے بعد مجھے کچھ جانی پہچانی عمارتیں اور سائن بورڈ نظر آنے لگے۔ ایک پل سے گزر کر مجھے دائیں طرف ''گول مسجد'' نظر آئی تو بے اختیار میرے ہونٹوں سے گہری سانس خارج ہو گئی۔ تب مجھے احساس ہوا کہ اتنے سے فاصلے کے ڈرائیور نے اسی روپے کرائے کی صورت میں بہت زیادہ مانگ لئے تھے۔ یعنی تیس کی جگہ اسی روپے..... بہرحال یہ کوئی اتنا اہم مسئلہ نہیں تھا۔ اہم بات یہ تھی کہ میں خیر و عافیت کے ساتھ وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور پیکٹ بھی اپنے ساتھ لے آیا تھا۔

میں نے پہلی بار غور سے پیکٹ کو دیکھا۔ وہ خوشنما، پھولدار پیپر میں لپٹا ہوا تھا۔ میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ آخر اس میں ہے کیا چیز؟

''ہیروئن!'' میرے ذہن میں اپنے سوال کا جواب ابھرا اور میرے پورے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ میں نے پیکٹ کو اپنی گود سے اٹھا کر دونوں ہاتھوں میں تولنے کے سے انداز میں تھاما۔ وہ خاصا وزنی تھا۔ اگر میرا خیال درست تھا تو وہ کروڑوں روپے کا ''مال'' تھا۔

''اس میں کرنسی نوٹ بھی ہوسکتے ہیں۔'' دوسرا خیال ابھرا۔ بہرحال، میں نے اپنے سر کو ہلکے سے جھٹکا۔ اس پیکٹ میں جو کچھ بھی تھا، حقیقت یہ تھی کہ میں جرائم کی دلدل میں عملی

طور پر قدم رکھ چکا تھا۔ میرے دل میں تاسف کی ایک لہر اٹھی اور میں نے اپنے آپ سے عہد کیا کہ جتنا جلد ممکن ہوا میں اس دلدل سے نکلنے کی کوشش کروں گا۔ اس کے لیے مجھے خواہ کچھ بھی کرنا پڑا، میں کر گزروں گا۔

میں نے ٹیکسی سے باہر دیکھا اور ایک شاپنگ سینٹر کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ میری منزل قریب آ گئی ہے۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد میں نے ڈرائیور کو ہدایت کی۔

''سامنے والے کٹ سے سیدھے ہاتھ پر چلو۔''

سڑک کے سے ہٹ کر چند گلیوں سے گزرنے کے بعد ایک جگہ میں نے ٹیکسی رکوائی اور کرایہ ادا کر کے نیچے آ تر آیا۔ مجھے معلوم تھا کہ چند قدموں کے فاصلے پر گلی میں بائیں طرف مڑتے ہی حمزہ خان کی کوٹھی ہے۔ میں نے وہ فاصلہ پیدل طے کیا اور تھوڑی دیر بعد کوٹھی کے سامنے جا پہنچا۔ میں نے کال بیل کا بٹن دبایا تو مسلح چوکیدار نے کواڑ کھول کر باہر جھانکا اور مجھ پر نظر پڑتے ہی پورا کواڑ کھول کر ایک طرف ہو گیا اور مجھے اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے چوکیدار کو میری آمد کے بارے میں بتا دیا گیا تھا۔

میں خاموشی سے اندر داخل ہو گیا۔ رہائشی عمارت کے باہر ایک طرف آج بھی کئی گاڑیاں کھڑی تھیں اور صدر دروازے پر بھی مجھے پہلے کی طرح دو مسلح افراد کھڑے نظر آئے۔ میں جیسے ہی صدر دروازے کی طرف بڑھا، ان میں سے ایک نے میرے لیے دروازہ کھولا تو مجھے یقین ہو گیا کہ حمزہ خان میری یہاں آمد سے باخبر ہے اور غالباً وہ میرا منتظر تھا۔

میں راہداری عبور کر کے ہال کمرے میں پہنچ گیا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا لیکن مجھے اندازہ تھا کہ اس عمارت کے کسی دوسرے حصے میں مجھے دیکھا جا رہا ہے میں نے آگے بڑھ کر پیکٹ کو صوفوں کے سامنے رکھی ٹیبل پر رکھ دیا اور تن کر کھڑا ہو گیا۔

''ویل ڈن شہباز!'' ہال میں اچانک حمزہ خان کی بھاری گونج دار آواز اٹھی۔ ابھی میں ذہنی طور پر تیار ہونے کے باوجود وہ آواز اچانک سن کر چونکا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''آج تم نے بہت عمدہ کام کیا ہے۔ میں تم سے خوش ہوں۔ تم میری توقعات پر پورے اترے ہو۔''

میں نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ ''آج کمال سچ مچ مارا گیا ہے۔''

''مجھے اس کی موت کی خبر مل چکی ہے۔'' حمزہ خان کی آواز ابھری۔ ''اس کی موت کا مجھے دکھ ہے۔ وہ میرا خاص آدمی تھا۔ اب تم اس کی جگہ کام کرو گے۔ تم ہمارے گروپ میں پہلے آدمی ہو جسے ابتداء ہی میں اتنا اہم مقام مل گیا ہے۔''

''مجھے اس مقام کی خواہش......''

''نہیں ہو گی۔'' حمزہ خان نے میری بات کاٹی۔ ''لیکن تم نے خود کو اس کا اہل ثابت کر دیا ہے۔''

''خیر۔'' میں نے لاپروائی سے کہا۔ پھر اونچی آواز میں حمزہ خان سے پوچھا۔ 'جناب! کیا مجھے صرف احکامات کی تعمیل ہی کرنی ہے یا ضرورت کے مطابق میں کوئی سوال بھی پوچھنے کی جرأت کر سکتا ہوں؟''

''تم ہم سے کوئی سوال کرنا چاہتے ہو...... میرا مطلب ہے کوئی بات جاننا چاہتے ہو؟''

''جی ہاں!''

''کہو۔''

اس سے پہلے اس کوٹھی میں میرے ہاتھوں کمال کے قتل کا ڈرامہ کیوں کیا گیا تھا؟''

''پچھلی باتوں کو بھول جاؤ۔''

''کوشش کروں گا۔'' میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''جانتے ہو، آج تم نے کیا کارنامہ انجام دیا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''حقیقت تو یہ ہے کہ میں کمال کو دیکھ کر چونکا تھا اور میں اسے کسی طرح قابو میں کر کے یہاں آپ کے سامنے لانا چاہتا تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا میرے لئے غیر متوقع تھا...... پھر جو کچھ میں نے کیا، میرا خیال ہے کہ آپ کی ملازمت اختیار کرنے کے بعد میرے لیے ضروری ہو گیا تھا۔ میں نے وہی کیا جس کو میں نے اپنی ذمے داری سمجھا۔''

آخری چند جملے میں نے قصداً اپنے دل پر جبر کر کے ادا کیے تھے۔ میں حمزہ خان کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے یہ موقع گنوانا نہیں چاہتا تھا۔

''گڈ!'' حمزہ خان کی آواز آئی۔ ''آج اشرف خان اپنی بوٹیاں نوچ رہا ہو گا۔ میں تمہیں یہ بات بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ آج تم جو مال گفٹ پیکٹ کی صورت میں یہاں لائے ہو۔ یہ اشرف خان کا ہے۔ اس میدان میں وہ ہمارا بہت بڑا حریف ہے۔ پچھلے دنوں اس خبیث آدمی نے پولیس کو مخبری کر کے ہمارا مال پکڑا دیا تھا۔ مجھے جلد ہی معلوم ہو گیا تھا کہ یہ اسی کی حرکت ہے۔ مجھے خاصا نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ اس دن کے بعد سے میں موقع کی تلاش میں تھا۔ کل مجھے اطلاع ملی تھی کہ اشرف خان اپنے گودام سے مال کو فیکٹری پہنچانے والا ہے۔ بظاہر وہ پلاسٹک کے کھلونے ایکسپورٹ کرتا ہے۔ کھلونے بنانے کی فیکٹری اس

کی اپنی ہے وہ کھلونوں کے اندر ہیروئن چھپا کر اسمگل کرتا ہے۔ اشرف خان بڑے محفوظ طریقے سے کام کرتا ہے۔ میری لاکھ کوشش کے باوجود آج تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کے ذرائع کیا ہیں۔ میرا مطلب ہے وہ ''مال'' کس پارٹی سے حاصل کرتا ہے اور کس راستے سے گزر کر اس تک پہنچتا ہے...... خیر، آئندہ چند دنوں میں اس کی فیکٹری میں تیار ہونے والے کھلونوں کی کھیپ باہر جانے والی ہے اور وہ کھلونوں میں ہیروئن چھپا کر بھیج دیتا۔ آج اسی مقصد سے وہ مال فیکٹری میں پہنچانا چاہتا تھا۔''

حمزہ خان ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ دھیرے سے ہنسا ہو، پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''تم نے دیکھا، اشرف خان کا آدمی کس طرح سے عام سے انداز میں ایک گفٹ پیکٹ میں مال چھپا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جا رہا تھا۔ کسی کو شبہ ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس سلسلے میں کمال جیسا آدمی بھی دھوکا کھا گیا۔ اسے معلوم ہی نہیں ہو سکا کہ جس شخص کے ہاتھوں سے وہ پیکٹ چھیننے جا رہا ہے۔ اسے دو آدمی فاصلہ رکھ کر کور کر رہے ہیں۔ بہر حال اب میں اشرف خان سے بات کروں گا۔''

''کس سلسلے میں؟'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

''مال کے سلسلے میں۔'' حمزہ خان نے جواب دیا۔ ''یہ مال اسے فروخت بھی تو کرنا ہے۔''

''اس کا چھینا ہوا مال آپ اسی کو فروخت کریں گے؟'' میں نے حقیقی حیرت سے پوچھا۔

''ہاں'' وہ واضح طور پر دھیرے سے ہنسا۔

''اسے معلوم ہو گیا کہ یہ اسی کا مال ہے تو پھر......؟'' میں نے اپنے ذہن میں اٹھنے والا سوال دہرایا۔ بات یہ تھی کہ میں نے جس گروپ میں مجبوراً شمولیت اختیار کر لی تھی، ان کے طور طریقوں سے آگاہ ہونا بھی چاہتا تھا۔ ممکن ہے یہ معلومات بعد میں میرے کام آتی۔

''یہ بات تو میں اسے خود بتاؤں گا۔'' حمزہ خان کی آواز سنائی دی۔ یقیناً وہ دل ہی دل میں محظوظ ہو رہا تھا اور میری حیرت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

''یعنی آپ خود اسے بتائیں گے کہ اس کا مال آپ نے ہتھیا لیا ہے اور اب اسے آپ اسی کو فروخت کرنا چاہتے ہیں...... پھر بھی وہ آپ سے خرید لے گا؟''

''یقیناً خریدے گا۔'' حمزہ خان نے کہا۔ ''مجھ سے نہیں خریدے گا تو کسی اور سے خریدے گا، لیکن کسی اور پارٹی سے رابطہ کرنے میں مال حاصل کرنے میں اسے وقت لگے

ا۔ جبکہ باہر کی پارٹی کو وقت پر مال پہنچانا اس کے لیے ضروری ہوگا۔ وہ مجھے زیادہ رقم دے لر بھی آج ہی مال حاصل کرنا چاہے گا۔''

میں نے دھیرے سے سر کو جھٹکا اور اچانک ایک بات یاد آنے پر میں بول اٹھا۔ 'جناب! میں اپنی گاڑی وہیں چھوڑ آیا تھا۔ آپ کسی کو بھیج کر......''

''ہاں، میں جمیل کو بھیج رہا ہوں۔'' حمزہ خان نے کہا۔ ''تم اسے چابی دے دو تھوڑی ی کے بعد تمہاری گاڑی یہاں پہنچ جائے گی...... شہباز! تمہارے اندر فوری اور درست بلہ کرنے کی صلاحیت ہے جو مجھے پسند آئی ہے۔ آج تم نے سارے کام نہایت ذہانت ے انجام دیے ہیں۔ بہر حال جمیل تمہیں ایک لفافہ دے گا، اسے تم رکھ لینا۔ اس میں وجود رقم تمہارا انعام ہے۔''

میں نے اس کی بات پر توجہ دیئے بغیر کہا۔ ''آپ نے دو غیر ملکی مہمانوں کا ذکر کیا ا۔''

''ہاں، وہ آج رات یہاں پہنچیں گے۔ تم آٹھ بجے تک آ جانا۔ وہ دونوں تمہارے یٹ میں رہیں گے۔ پہلے بھی جب وہ پاکستان آتے تھے تو اسی فلیٹ میں رہتے تھے۔ اصل میں نہیں چاہتا کہ وہ کسی ہوٹل میں رہیں۔ تم ان سے ملو، ہو سکتا ہے کبھی تمہیں ان کے ل جانا پڑے۔ اس لیے ان کا تمہارے ساتھ رہنا بہتر ہے تاکہ تم بے تکلفی پیدا کر کے ان ے دوستی کر لو۔ یہ آئندہ تمہارے کام آئے گی۔''

''بہتر ہے جناب!'' میں نے دھیرے سے کہا۔ اسی لمحے ایک لمبا تڑنگا نوجوان ہال ں داخل ہوا۔ اس کے بال شانوں تک آ رہے تھے۔ وہ ایک خوبرو نوجوان تھا۔ پہلی نظر میں کسی میوزک گروپ کا ممبر معلوم ہوتا تھا۔ اس نے ایک لفافہ میری طرف بڑھایا اور سپاٹ جے میں بولا۔ ''اپنی گاڑی کی چابی دیجیے۔''

اس نے کسی تعارف یا مجھ سے مصافحہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ بہر حال ں سمجھ گیا کہ وہ جمیل ہے۔ میں نے خاموشی سے لفافہ لے کر جیب سے چابی نکالی اور اس کی رف بڑھا دی۔ اس کی کلائی میں ایک موٹی سی زنجیر پڑی ہوئی تھی۔ وہ چابی لے کر خاموشی ے چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی حمزہ خان کی آواز آئی۔ ''تم یہیں بیٹھ کر انتظار کرو۔ ملازم ہارے لیے کافی لا رہا ہے۔ گاڑی آ جائے تو تم اپنے فلیٹ پر چلے جانا۔'' اس کے ساتھ ہی اں خاموشی چھا گئی۔ میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک ملازم میرے سامنے کافی کا

کپ رکھ گیا۔ کافی پیتے ہوئے میں درپیش حالات پر غور کرتا رہا۔

کافی ختم کر کے میں جمیل کا انتظار کرنے لگا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ جھومتا ہوا ہال میں داخل ہوا اور چابی میرے سامنے میز پر پھینکتے ہوئے بولا۔ ''میں گاڑی لے آیا ہوں باہر کھڑی ہے۔''

اس کی اس بدتہذیبی اور اکھڑ انداز پر میں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کے رہ گیا لیکن میں نے خود پر قابو رکھا اور چابی اٹھا کر تیز تیز قدم اٹھاتا باہر آ گیا۔ کوٹھی کے گیٹ کے سامنے ہی گلی کے کنارے میری کار کھڑی تھی میں نے جھنجلا کر گاڑی اسٹارٹ کی اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اس سے پہلے کمال کا رویہ بھی میرے ساتھ ایسا ہی تھا جیسا جمیل کا تھا۔ گویا یہاں سب کو اپنے آپ پر بڑا گھمنڈ تھا۔

☆======☆======☆

میں اپنے فلیٹ پر پہنچا تو دن کے تقریباً دو بج رہے تھے۔ سخت بھوک لگی ہوئی تھی۔ ناہید نے بھی میرے انتظار میں کھانا نہیں کھایا تھا۔ کھانے کے دوران مجھے خاموش خاموش اور گم صم دیکھ کر ناہید نے کہا۔ ''کیا بات ہے شہباز! تم کچھ پریشان ہو؟''

''ہوں'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''کچھ کہا تم نے؟''

''میں پوچھ رہی تھی کہ تم کچھ پریشان نظر آ رہے ہو۔'' ناہید نے غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''صبح تم چیک کیش کرانے گئے تھے لیکن واپسی میں تم نے بہت دیر لگا دی۔ کہاں چلے گئے تھے؟''

میں نے گہرا سانس لے کر کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ پھر میں نے کہا۔ ''ناہید! اب ہم بہت بری جگہ پھنس گئے ہیں۔ میں یہاں سے بھاگ جانا چاہتا ہوں...... اگر ہم نے دیر کر دی تو شاید ہم کبھی واپس نہیں جا سکیں گے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ اگر میں نے حمزہ خان کے احکامات پر عمل کرنا شروع کر دیا تو زیادہ دن نہیں جی سکوں گا......''

''یہ...... یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔'' ناہید ایک دم پریشان ہو گئی۔ ''خدارا ایسی باتیں مت کرو...... م...... میں...... میں تو تمہارے بغیر......'' وہ اپنا جملہ مکمل نہ کر سکی۔ اس کی آواز رندھ گئی تھی۔

میں نے اس کا ہاتھ تھپک کر اسے تسلی دی۔ پھر نرم لہجے میں کہا۔ ''تمہیں پتا ہے...... آج میں نے ایک بار پھر کمال کو دیکھا تھا۔''

''کک...... کیا واقعی؟''

''ہاں، میں نے پہلے بھی اسے کار چلاتے ہوئے دیکھا تھا لیکن تم نے میری اس بات کو میرا وہم کہہ کر جھٹلا دیا تھا لیکن وہ میرا وہم نہیں تھا۔ حمزہ کی کوٹھی میں جو کچھ ہوا، وہ محض ڈراما تھا تاکہ وہ مجھے آئندہ بلیک میل کر کے اپنے اشاروں پر چلا سکے۔ آج میں نے ایک جگہ کمال کو دوبارہ دیکھا تو میں نے اسے پکڑنے کی کوشش کی......''

''پھر؟'' ناہید نے بے چینی سے پوچھا۔

''پھر...... وہ سچ مچ مر گیا۔ میرے سامنے......''

''تم نے اسے مار دیا؟'' ناہید نے جلدی سے میری بات کاٹی۔

''نہیں میں نے اسے نہیں مارا۔'' میں نے کہا۔ ''میں تو اسے زندہ سلامت حمزہ خان کے سامنے لے جانا چاہتا تھا۔''

پھر میں نے پوری بات تفصیل کے ساتھ ناہید کو بتا دی اور حمزہ خان کا دیا ہوا لفافہ بھی میز پر رکھ دیا۔ چند لمحے خاموشی رہی پھر ناہید نے میز سے لفافہ اٹھا کر اسے کھولا اور اس میں جھانک کر بولی۔ ''اس میں تو خاصی بڑی رقم ہے۔''

میں نے اس کے ہاتھ سے لفافہ لے لیا اور نوٹ باہر نکال لئے۔ وہ ہزار ہزار کے نئے نوٹوں کی نصف گڈی تھی، یعنی پورے پچاس ہزار روپے۔ میں گم صم بیٹھا ان نوٹوں کو گھورتا رہا۔ پھر میں نے کہا۔

''دیکھا ناہید! اس کام میں یہ سب ہوتا ہے اگر میں مارا گیا یا پکڑا گیا تو میری جگہ کوئی اور آ جائے گا...... جیسے کمال کے بعد حمزہ خان نے مجھے اس کی جگہ دے دی۔ حمزہ خان کو کیا فرق پڑتا ہے کمال ہو یا شہباز...... یا شہباز کے بعد کوئی اور...... اس کا کام تو چلتا رہے گا۔''

''پھر اس بارے میں کچھ سوچو شہباز!'' ناہید نے پریشانی سے کہا۔ ''واقعی اس کام میں تو خطرہ ہی خطرہ ہے۔ شکر ہے کہ تم ابھی اس میں زیادہ ملوث نہیں ہوئے۔ یہاں سے نکل چلو، کہیں دور...... جہاں ہم سکون سے زندگی بسر کر سکیں۔''

''ہم کہاں جائیں گے؟'' میں نے مایوسی سے کہا۔ ''میں حمزہ خان کے چنگل سے نکلنا تو چاہتا ہوں لیکن یہ سوچ کر پریشان ہو جاتا ہوں کہ آخر ہم جائیں تو جائیں کہاں؟ ہم اپنے گاؤں نہیں جا سکتے۔ وہاں چوہدری اسلم...... میرا مطلب ہے، تمہارے والد ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ میرا ایک ہی اچھا دوست تھا، ارشد جس کے پاس ہم بہاولپور گئے تھے۔ وہاں بھی ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ ہمیں وہاں سے بھاگنا پڑا۔ نہ جانے ہمارے بعد ارشد اور

اس کے گھر والوں پر کیا بیتی ہوگی۔''

''دنیا بہت وسیع ہے شہباز!'' ناہید نے مضبوط لہجے میں کہا تو میں چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بولتی رہی۔ ''ہمارے چھوٹے سے گاؤں، بہاولپور یا کراچی پر دنیا ختم نہیں ہو جاتی۔ دنیا کو تو چھوڑو ہمارا ملک بھی کم وسیع نہیں ہے۔ کیا اس کی وسعت میں ہم دو افراد گمنامی کی زندگی بسر نہیں کر سکتے؟ بس تم یہاں سے کسی طرح نکلنے کی سوچو۔ ابھی تم باقاعدہ طور پر حمزہ خان کے گروہ میں شامل نہیں ہوئے۔ تم نے اس کی ملازمت قبول ضرور کی ہے لیکن اس کے رازوں سے واقف نہیں ہو۔ اگر اب ہم یہاں نکل گئے تو وہ بھی ہماری زیادہ فکر نہیں کرے گا اور ہماری گمشدگی کو اہمیت نہیں دے گا، لیکن اگر تم نے کچھ عرصہ اس کے لیے باقاعدہ کام کیا۔ اس کے طور طریقے سے آگاہ ہوئے اور اس کے خفیہ اڈوں اور گروہ کے دوسرے افراد سے میل جول بڑھایا تو یقیناً وہ پھر ہمارا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔''

''ہاں، کہتی تو تم ٹھیک ہو۔'' میں نے سوچتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

میری طرف سے تائیدی الفاظ سن کے وہ مزید جوش سے بولنے لگی۔ ''ہمارے پاس رقم بھی کافی ہے ہم کسی دوسرے شہر جا کر وہاں کے کسی بینک میں رقم منتقل کر دیں گے۔ ہمارے اکاؤنٹ میں موجود رقم کچھ کم تو نہیں ہے...... ایک کروڑ روپے سے زیادہ ہیں۔ یہ رقم ہمارے بہت کام آئے گی۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے گہرا سانس لے کر کہا۔ ''کوئی مناسب موقع دیکھ کر ہم یہاں سے نکل چلیں گے۔ پھر تقدیر جہاں لے جائے...... ویسے بھی کچھ دن تو ہمارے پاس ہیں۔ آج حمزہ خان کے دو غیر ملکی مہمان آنے والے ہیں۔ حمزہ خان نے کہا تھا کہ وہ ایک ہفتہ ہمارے ہاں ٹھہریں گے۔ ان کے جاتے ہی ہم بھی یہاں سے کسی طرف نکل چلیں گے۔ کہاں......؟ اس دوران میں ہم سوچ کر کوئی فیصلہ کریں گے؟''

''ہاں، یہ ٹھیک رہے گا......'' ناہید نے کہا پھر کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ''شہباز! کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم کسی دور دراز کے گمنام سے گاؤں میں جا کر رہیں؟ وہاں ہم ایک اچھا سا گھر بنوائیں...... ہاں، ایسا کرنا شہباز کہ تم وہاں کچھ زمین خرید کر زمینداری شروع کر دینا۔ اباجی کے ساتھ رہ کر تمہیں اس کا تجربہ بھی ہو چکا ہوگا نا...... ہاں، یہی ٹھیک رہے گا۔ رقم تو ہمارے پاس بہت ہے، کسی گاؤں میں تم زمین خرید لینا۔ اپنا گھر ہوگا پھر تم چوکیدار اور باڈی گارڈ رکھ لینا۔ ایک دفعہ کہیں ہمارے قدم جم جائیں تو پھر ہم ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کر سکیں گے......''

''ہیلو'' میں نے اس کے چہرے کے سامنے چٹکی بجاتے ہوئے ہنس کر کہا۔ ''بس، ب جاگ جاؤ ناہید بی بی! یہ بیٹھے بیٹھے تم کیسے خواب دیکھنے لگیں۔ تم نے تو شیخ چلی کو بھی ت دے دی۔'' یہ کہہ کر میں نے بے اختیار قہقہہ لگایا۔

''کیوں؟'' وہ تنک کر بولی۔ ''اس میں شیخ چلی بننے والی کون سی بات ہے؟ میں نے کچھ کہا ہے، بتاؤ اس میں کیا غلط ہے؟ ہمیں اگر یہاں سے نکلنا ہے تو کسی بڑے شہر کا رخ یں کریں گے۔ اگر ہمیں تلاش کیا گیا تو بڑے شہروں میں ہی کیا جائے گا۔ ہم کسی گمنام سے ر دراز کے گاؤں یا قصبے میں ہی محفوظ رہ سکتے ہیں۔''

میں نے چند لمحے غور کیا تو مجھے ناہید کی باتوں میں وزن محسوس ہوا۔ میں نے اس سلسلے ں اس طرح نہیں سوچا تھا۔ ناہید کا مشورہ واقعی قابل عمل اور خاصا محفوظ تھا۔ اس میں احت یہ تھی کہ کسی بھی دور دراز قصبے میں زمین خریدنے اور رہائش اختیار کرنے کے لیے ریعے کی ضرورت ہمیں بہرحال پڑتی۔ ہم ایسے ہی منہ اٹھائے کہیں نہیں جا سکتے تھے کہ ہمیں راز مین مل جاتی اور ہم وہاں رہائش اختیار کر لیتے۔ اس طرح تو ہم گاؤں میں بھی مشکوک و جاتے۔ بہرحال اس بارے میں سوچا جا سکتا تھا۔ اس دوران میں بار بار میرے ذہن ں بہاولپور اور اپنے دوست ارشد کا خیال ابھرتا رہا۔

اس کے بعد ہم کمرے میں جا کر سو گئے۔ شام پانچ بجے ہم دونوں اکٹھے بیدار دئے۔ چائے پیتے ہوئے ہم نے کچھ دیر کے لیے ساحل پر جانے کا پروگرام بنایا گاڑی کو ن لینڈ کی پارکنگ میں کھڑی کر کے ہم پیدل ہی ساحل کی طرف چلے دیے۔ اس وقت فن نڈ میں لوگوں کی بھیڑ نہیں تھی لیکن سورج غروب ہوتے ہی یہاں کی رونقیں جاگ اٹھتی یں۔ ایک بار میں نے ناہید کے ساتھ یہاں کافی وقت گزارا تھا۔

ہم ساحل پر بنی حفاظتی دیوار کے اوپر سے گزر کر سمندر کی حدود میں داخل ہو گئے۔ ہم ساحل کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے دھیمے قدموں سے کافی دور نکل گئے۔ لہریں ہمارے دموں کو چھو کر پلٹتی رہیں کبھی کبھی کوئی لہر ہماری پنڈلیوں تک بھگو جاتی۔

یہ سب کچھ ہمیں بہت اچھا لگ رہا تھا۔ پھر تھک کر ہم حفاظتی دیوار پر بیٹھ گئے اور روب آفتاب کا دلکش منظر دیکھتے رہے۔

جب تاریکی رفتہ رفتہ دن کے اجالے کو نگلنے لگی تو ہم اٹھ کر واپسی کے لیے چل پے۔ ہم واپس اپنے فلیٹ پر جانا چاہتے تھے کیونکہ مجھے آٹھ بجے حمزہ خان کی کوٹھی پر پہنچنا ھا اور اس کے لیے مجھے تیار بھی ہونا تھا۔

فن لینڈ کی متوازی سڑک پر چلتے ہوئے ہم پارکنگ کی طرف جا رہے تھے ہمارے دائیں ہاتھ پر ایک وسیع میدان تھا اور بائیں طرف فن لینڈ کی چار دیواری تھی۔ اس وقت مکمل طور پر تاریکی چھا چکی تھی۔ ہم سڑک کے کنارے چل رہے تھے۔ ناہید کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ وہ میری کسی بات پر ہنس رہی تھی اسی وقت میں نے اپنے عقب میں کسی گاڑی کے انجن کی آواز سنی اور میں ناہید کے ساتھ سڑک کے کنارے پر ہو گیا۔ چند لمحوں کے بعد مجھے عجیب سا احساس ہوا اس وقت تک ہمارے پیچھے آنے والی گاڑی کو گزر جانا چاہئے تھا لیکن وہ اب تک ہمارے پیچھے تھی۔ دوسری عجیب بات یہ ہوئی کہ اس کی ہیڈ لائٹس بجھ گئی تھیں۔

دفعتاً میری چھٹی حس نے مجھے خطرے کا احساس دلایا۔ ناہید کے ہاتھ پر میرے ہاتھ کی گرفت سخت ہو گئی اور میں نے بے اختیار پلٹ کر دیکھا...... لیکن مجھے دیر ہو چکی تھی میں نے ایک سائے کو ناہید کی پشت پر دیکھا جس نے لپک کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کرتا مجھے اپنے سر کی پشت پر کسی ٹھوس چیز کے ٹکرانے کا احساس ہوا۔ ضرب شدید تھی، لڑکھڑانے کے باوجود میں اس سائے کی طرف لپکا تھا جو ناہید کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اس کی آواز دبانے کی کوشش کر رہا تھا۔ دوسرا وار میری گدی پر کیا گیا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میری آنکھوں کے سامنے کئی نیلے پیلے سورج طلوع ہو گئے ہوں اور دوسرے ہی لمحے معدوم ہو گئے۔ میں منہ کے بل گرنے لگا۔ گرتے گرتے میں نے محسوس کیا کہ کسی نے مجھے تھام لیا ہے اور میرے کانوں نے ناہید کی گھٹی گھٹی سی چیخ سنی۔ پھر گویا کائنات ساکت ہو گئی۔

میرے ذہن پر بے ہوشی کی سیاہ چادر پھیل گئی۔

☆======☆======☆

جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو سرد فرش پر پایا۔ میں کئی لمحے تک اسی حالت میں پڑا رہا۔ سر میں شدید درد محسوس ہو رہا تھا۔ کافی دیر کے بعد میں نے سر گھما کر ارد گرد کا جائزہ لیا۔ وہ تقریباً دس بائی دس فٹ کا کمرا تھا۔ دیوار کے ساتھ لکڑی کی دو کرسیاں اور ایک پرانی سی میز رکھی تھی۔ دیوار پر ایک سات سال پرانا کیلنڈر لٹک رہا تھا۔ اس پر کسی فلم ایکٹریس کی تصویر تھی جس کا رنگ اڑ چکا تھا اور اس کے کناروں پر مکھیوں نے بیل بوٹے بنا رکھے تھے۔ ایک طرف دیوار میں کھڑکی لگی ہوئی تھی جس کے پٹ غائب ہو چکے تھے البتہ اس میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔

کھڑکی میں ایک بجلی کا تار گزر کر کمرے کے وسط میں لگے ہوئے کنڈے سے لپٹا ہوا تھا اور تار کا ایک سرا لٹک رہا تھا۔ جس کے ذریعے سو واٹ کا بلب کمرے میں زرد روشنی پھیلا رہا تھا۔ سر میں اٹھنے والی درد کی ٹیسوں سے مجبور ہو کر میں کمرے کا مزید جائزہ لینے کا ارادہ موقوف کر کے دونوں ہاتھوں سے سر کو دبانے لگا۔ سر کے پچھلے حصے کی کھال غالباً پھٹ چکی تھی۔ وہاں مجھے خون کی نمی کے ساتھ بال چپکے ہوئے محسوس ہوئے۔ کنپٹی پر بھی گومڑا ابھر آیا تھا۔

کافی دیر کے بعد جب میں درد کی لہروں پر قابو پانے میں کامیاب ہوا تو میرے ذہن میں سب سے پہلا سوال ابھرا کہ آخر یہ کون لوگ ہیں جنہوں نے ہمیں اس طرح اغوا کیا ہے؟ میں کافی سوچ بچار کے بعد بھی اس سوال کا جواب تلاش کرنے میں ناکام رہا۔

یک لخت میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔ میں نے دھیمی کراہوں کی آوازیں سنی تھیں جو یقیناً ناہید کی تھیں۔ اٹھتے اٹھتے میں لڑکھڑا گیا۔ اگر میں دوبارہ بیٹھ نہ جاتا تو یقیناً گر جاتا۔ سر بری طرح سے چکرا رہا تھا۔ ناہید کے کراہنے کی آوازیں مسلسل آ رہی تھیں۔ جس سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ بھی یہیں کہیں میرے قریب ہی موجود ہے۔ اس خیال نے گویا میرے وجود کو توانائی عطا کی اور میں دوبارہ کھڑا ہو گیا۔ مضبوطی سے قدم جماتا میں سلاخ دار کھڑکی کی طرف بڑھا...... دوسری طرف بھی ایسا ہی ایک کمرہ تھا جس میں ایک چارپائی پڑی ہوئی تھی اور اس چارپائی پر ناہید لیٹی ہوئی تھی۔ وہ غالباً ہوش میں آ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں سے ہلکی ہلکی کراہیں نکل رہی تھیں۔

''ناہید......!'' میں نے بے اختیار اسے پکارا، لیکن ایسا محسوس ہوا جیسے میری آواز اس تک نہیں پہنچی۔ دوسری بار میں نے قدرے اونچی آواز میں اسے پکارا۔

ناہید تو متوجہ نہیں ہوئی البتہ میرے قید خانے کے دروازے کے پیچھے آہٹ ہوئی اور پھر دروازہ کھل گیا۔ دروازے پر دو آدمی کھڑے تھے جن کے چہروں پر گھنی مونچھیں تھیں۔ ایک کے ہاتھ میں چوڑے پھل والی چمکتی ہوئی کلہاڑی تھی اور دوسرے کے ہاتھ میں پستول تھا۔

''ہوش میں آ گئے ہو تو شور کیوں مچا رہے ہو؟'' کلہاڑی والے نے کرخت لہجے میں کہا۔ ''کیا پھر تمہیں بے ہوش کر دیں؟''

''آخر اس حرکت کا کیا مقصد ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کیسی حرکت بابا؟'' کلہاڑی والے نے کہا۔ اس کے لہجے میں واضح طنز تھا۔

''تم لوگوں نے ہمیں کیوں اغوا کیا ہے؟''

''رئیس کے حکم پر!''

''رئیس......! کون رئیس؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''اس کی ہم سے کیا دشمنی ہے؟''

''رئیس قادر خان......!'' کلہاڑی والے نے بتایا۔ ''اس کی تم سے کیا دشمنی ہے، یہ تو تمہیں پتا ہوگا۔''

''نہیں، میں اس شخص کا نام پہلی بار سن رہا ہوں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ اب سر کا درد قابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے دو قدم دروازے کی طرف بڑھا۔

''خبردار! وہیں کھڑے رہو۔'' کلہاڑی والے نے مجھے للکارا۔ اس کے ساتھی نے جلدی سے مجھ پر پستول تان لیا۔ اس کے انداز سے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میری ذرا سی بھی حرکت پر وہ بے دریغ مجھ پر فائر کر دے گا۔ کلہاڑی والا بھی چوکنا ہو گیا تھا۔ وہ دونوں اب بھی دروازے سے باہر ہی کھڑے تھے۔ میں نے اپنے قدم وہیں روک لیے۔

''تم لوگوں کو یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' میں نے تحمل سے کہا۔ پستول والا بے ڈھنگے انداز میں ہنسا اور اپنے ساتھی سے بولا۔

''پگل! یہ بولتا ہے ہم سے غلطی ہوئی ہے......'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''ٹھیک ہے بابا، ہم سے غلطی ہو سکتی لیکن رئیس تو چریا نہیں ہے نا اسی نے ہمیں تم دونوں کو اٹھانے کا حکم دیا تھا۔''

''مگر کیوں؟'' میں جھنجلا کر بولا۔ ''ہم نے آخر اس کا کیا بگاڑا ہے؟''

''یہ تو تم کو رئیس ہی بتائے گا، ہم تو حکم کے غلام ہیں۔'' پستول والے نے بے پروائی سے کہا۔

''کہاں ہے تمہارا رئیس؟ میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''بس، بس...... زیادہ شور نہیں کرو۔'' کلہاڑی والا ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ''رئیس کراچی میں ہے۔ وہ صبح آئے گا۔ ابھی تھوڑی دیر میں تم کو کھانا ملے گا، کھا لینا۔ تمہاری معشوقہ بھی دوسرے کمرے میں ہے۔ بیچ میں بغیر پٹ والی کھڑکی ہے۔ اس سے بات چیت کر کے دل بہلا نا لیکن خبردار! آواز باہر نہیں آنی چاہئے۔''

اس کی بات سن کر مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے کہا۔ ''وہ میری معشوقہ نہیں، بیوی ہے۔''

''ایں......'' کلہاڑی والا چونکا، پھر اپنے ساتھی سے بولا۔ ''یہ اپنے رئیس کو شادی

دہ عورتوں کو اٹھوانے کا شوق کب سے ہو گیا؟''

پستول والے نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے دروازہ بند کر دیا۔ میں پلٹ کر کھڑکی کے قریب آیا۔ ناہید اب ہوش میں آ چکی تھی اور چارپائی پر بیٹھی غالباً ہماری گفتگو سن رہی تھی۔ مجھے کھڑکی کے سامنے آتا دیکھ کر وہ چارپائی سے اٹھی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی میرے قریب آ گئی۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور آنکھوں میں وحشت تھی۔

''یہ...... یہ سب کیا ہو رہا ہے شہباز!'' اس نے کھڑکی کی سلاخ کو تھامتے ہوئے کہا۔

میں نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور نرم آواز میں اسے تسلی دی۔ ''حوصلہ رکھو ناہید! میرا خیال ہے ہمیں کسی غلط فہمی کی بنا پر اغوا کیا گیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ صبح تک معاملہ صاف ہو جائے گا اور ہمیں چھوڑ دیا جائے گا۔''

''اگر ایسا نہ ہوا تو......؟ شہباز! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔'' ناہید نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''آخر دنیا ہمیں سکون سے کیوں نہیں جینے دیتی؟ ہم جہاں بھی جاتے ہیں کچھ نہ کچھ ایسا ہو جاتا ہے۔ جس کے سبب ہم مستقل ایک جگہ سے دوسری جگہ بھاگتے رہتے ہیں۔''

میں چند لمحے کچھ بول نہ سکا۔ ناہید کی بات درست تھی۔ ہم چوہدری اسلم کے خوف سے گاؤں چھوڑ کر بہاولپور پہنچے تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہاں میں اپنے دوست ارشد کی مدد سے زندگی کی نئے سرے سے ابتدا کر دوں گا۔ ناہید کی رفاقت میں زندگی گزارنے کا تصور ہی خوش کن اور سرور آمیز تھا لیکن حالات نے ہمیں وہاں سے بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔ پھر کراچی آ کر بھی ہم سکون سے نہیں رہ سکے تھے۔ ارشاد کا ملنا، اس کی چالبازیاں اور دھوکے بازی...... پروین کی عشوہ طرازیاں، پھر حمزہ خان سے ملاقات اور اس کا کمال کے قتل کا ڈراما رچانا۔ ایسا لگتا تھا جیسے دنیا میں ہر شخص اپنے مفاد کے لیے دوسرے کو استعمال کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اس کے لیے وہ انتہا تک جانے کے لیے بھی تیار رہتا ہے۔ حتیٰ کہ جان لینے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ اس داستان میں سب سے زیادہ افسوسناک کردار چوہدری اسلم کا تھا جو اپنے سیاسی مقاصد اور معمولی فائدے کے لیے اپنی بیٹی کو بھی قتل کرنے پر تیار ہو گیا تھا۔

اور اب، جب ہم نے حمزہ خان کے چنگل سے نکلنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا تو یہ ایک ناگہانی مصیبت سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔ رئیس قادر خان کون تھا؟ اس کے مقاصد کیا تھے؟ یہ سب صبح اس کے آنے پر ہی سامنے آ سکتا تھا۔ اگر یہ سب کچھ غلط فہمی کی بنا پر ہوا تھا تو ممکن ہے ہماری گلو خلاصی ہو جاتی۔ دوسری صورت میں ہمیں مشکل حالات کا سامنا کرنا تھا۔

میں خیالات سے اس وقت چونکا جب دروازے پر آہٹ ہوئی۔ کسی نے ایک ٹرے

اور پانی کی بوتل اندر رکھی اور جلدی سے دوبارہ دروازہ بند کر دیا۔ میں نے گہرا سانس لے کر ناہید کی طرف دیکھا پھر اس سے کہا۔ ''کیوں نہ کھانا کھا لیا جائے؟''

''مجھے بھوک نہیں ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''لیکن کچھ نہ کچھ کھانا تو پڑے گا نا!'' میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ''اگر ہم بھوکے پیاسے رہے تو ان مشکل حالات سے کس طرح لڑ سکیں گے؟ تم فکر مت کرو، میں ہوں نا...... ہم یہاں سے ضرور نکلیں گے اور اس پلان پر عمل کریں گے جو ہم نے کل اپنے فلیٹ پر طے کیا کیا تھا۔ دور دراز کے کسی گمنام گاؤں میں اپنا مکان...... زمینداری اور آزادی کی زندگی!''

لیکن میری بات سن کر بھی ناہید کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہ آئی۔ میں نے ٹرے اٹھا لیا اور کھڑکی کے قریب آ کر کھانا کھانے لگا۔ میں نوالے توڑ کر سلاخوں کے درمیان سے ناہید کو دیتا رہا۔ روٹیاں شاید کافی دیر پہلے کی پکی ہوئی تھیں جو ٹھنڈی ہو کر خاصی سخت ہو گئی تھیں۔ سبزی کا سالن بھی باسی معلوم ہوتا تھا۔ ہم دونوں چند نوالوں سے زیادہ نہ کھا سکے اور میں نے ٹرے ایک طرف رکھ کر پانی کی بوتل اٹھا لی۔

چند گھونٹ لینے کے بعد بوتل ناہید کو تھماتے ہوئے میں نے کہا۔ ''اس مسئلے پر سوچ سوچ کر ہلکان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو کچھ بھی ہے صبح سامنے آ جائے گا۔ اب ہمیں سو جانا چاہئے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمیں تازہ دم رہنے کی ضرورت ہے۔ مجھے یہ تو اندازہ ہو گیا ہے کہ رئیس قادر خان کے آنے تک ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ یہاں اس کے چند کارندے موجود ہیں، جن سے ہمیں کوئی معلومات حاصل نہیں ہو سکتی...... اور نہ ہی اب ......یعنی اس وقت رات کی تاریکی میں یہاں سے نکلنے کی کوشش کروں گا''۔

''کیوں شہباز!'' ناہید نے بے چینی سے کہا۔ ''اگر ہم یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں تو ضرور کوشش کرو...... مجھے تو خوف آ رہا ہے...... نہ جانے صبح آنے والا شخص ہمارے ساتھ کیا سلوک کرے......''

''ہمت سے کام لو ناہید!'' میں نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا اور دروازے کی طرف دیکھا جو خاصا پرانا تھا اور اس کی لکڑی بھی بوسیدہ ہو چکی تھی۔ میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''ہمیں نہیں معلوم کہ ہم اس وقت کہاں ہیں اور یہ کون سی جگہ ہے۔ بہر حال یہ یقینی ہے کہ ہم کراچی سے باہر کہیں ہیں۔ مجھے یہ بھی اندازہ ہے کہ یہاں زیادہ لوگ موجود نہیں ہیں۔ دو آدمیوں کو تو میں دیکھ چکا ہوں، ہو سکتا ہے ان کی تعداد تین ہو یا زیادہ سے زیادہ چار ہو۔ میں ان سے آسانی سے نمٹ سکتا ہوں۔ یہ دروازہ بھی میں ایک

جھٹکے سے توڑ سکتا ہوں لیکن رات کے وقت ہم باہر نکل کر بھٹک جائیں گے۔ دن کی روشنی میں ہم بہتر قدم اٹھا سکیں گے۔ بے فکر رہو، یہ لوگ ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے''۔

میں کافی دیر تک اسے تسلی دیتا رہا۔ آخر کار وہ میرے اصرار پر جا کر چارپائی پر لیٹ گئی۔ میں بھی فرش پر دراز ہو گیا۔ پچھلی رات بھی میں ٹھیک سے نہ سو سکا تھا۔ نیند اور تھکاوٹ کے سبب میری آنکھوں میں چبھن ہو رہی تھی۔ سر اور کنپٹی سے اٹھنے والی درد کی ٹیسوں میں خاصی کمی آ چکی تھی۔ وہاں ننگے اور کھردرے فرش پر لیٹے لیٹے میں نے دل میں پختہ فیصلہ کر لیا تھا کہ صبح ہر حال میں مجھے ناہید کے ساتھ یہاں سے نکلنا تھا۔ خواہ اس کے لیے مجھے کسی کی جان ہی کیوں نہ لینی پڑ جائے۔

وہ ایک مشہور محاورہ ہے نا، کہ نیند پھانسی کے تختے پر بھی آ جاتی ہے۔ مجھے یہ تو نہیں پتا کہ اس محاورے میں کتنی صداقت ہے۔ پھانسی کے تختے پر نیند آ سکتی ہے یا نہیں۔ بہر حال میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ بغیر بستر اور کسی چادر کے کھردرے فرش پر نیند ضرور آ جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ مجھ پر غنودگی طاری ہوتی گئی اور پھر غنودگی بے خبر نیند میں ڈھلنے لگی۔

☆======☆======☆

......وہ رونگٹے کھڑے کر دینے والا انتہائی بھیانک منظر تھا۔ ہمارے اردگرد جسیم بھیڑیے غراتے ہوئے دانت نکوس رہے تھے۔ میں ان کے درمیان ناہید کا ہاتھ تھامے ساکت کھڑا تھا۔ ہمارے قدموں میں جیسے چلنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ اچانک ایک بھیڑیا ناہید پر جھپٹا اور دوسرے ہی لمحے اس کے خوفناک دہانے میں ناہید کا بازو تھا۔ ناہید بری طرح چیخنے لگی۔ دفعتاً ایک بھیڑیا میری طرف لپکا۔ میں نے ناہید کو دھکا دے کر خود سے الگ کیا اور اپنی جان بچانے کے لیے ایک طرف دوڑ پڑا۔

میں دوڑتا رہا، مسلسل دوڑتا رہا۔ جب مجھے احساس ہوا کہ میں بھیڑیوں سے دور نکل آیا ہوں تو رک کر پیچھے دیکھا اور میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بھیڑیوں کا غول بدستور میرے پیچھے تھا۔ ایک بھیڑیے کے منہ میں ناہید کا بازو تھا جو کہنی سے الگ ہو چکا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ناہید بھیڑیوں کے پیچھے دیوانہ وار دوڑتی چلی آ رہی ہے جیسے وہ بھیڑیے کے منہ سے اپنا بازو واپس لینا چاہتی ہو۔ اب وہ بھیڑیے میرے قریب پہنچ گئے تھے۔ اچانک دو بھیڑیوں نے بیک وقت مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ بے اختیار میرے حلق سے چیخیں نکل گئیں۔

میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ میرے پورے جسم میں ہلکی سی لرزش طاری تھی۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ میں کہنیوں کے سہارے اٹھ بیٹھا اور آلتی پالتی مار کر

بیٹھ گیا۔

’’یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟‘‘ میں بڑبڑایا۔ ’’کل بھی میں نے ایسا ہی خوفناک خواب دیکھا کہ نیند سے بیدار ہو گیا تھا......‘‘ اچانک مجھے ناہید کا خیال آیا۔ کل وہ بھی ایسے ہی خواب کا ’’شکار‘‘ ہوئی تھی۔ میں اٹھ کر جلدی سے کھڑکی کے قریب گیا اور دوسری طرف دیکھا۔ ناہید چارپائی پر پریشان سی بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ بھی کھڑکی کے قریب آ گئی۔

’’تم نے بھی کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے؟‘‘ میں نے اس سے پوچھا۔ اس نے اثبات میں گردن ہلا کر مجھ سے سوال کیا۔

’’اور تم نے بھی؟‘‘

’’ہاں...... عجیب بات ہے۔‘‘ میں نے دھیرے سے کہا۔ ’’آخر یہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے......‘‘ اچانک ایک دہشت ناک خیال آنے پر میں بولتے بولتے خاموش ہو گیا۔

’’کک...... کیا بات ہے شہباز!‘‘ ناہید شاید میرے چہرے پر خوف و دہشت کے آثار دیکھ کر گھبرا گئی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ’’تم بولتے بولتے چپ کیوں ہو گئے؟‘‘

’’بہت برا ہوا ناہید!‘‘ میں نے اپنی دھیمی اور سرسراتی ہوئی آواز سنی۔

’’آخر ہوا کیا ہے۔ بتاؤ نا!‘‘

’’اب ہم دونوں شاید رات کی نیند کے لطف سے محروم رہیں‘‘۔

’’کک...... کیا...... کیوں؟‘‘ ناہید نے کہا۔

’’وظیفے کی ابتدا میں لکھا تھا نا...... کہ وظیفے کو ادھورا چھوڑنے سے ناقابل تلافی نقصان بھی ہو سکتا ہے...... مم...... مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ہمیں ایسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔ تم خود سوچو، ہم وظیفہ زوال کے وقت کے بعد یعنی تقریباً رات کے سوا بارہ بجے شروع کرتے تھے اور فجر کی اذان تک جاری رکھتے تھے۔ اب شاید ہمیں زندگی بھر اس وقت کے دوران میں نیند نہیں آئے گی اور اگر نیند آئی بھی تو وظیفے کے دوران نظر آنے والے دہشت ناک مناظر ہمارے خواب میں آتے رہیں گے۔ اب سکون کی نیند ہمارے مقدر میں نہیں ہے۔ یہ...... یہ تو واقعی ہمارا ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے۔‘‘ میں خوف اور تاسف سے بولتا رہا۔ ناہید پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے گھورتی رہی۔

اس کے بعد سونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہم کھڑکی کے سامنے کھڑے باتیں کرتے رہے۔ پھر خاموش گم صم ایک دوسرے کو گھورتے رہتے۔ آنکھوں میں شدید نیند ہونے کے باوجود ہم سو نہیں سکتے تھے۔

آخر کار رات کی تاریکی چھٹنے لگی۔ ہم دونوں کھڑے کھڑے تھک گئے تو وہیں فرش پر بیٹھ گئے۔ نہ جانے کب دیوار سے ٹیک لگائے مجھے اونگھ آ گئی۔ دروازے پر ہونے والی آہٹیں سن کر میں نے آنکھیں کھول دیں اور سر کو جھٹک کر نیند کے غلبے سے چھٹکارا پانے کی کوشش کی۔ اس کوشش سے سر میں سوئے ہوئے درد نے بھی جاگ کر ٹیسوں کے ذریعے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ میں نے سختی سے ہونٹ بھینچ لیے۔

تھوڑی دیر بعد پانی کی بوتل اٹھا کر میں نے آنکھوں پر چھینٹے مارے۔ عین اسی وقت دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ میں دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ دروازہ کھل گیا۔ میں بوتل ایک طرف رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے سامنے ایک روایتی زمیندار موجود تھا۔ بوسکی کے شلوار سوٹ میں ملبوس اس پستہ قد اور قدرے فربہ شخص کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ تھی۔ اس نے اپنے قد کو اونچا کرنے کے خاصے موٹے تلے والی پشاوری چپل پہنی ہوئی تھی لیکن وہ اپنے مقصد میں ناکام رہا تھا۔ سانولی رنگت پر سیاہ رنگی ہوئی گھنی مونچھیں اس کے چہرے پر رعب پیدا کرنے کی بجائے سامنے والے کی کراہت میں اضافہ کرتی تھیں۔ غالباً اس شخص کے لیے میرے دل میں غیض و غضب، اشتعال اور نفرت کی موجودگی کے سبب یہ تاثر پیدا ہوا تھا۔ وہ ایک قدم بڑھا کر کھلے دروازے سے اندر آ گیا۔ اس کے پیچھے وہی دو آدمی کھڑے تھے جنہیں میں رات دیکھ چکا تھا۔ اب بھی ایک کے ہاتھ میں کلہاڑی اور دوسرے کے ہاتھ میں پستول تھا۔

’’تو تم ہو رئیس قادر خان!‘‘ میں بھاری آواز میں اس سے مخاطب ہوا۔ میرے اس انداز پر اس کے مسکراہٹ سے کھنچے ہوئے ہونٹ بھینچ گئے اور تیوری پر بل پڑ گئے۔

’’لگتا ہے تمہاری خاطر تواضع ٹھیک سے نہیں ہوئی۔‘‘ وہ غرایا۔

’’میں تم سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم نے ہمیں اغوا کرا کے یہاں قید کیوں کیا ہے؟‘‘ میں نے اس کی بات کو ان سنی کرتے ہوئے اسی لہجے میں کہا۔ یقیناً وہ اس لہجے کا عادی نہیں تھا۔

’’میں تو تمہیں اپنے کتوں کے آگے ڈالوں گا۔‘‘ وہ انتہائی سرد لہجے میں بولا۔ ’’اس لہجے میں بات کرنے والے کو ہم اپنے پالتو کتوں کی خوراک بنا دیتے ہیں...... ہم تو اپنے ہم رتبہ شخص کی زبانی بھی ایسی گفتگو برداشت نہیں کر سکتے۔ آٹھ سال پہلے چوہدری اسلم نے بھی ہم سے اسی لہجے میں بات کی تھی۔ ہم اسے آج تک نہیں بھولے۔ دیکھ لو اس کی بیٹی اب ہمارے قبضے میں ہے۔ اس کا ہم وہ حشر کریں گے کہ چوہدری اسلم کسی کو منہ دکھانے کے

قابل نہیں رہے گا...... اور تم، دو ٹکے آدمی...... !'' وہ دانت پیس کر غرایا۔ ''میں تمہیں عبرت کا نشان بنادوں گا۔'' رئیس قادر خان غصے میں آپے سے باہر ہورہا تھا۔

میں حیرت کے ابتدائی جھٹکے سے خود کو سنبھال چکا تھا اور میری یہ خوش فہمی دور ہو چکی تھی کہ رئیس قادر خان نے ہمیں کسی غلط فہمی کی بناء پر اٹھایا ہے۔ اب میں اندازہ کر سکتا تھا کہ میں اور ناہید کتنی بڑی مصیبت میں گرفتار ہو چکے ہیں۔

چند لمحے ہم ایک دوسرے کو خاموشی سے گھورتے رہے پھر میں نے کہا۔ ''تم وڈیروں اور چوہدریوں کے انتقام کا نشانہ بے قصور اور نہتے لوگ ہی کیوں بنتے ہیں؟ تمہاری دشمنی اگر چوہدری اسلم سے ہے تو اس کے خلاف کوئی قدم کیوں نہیں اٹھاتے......؟ لیکن مجھے معلوم ہے تم ایسا نہیں کر سکو گے کیونکہ وہاں تمہیں منہ کی کھانی پڑے گی۔''

میری بات پر اس نے استہزائیہ انداز میں ہلکا سا قہقہہ لگایا پھر بولا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے...... میں نے یہ جو کچھ کیا ہے، وہ چوہدری اسلم کے خلاف نہیں ہے؟''

''نہیں!'' میں نے کہا۔ ''اگر تم اس کی بیٹی کے حوالے سے بات کر رہے ہو تو سن لو ناہید اب میری بیوی ہے۔''

''ہاہ...... بیوی!'' اس نے طنزیہ انداز میں کہا اور دو قدم میری طرف بڑھتے ہوئے بالکل میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اس نے دونوں ہاتھ کمر پر رکھ لئے اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ ''یہ مجھے معلوم ہے کہ تم اسے بھگا کر لے آئے ہو۔ چوہدری اسلم نے اپنی بیٹی کے لیے یہ مشہور کر دیا تھا کہ اس کی بیٹی کو اغوا کر لیا گیا اور بعد میں اس کی لاش وصول کر کے اسے دفن بھی کروا چکا ہے اس نے اس طرح اپنے علاقے میں تو اپنی عزت بچالی لیکن اب میں اس کی عزت کی وہ دھجیاں بکھیروں گا کہ مرنے کے بعد اسے قبر میں بھی چین نہیں ملے گا، تم اسے اپنی بیوی کہہ رہے ہو...... یہ تو اب کئی لوگوں کی بیوی بنے گی۔''

میرے وجود میں اشتعال کی ایک شدید لہر اٹھی، میں نے مشکل سے اس لہر پر قابو پایا۔ پہلے تو میرے دل میں آیا کہ اس خبیث کو اٹھا کو پوری قوت سے دیوار پر دے ماروں، بڑی جدوجہد کے بعد میں نے اپنی اس خواہش پر قابو پایا۔ میرے ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔ ''آخر چوہدری سے تمہاری کیا دشمنی ہے؟''

''دشمنی! میری کوئی دشمنی نہیں ہے اس سے۔'' رئیس قادر خان نے حقارت سے کہا۔

''ہم لوگ اپنی دشمنی میں عورت کو استعمال نہیں کرتے...... بس تم یوں سمجھو کہ ایک حساب ہے جو ہم بے باق کرنا چاہتے ہیں۔ آج سے آٹھ سال پہلے چوہدری نے مجھے ایک عورت کی

خاطر ذلیل کیا تھا اب میں بھی اسے ایک عورت کی وجہ سے ذلیل کروں گا کیوں کہ اس کی بتدا اسی نے کی تھی۔''

''کیا چوہدری نے تمہاری کوئی عورت اٹھوالی تھی......'' میری بات ابھی پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس نے پوری قوت سے مجھے تھپڑ مار دیا میں اس کے لیے تیار نہیں تھا اور ڑکھڑا کر دیوار سے جا ٹکرایا۔ ناہید کی گھٹی گھٹی سی چیخ سنائی دی، وہ یقیناً درمیانی کھڑکی سے ندر کا منظر دیکھ رہی تھی اور ساری گفتگو بھی سن رہی تھی۔ عین اسی لمحے دروازے پر کھڑے ہوئے رئیس کے دونوں کارندے اندر داخل ہو گئے۔ میں نے دیکھا کہ رئیس نے انہیں کوئی شارہ کیا، وہ کمرے میں ہی رک گئے اور وہ خود مجھ پر پل پڑا۔

رئیس قادر خان کے ہاتھ میرے جسم کے مختلف حصوں پر پڑتے رہے، وہ مجھے ٹھوکریں بھی مارتا رہا پھر وہ ہانپتا ہوا کمرے کے درمیان میں جا کھڑا ہوا۔ میری باچھوں سے ٗون رس رہا تھا اور پورے جسم سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اس دوران میں ناہید کی چیخیں بھی گونجتی رہی تھیں جیسے وہ ضربیں میرے جسم پر نہیں اس کے جسم پر پڑ رہی ہوں۔

''تمہاری یہ جرأت......'' وہ ہانپتے ہوئے غرایا۔ میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور سے گھورتا رہا۔

''ہماری عورتوں کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر دیکھے تو ہم اس کے پورے خاندان کی ٓنکھیں نکال دیتے ہیں۔'' وہ بولتا رہا۔ ''اور چوہدری اسلم!'' اس نے فرش پر تھوکا۔ ''اس ی تو اپنی بیٹی اس کے منہ پر کالک مل کر تمہارے ساتھ بھاگ نکلی ہے، وہ کیا کسی کی عورتوں کو ٹھوائے گا، وہ تو اپنی اوقات اور فطرت کے مطابق ہی حرکت کر سکتا ہے جو اس نے میرے ساتھ کی۔ تم بھی سن لو...... کہ میرا چوہدری اسلم کی طرف کیا جساب باقی ہے جسے میں چکانا ٗاہتا ہوں۔ میں اکثر لاہور جاتا رہتا تھا اب بھی جاتا ہوں وہاں میں تفریح کی غرض سے لوٹھے پر بھی جاتا تھا، مجھے ایک طوائف پسند آ گئی تھی۔ میں نے بڑی رقم خرچ کر کے اسے لوٹھے سے اٹھوایا اور شہر میں مکان خرید کر اسے وہاں رکھا۔ میں کبھی کبھار اس سے ملنے جاتا ا۔ میرا یہ کام چوہدری اسلم کو پسند نہیں آیا تھا اس نے میری غیر موجودگی میں چاندنی کو ٹھوالیا تھا۔ چاندنی میری اس پسندیدہ طوائف کا نام تھا، میں نے اس عورت پر بڑی رقم ـرچ کی تھی۔ مجھے اس کا غم نہیں ہے...... اور نہ ہی اس دو ٹکے کی عورت کے چھننے کا غم ہے یسی بہت مل جاتی ہیں لیکن مجھے غصہ اس بات کا ہے کہ چوہدری نے میری آن کو للکارا تھا، ٓج مجھے موقع ملا ہے اور میں اس سے بدلہ ضرور لوں گا۔ اس نے میری داشتہ کو مجھ سے چھین

کر اپنے بندوں میں تقسیم کیا تھا اب میں اس کی بیٹی کو تقسیم کروں گا۔ میں اسے ایسے لوگوں کے حوالے کروں گا جو اسے ناچنے کی ٹریننگ دیں گے پھر ایک دن میں اپنی حویلی کی بیٹھک میں محفل کا انتظام کروں گا جس میں دور دراز اور آس پاس کے وڈیرے اور چوہدری آئیں گے۔ میں ان سب کے سامنے اسے نچواؤں گا پھر بعد میں جب انہیں بتاؤں گا کہ یہ ناچنے والی چوہدری اسلم کی بیٹی ہے تو وہ کتنے حیرت زدہ رہ جائیں گے۔''

وہ اپنی بات مکمل کر کے مکروہ انداز میں ہنسا اس کا منصوبہ سن کر میرے دل میں نفرت کی تیز لہر اٹھی۔ میں نے نفرت کی اس لہر کو دبا کر کہا۔ ''دیکھو رئیس! میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے اور نہ ہی تمہارا کوئی حساب میری طرف نکلتا ہے، تم جس طرح چاہو، چوہدری اسلم سے اپنا حساب بے باق کرو، مجھے اور ناہید کو جانے دو۔ ناہید اب میری بیوی ہے۔''

''بیٹی تو چوہدری اسلم کی ہے نا؟'' رئیس قادر خان سرد لہجے میں بولا۔ ''وہ تمہاری بیوی ہے یا نہیں، تم نے واقعی اس سے نکاح کر لیا ہے یا نہیں...... مجھے اس سے کوئی غرض نہیں، میں وہی کروں گا جو میں کرنا چاہتا ہوں اس سے مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔''

میں آہستہ آہستہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ ''میں تمہیں روکوں گا۔''

''تم......؟'' وہ دھیرے سے ہنسا، انداز ایسا تھا جیسے میرا مضحکہ اڑا رہا ہو۔ ''تم میں اتنی ہمت ہے؟''

''ہاں! میں ناہید کی خاطر تم جیسے دس کمینوں کی جان لے سکتا ہوں اور اپنی جان دے بھی سکتا ہوں۔''

میری بات سن کر اس کے دونوں کارندوں کے جسم تن گئے تھے۔ رئیس قادر خان کا چہرہ بھی بگڑ گیا تھا، وہ سرد لہجے میں بولا۔ ''ہم تمہاری دوسری خواہش ضرور پوری کریں گے، میرا ارادہ فی الحال تمہیں مارنے کا نہیں تھا۔ خیر...... تمہارا زندہ رہنا یا نہ رہنا ہمارے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ بجل...... علی دوست!'' وہ مجھے گھورتا ہوا، بولتے بولتے اچانک اپنے کارندوں سے مخاطب ہوا۔

''جی سائیں! حکم؟'' دونوں بیک وقت بولے۔

''سلطان کہاں ہے؟''

''سائیں! وہ فارم پر گیا ہے، آنے والا ہوگا۔'' کلہاڑی والے نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔'' رئیس قادر خان بولا اور میری طرف اشارہ کیا۔ ''اس سے جان

ڑاؤ بابا! تم لوگ خواہ مخواہ اسے اٹھا لائے، مجھے تو صرف لڑکی چاہیے تھی۔ خیر اب اسے پس پارسل کر دو اس کی لاش بوری میں بند کر کے شہر کی کسی سنسان سڑک یا پارک میں ینک دینا......''

وہ میرے سامنے کھڑا میری موت کے احکامات اس طرح دے رہا تھا جیسے اس کی ت ختم ہونے کے بعد میں رضا کارانہ طور پر آگے بڑھ کر اپنا سر جھکاؤں گا تاکہ وہ کلہاڑی کا ر کر کے میرا کام تمام کر دیں۔ شاید انہیں میری طرف سے کسی قسم کی مزاحمت کی توقع نہیں ی جوان کی سب سے بڑی بھول تھی یا پھر رئیس کو اپنے کارندوں پر اس قدر بھروسہ تھا کہ ا نے ایسی بات سوچنے کی زحمت ہی نہیں کی تھی۔

میرے جسم میں اینٹھن سی ہونے لگی تھی اور ہاتھوں کی انگلیاں تن گئی تھیں۔ میں نے ملہ کر لیا کہ اپنی اور ناہید کی جان بچانے کے لیے آخری سانسوں تک جدوجہد کروں گا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ جہاں ہم موجود تھے، وہ جگہ کہاں واقع ہے اور کراچی سے کتنی دور ہے البتہ ا یہ جان چکا تھا کہ وہاں ان تین افراد کے علاوہ سلطان نامی شخص بھی موجود ہے جو کسی کام ے کسی فارم پر گیا ہوا تھا، وہ کسی وقت بھی آ سکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ باہر اور لوگ بھی موجود ں۔ بہرحال کچھ بھی تھا، میں ایکشن میں آنے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔

رئیس قادر خان کہہ رہا تھا۔ ''علی دوست! بعد میں تم اور سلطان لڑکی کو لے کر گاؤں ہلے جانا، اسے نہر کے قریب والے ڈیرے پر رکھنا، میں شام تک وہاں پہنچ جاؤں گا۔ آج پہر کے بعد مجھے وکیل سے ملنا ہے اس لیے میرا شہر جانا ضروری ہے، سمجھ گئے نا بابا؟''

''ہاں سائیں! آپ فکر نہ کریں۔'' بجل نے کہا جو کلہاڑی کو تولنے کے سے انداز میں ھ میں لئے مجھے گھور رہا تھا۔ ''میں اس کی لاش کو رات میں کسی وقت پھینک آؤں گا''۔

رئیس قادر خان گویا مطمئن ہو کر کمرے سے جانے کے لیے پلٹا عین اسی لمحے میں ڑی سے حرکت میں آیا۔ میں پوری قوت سے اچھلا، میری دائیں ٹانگ کلہاڑی والے کے ہلو میں پڑی اور میں رئیس کو رگیدتا ہوا لے گیا پھر میں نے اس کا سر دیوار سے دے مارا۔ ایک اس کے منہ سے مغلظات کا سیلاب رواں ہو گیا۔ میں اسی تیزی سے علی دوست کی رف جھپٹا جو بلند آواز میں مجھے گالیاں دیتا ہوا اپنا پستول والا ہاتھ سیدھا کر چکا تھا۔ میں نے قدرے جھک کر بیل کی طرح اسے ٹکر ماری، فائر کے دھماکے کے ساتھ علی دوست کے نہ سے چیخ نکل گئی۔

گولی کسی کو نقصان پہنچائے بغیر سامنے کی دیوار کا پلستر ادھیڑ گئی تھی۔ میری زوردار ٹکر

سے علی دوست کی پشت دیوار سے ٹکرائی تھی۔ یہ دوطرفی ضرب خاصی کارآمد ثابت ہوئی تھی اور وہ ایک لمحے کے لیے چکرا گیا۔ میں نے اس کے پستول پر ہاتھ مارا لیکن وہ اتنا بے دم بھی نہیں ہوا تھا اس نے سر کو جھکا اور پستول والا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی اسی جدوجہد میں ہم دونوں گتھم گتھا ہوگئے اس نے ایک جھٹکے سے اپنا پستول والا ہاتھ چھڑا لیا۔ یک لخت مجھے اپنی موت کا یقین سا ہو گیا کیونکہ ہاتھ چھڑاتے ہی اس نے پستول کی نال میرے پہلو سے لگادی تھی، وہ کسی بھی لمحے فائر کرسکتا تھا۔ آخری کوشش کے طور پر میں نے اچانک جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور ٹانگوں سے اپنے جسم کا بوجھ اٹھا لیا۔ ایک لمحے کے لیے میں اس کے بازو میں جھول گیا۔ میری یہ حرکت اس کے لیے بالکل غیر متوقع تھی۔ میں پشت کے بل زمین پر گرنے لگا اور وہ لڑکھڑا کر میرے اوپر آ رہا تھا۔

کھڑے ہونے اور زمین پر گرنے کے عمل کے مختصر دورانیے میں...... یعنی ان لمحوں نے زندگی اور موت کے اس کھیل کا کایا پلٹ دی اس ایک لمحے نے مجھے زندہ رہنے کی جدوجہد کو جاری رکھنے کا حوصلہ دیا۔

میں گر رہا تھا، وہ میرے اوپر آ رہا تھا، فرش سے ٹکرانے سے پہلے بجلی کی کلہاڑی علی دوست کے دائیں شانے میں پیوست ہوگئی اس کی اذیت بھری دھاڑ نے بجلی کو بوکھلا دیا اور وہ کلہاڑی کو واپس کھینچے بغیر گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے یقیناً مجھ پر پیچھے سے کلہاڑی کا وار کیا تھا لیکن میری فرش پر گرنے والی حرکت کے سبب علی دوست اچانک میرے اوپر آگیا تھا اور کلہاڑی کا پورا پھل اس کے دائیں شانے میں پیوست ہوگیا تھا۔

پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا، خون کا فوارہ میرے چہرے اور گردن کو بھگو گیا اور عین اسی لمحے میرا سر خاصے زور سے فرش سے ٹکرایا۔ میری آنکھوں کے سامنے یکا یک نیلی پیلی چنگاریاں سی ناچ گئیں، سر کی پشت پر اتنی زوردار چوٹ کے بعد مجھے کم سے کم بے ہوش ہو جانا چاہیے تھا۔ ایک لمحے کے لیے میری آنکھوں کے سامنے چنگاریاں اڑنے کے بعد تاریکی چھا گئی تھی لیکن میں نے اپنی پوری قوت ارادی کو مجتمع کر کے علی دوست کو دھکیل کر اپنے اوپر سے ہٹایا اور اندھوں کی طرح پستول کے لیے فرش پر اِدھر اُدھر ہاتھ مارنے لگا۔

پستول کے آہنی سرد لمس نے گویا میرے اندر زندگی کی حرارت دوڑا دی۔ میں نے ایک ہاتھ کی ہتھیلی سے دونوں آنکھوں کو مسلا، کمرے کا منظر میری نظروں کے سامنے واضح ہو گیا دوسرے ہی لمحے میں نے بے دریغ فائر کر دیا۔ بجلی جو پستول چھیننے کے لیے مجھ پر جھپٹ رہا تھا، گولی اس کے سینے میں جا لگی اور وہ دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام کر وہیں ڈھیر ہو گیا۔

میرا خیال ہے یہ سب کچھ ایک منٹ سے بھی کم عرصے میں مکمل ہو گیا تھا۔ اس دوران رئیس، بجلی اور علی دوست کی گالیاں، چیخنا چلانا، گولیوں کے دھماکوں اور میری کراہوں ساتھ ناہید کی گھٹی گھٹی چیخیں پس منظر میں میوزک کی طرح سنائی دیتی رہی تھیں۔ رئیس رخان دروازے کے قریب، دیوار کے ساتھ کھڑا پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہا ۔ وہ یقیناً شاک کی کیفیت میں تھا، اسے امید نہیں تھی کہ میں تنہا ہونے کے باوجود اس کے سلح کارندوں کو زیر کرلوں گا۔

''اب تم مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔'' میں اٹھ کر اس کے سامنے جا کھڑا ہوا اور ژل کا رخ اس کی طرف کر دیا۔

''نن...... نہیں...... مجھے مت مارو۔'' وہ گویا اچانک ہوش میں آ گیا تھا۔

''کیوں! تمہیں کیوں نہ ماروں؟'' میں نے غصے سے کہا اور الٹے ہاتھ کا تھپڑ اس کے ل پر رسید کر دیا۔ وہ ایک لمحے کے لیے لڑکھڑایا اور مجھے محسوس ہوا کہ وہ نتیجے کی پروا کیے رمجھ پر جھپٹ پڑے گا لیکن اس نے خود کو سنبھال لیا اگر وہ ایسا کرتا تو میں بے دریغ اسے ولی مار دیتا، خفت کے مارے کا اس کا چہرہ سیاہ پڑ گیا تھا۔

''تم یہاں سے چلے جاؤ۔'' وہ دھیمی اور شکست خوردہ آواز میں بولا۔ ''اپنی بیوی کو ں ساتھ لے جاؤ...... اب بازی تمہارے ہاتھ میں ہے۔'' اس نے اپنے دونوں کارندوں طرف دیکھا۔ بجلی کمرے میں بیچوں بیچ ساکت پڑا تھا اور علی دوست کا خون میں لت ت جسم دیوار کے ساتھ پڑا تھا جو وقفے وقفے سے جھٹکے لے رہا تھا۔

میں لڑائی جھگڑے کا ماہر کوئی جنگجو قسم کا آدمی نہیں ہوں اس وقت مجھے بھی حیرت کا نساس ہو رہا تھا کہ یہ سب کچھ میں کس طرح کر گزرا ہوں؟ شاید موت کو سامنے دیکھ کر رے اندر خود حفاظتی کی وحشیانہ جبلت جاگ اٹھی تھی۔ جس نے مجھے بے انتہا قوت اور صلہ عطا کیا تھا۔ خیر جو کچھ بھی تھا، میں نے بہتر یہی سمجھا کہ فوری طور پر ناہید کو لے کر وہاں سے نکل جانا چاہیے۔

''ہاں......'' میں نے رئیس قادر خان کو جواب دیا۔ ''اب یقیناً بازی میرے ہاتھ ا ہے اگر میں چاہوں تو تمہیں جہنم واصل کر سکتا ہوں لیکن میں تم جیسے شخص کے گندے خون ے اپنے ہاتھ نہیں رنگنا چاہتا، میں جا رہا ہوں۔ تم میری جان لینا چاہتے تھے، تم میری عزت ور پے تھے لیکن میں اختیار کے باوجود تمہاری جان بخشی کر کے جا رہا ہوں اگر آئندہ کبھی تم ے میری راہ میں حائل ہونے کی کوشش کی تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

وہ ہونٹ بھینچے مجھے گھورتا رہا، میں اس پر نظر رکھ کر دروازے کی طرف بڑھا اور پھر اچانک کسی خیال کے تحت پلٹا اور علی دوست کے قریب جا کر اس کے شانے میں پیوست کلہاڑی کھینچ لی اس کے جسم نے ایک جھٹکا لیا اور ساکت ہو گیا۔ گہرے گھاؤ سے خون تیزی سے بہنے لگا تھا، مجھے اندیشہ ہوا کہ وہ مر چکا ہے اور اگر نہیں مرا تو اتنا خون ضائع ہونے کے سبب عنقریب مر جائے گا۔ اس دوران میں رئیس قادر خان کی طرف سے غافل نہیں رہا تھا۔ ایک ہاتھ میں کلہاڑی جس کے پھل سے خون ٹپک رہا تھا اور دوسرے ہاتھ میں پستول لیے میں جلدی سے کمرے سے نکل آیا اور باہر سے دروازے کو کنڈی لگا دی۔ میں نے محتاط انداز میں اردگرد کا جائزہ لیا۔

وہ وسیع اراضی پر بنی ہوئی تقریباً پانچ فٹ اونچی چار دیواری تھی۔ آہنی گیٹ کے دائیں طرف قدرے معقول طرز کا مکان بنا ہوا تھا اور دوسری جانب یہ دو کمرے بنے ہوئے تھے جن میں سے ایک کمرے میں سے میں نکلا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس قطعہ زمین کو جس مقصد کے لیے خریدا گیا تھا، فی الحال وہ پراجیکٹ تکمیل کے ابتدائی مراحل سے گزر رہا تھا۔ ایک طرف تعمیراتی سامان کا ڈھیر پڑا ہوا تھا، میرے اندازے کے مطابق وہاں کوئی طویل وعریض پولٹری فارم یا غالباً بھینسوں کا باڑا بنایا جانے والا تھا۔

گیٹ کے قریب سفید رنگ کی پجیرو کھڑی تھی۔ یقیناً اسی گاڑی پر رئیس قادر خان وہاں پہنچا تھا اب یہی گاڑی میرے کام آنے والی تھی۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر دائیں طرف کا دروازہ کھولا۔ ناہید فوراً باہر آ کر مجھ سے لپٹ گئی اور سسکنے لگی۔

میں نے دیکھا کہ درمیانی کھڑکی سے رئیس قادر خان خون آشام نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ میں نے کلہاڑی ایک طرف پھینکی اور ناہید کو اپنے ساتھ لے کر گاڑی کی طرف بڑھا اچانک ناہید نے ایک طرف رکھے تارکول کے ڈرم کی طرف اشارہ کیا جس میں پانی بھرا ہوا تھا اور بولی۔ ”منہ ہاتھ دھو لو شہباز! تمہارے چہرے اور گردن پر خون لگا ہوا ہے۔“

ڈرم میں سے چلو کے ذریعے پانی لے کر میں نے اپنے چہرے اور گردن کو رگڑ رگڑ کر صاف کیا۔ ناہید نے بھی میری مدد کی لیکن میری قمیض کے کالر اور کندھوں پر لگے ہوئے خون کے دھبے پانی سے صاف نہ ہو سکے، میں پریشان ہو گیا اس حالت میں مجھے کہیں بھی پولیس روک سکتی تھی اور میں کسی نئی مشکل میں گرفتار ہو سکتا تھا اچانک مجھے اس چادر کا خیال آیا جو اس چارپائی پر بچھی ہوئی تھی جس پر ناہید نے رات گزاری تھی۔ میں ناہید کو وہیں ٹھہرنے کا کہہ کر تقریباً دوڑتا ہوا کمرے کی طرف بڑھا۔ رئیس قادر خان اب تک کھڑکی کے سامنے

ا تھا۔ میں نے لپک کر وہ میلی اور پرانی چادر چارپائی سے اٹھائی۔

اب میں وہاں ایک لمحہ بھی ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا وہاں کوئی بھی آ سکتا تھا۔ سلطان فص کے بارے میں تو میں سن ہی چکا تھا کہ وہ قریبی کسی فارم پر گیا ہوا تھا اور عنقریب ی واپسی متوقع تھی باہر نکل کر میں نے چادر کندھوں پر اس طرح پھیلا لی کہ کسی کو میرا ن آلود لباس نظر نہ آ سکے۔

میں بلا تاخیر گاڑی کی طرف بڑھا، یہ ہماری خوش نصیبی تھی کہ گاڑی کے دروازے نہیں تھے۔ میں جلدی سے ڈرائیونگ سیٹ بیٹھ گیا۔ ناہید میرے برابر پسنجر سیٹ پر بیٹھ تھی۔ گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے میں نے غیر ارادی طور پر ڈیش بورڈ کے خانے کو ۔ کیا اب قسمت گویا ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گئی تھی، خانے میں تقریباً دو سو روپے کے اور دس روپے والے نوٹ اور کسی پیٹرول پمپ کی دو تین پرچیاں رکھی تھیں اس میں ی کے کاغذات نہیں تھے۔

گو کہ وہ معمولی رقم تھی لیکن میرے کام آ سکتی تھی۔ بے ہوشی کے دوران میری جیب سب کچھ نکال لیا گیا تھا، میری جیبوں میں اچھی خاصی رقم موجود تھی۔ کاغذات اور نس کی عدم موجودگی کے سبب بھی پریشانی ہو سکتی تھی۔ میرا لائسنس تو میری گاڑی کے ن بورڈ کے خانے میں موجود تھا جو کلفٹن کے پارکنگ ایریا میں لاوارث کھڑی تھی۔

وہ رقم جیب میں ڈال کر میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور اسے گیٹ کے سامنے کر لیا۔ ن کو چلتا ہوا چھوڑ کر میں نیچے اترا اور آہنی گیٹ کا کنڈا ہٹایا۔ ایک پٹ ذرا سا کھول کر باہر انکا، سامنے کچی سڑک دائیں جانب مڑ گئی تھی اور میری نظروں کے سامنے دور دور تک بنجر ین تھی البتہ خاصے فاصلے پر ڈھلوانی چھتوں والی نیچی عمارتیں دکھائی دے رہی تھیں جن میں یوں اور چوزوں کی پرورش کی جاتی تھی۔ ایسے پولٹری فارم کراچی کے مضافات میں جا نظر آتے ہیں۔

میں نے گیٹ پوری طرح کھول دیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا واپس گاڑی میں بیٹھا۔ یٹ سے باہر آ کر میں نے اسے بند کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ میں کچی اور اونچی ی سڑک پر گاڑی دوڑاتا وہاں سے دور ہوتا چلا گیا۔ تقریباً دس منٹ کی ڈرائیونگ کے بعد ں ایک مین روڈ پر آ گیا جس پر ٹریفک رواں دواں تھی۔ پختہ سڑک پر آتے ہی میں دازے کے مطابق تیز رفتاری سے کراچی کی طرف گاڑی ڈرائیو کرتا رہا۔ چند ہی فرلانگ ے بعد میرے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ سڑک کے کنارے لگے ہوئے سنگِ میل سے

معلوم ہوا کہ ہم کراچی سے ٹھٹھہ جانے والی سڑک پر تھے اور ہمارا رُخ کراچی کی طرف تھا۔ یہ جان کر بھی مجھے خوشی ہوئی کہ ہم تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد کراچی کی حدود میں داخل ہو جائیں گے۔ میں دل ہی دل میں یہی دعا مانگتا رہا کہ اس مختصر سے سفر میں کسی پولیس چوکی پر ہمیں روکا نہ جائے اس وقت میرا حلیہ کچھ ایسا تھا جو پولیس کی نظروں میں مجھے مشتبہ بنا سکتا تھا۔

''کیا سوچ رہی ہو ناہید؟'' کافی دیر کی خاموشی کے بعد میں نے اسے مخاطب کیا۔ وہ گم صم سی بیٹھی خیالوں میں گم تھی۔ ''اب خوف کو اپنے ذہن سے نکال دو، ہم خطرے سے نکل آئے ہیں اور رفتہ رفتہ دور ہوتے جا رہے ہیں''۔ اپنی بات مکمل کر کے میں نے اس کے ہاتھ کی پشت پر ہلکی سی تھپکی دی جو ڈیش بورڈ پر رکھا تھا۔

''یقین نہیں آ رہا شہباز!'' اس نے گہرا سانس لے کر کہا۔ ''کہ ہم اس کمینہ خصلت شخص کی قید سے نکل آئے ہیں۔ وہ...... وہ کیسے خوفناک ارادوں کا اظہار کر رہا تھا۔ اُف خدایا......!'' اس نے ہونٹ بھینچ کر جھرجھری لی اور پھر بولی۔ ''شہباز! آخر یہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ ہم بہاولپور اس لئے گئے تھے کہ وہاں ہم نئی اور پُرسکون زندگی کا آغاز کریں گے لیکن وہاں پیش آنے والے حالات سے ہمیں افراتفری میں وہاں سے بھاگنا پڑا، کراچی میں ارشاد اور پروین کا ملنا...... ان کی چکر بازیاں اور دھوکے، بازیاں بظاہر وہ دوست بنے ہوئے تھے، وہ تمہیں حمزہ خان کے پاس لے گئے۔ رہی سہی کسر اس نے پوری کر دی اس نے تمہیں جرائم کی دلدل میں کھینچ لیا۔ امیدوں کے برخلاف ہمارا وظیفہ ادھورا رہ گیا جسے مکمل کر کے ہم اپنی حفاظت کے لیے کچھ کر سکتے تھے...... اب وہ بھی امید نہیں رہی اب یہ رئیس قادر خان بیچ میں ٹپک پڑا۔ لگتا ہے پُرسکون زندگی گزارنا ہمارے مقدر میں نہیں ہے۔''

میں نے ایک بس کو اوورٹیک کرتے ہوئے دھیرے سے کہا۔ ''تم مایوس مت ہو ناہید! میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔ مجھے امید ہے کہ یہ مشکل وقت جلدی ہی گزر جائے گا، ہم یہاں سے کسی ایسی جگہ چلے جائیں گے جہاں ہمیں حمزہ خان یا رئیس قادر خان جیسے لوگوں کا خوف نہیں ہوگا''۔

''پتہ نہیں، وہ دن آئیں گے بھی یا نہیں۔'' ناہید دھیرے سے بڑبڑائی۔

''آئیں گے، ضرور آئیں گے...... بلکہ بہت جلد آئیں گے۔'' میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے پُرزور انداز میں کہا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ میں اس سلسلے میں خود عجیب سی مایوسی کا شکار ہونے لگا تھا۔

''میرے دل میں مستقبل کے بارے میں عجیب عجیب اندیشے سر اٹھانے لگے ہیں۔ شہباز! ہم کوئی بھی پروگرام بناتے ہیں تو کوئی ایسا واقعہ پیش آ جاتا ہے کہ سب کچھ ملیا میٹ ہو جاتا ہے۔ نہیں شہباز! جو کچھ کرنا ہے، کر گزرو، میں ایسے حالات میں نہیں رہ سکتی۔ ہم نہ چاہتے ہوئے بھی جس راستے پر چل رہے ہیں اس پر ہم ایسے ہی حالات سے گزرتے رہیں گے۔ ضروری تو نہیں کہ ہم ہر دفعہ بچ کر نکلنے میں کامیاب ہو جائیں اب تک مقدر نے ہمارا ساتھ دیا ہے، تم بہاولپور میں ایک قتل میں ملوث ہونے سے بال بال بچے تھے۔ یہاں کراچی میں تمہیں حمزہ خان نے قاتل بنا دیا، بعد میں اس کی سازش ناکام ہوگئی۔ رئیس قادر خان کے چنگل سے بھی ہم خوش نصیبی سے بچ نکلے...... لیکن شہباز! ہمیشہ تو قسمت ہمارا ساتھ نہیں دے گی''۔

''ہاں ناہید!'' میں نے گہرا سانس لے کر کہا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن ہم کر بھی کیا سکتے ہیں؟ صرف کوشش! وہ ہم کر رہے ہیں۔''

''کب کی ہے تم نے کوشش؟'' ایک دم اس نے میری بات کاٹی۔ ''تم نے، میں نے...... ہم دونوں نے یہاں سے نکلنے کی صرف باتیں ہی کی ہیں، عملی کوشش کی ہی نہیں۔ بس...... اب فلیٹ پر پہنچتے ہی ہم اپنا ضروری سامان اٹھائیں گے اور کہیں نکل چلیں گے۔''

''اس طرح ہم کہاں جا سکیں گے؟'' میں نے کہا۔ ''کچھ پلاننگ تو کرنی ہی پڑے گی نا۔ حالات بھی دیکھنے پڑتے ہیں ناہید! معلوم نہیں حمزہ خان کیا سوچ رہا ہوگا، کل رات مجھے اس کے غیر ملکی مہمانوں کو لینے کے لیے اس کی کوٹھی پر جانا تھا۔ میرے نہ پہنچنے پر اس نے نہ جانے اس سے کیا نتیجہ اخذ کیا ہو۔ بہرحال ہم اسے ساری بات بتا دیں گے تو اس کے شکوک ختم ہو جائیں گے۔ بہتر یہی ہے کہ ہم کچھ دنوں کے بعد یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں''۔

''تاکہ رئیس قادر خان جو کچھ اس مرتبہ نہیں کر سکا، آئندہ کر گزرے؟'' ناہید نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''اب قادر خان ہمارے راستے میں نہیں آئے گا۔'' میں نے کمزور سے لہجے میں کہا۔

''یہ تمہاری بھول ہے شہباز! وہ ایسا شخص نہیں معلوم ہوتا کہ اس معاملے کو بھول جائے۔ وہ تو آٹھ سال پہلے کی بات ابھی تک نہیں بھولا تھا اور موقع ملتے ہی اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے تمہیں قتل اور مجھے اذیت ناک انجام سے دوچار کرنے کا اظہار بھی کر چکا تھا۔ اب وہ ہمارا پیچھا نہیں چھوڑے گا اور اپنی شکست کا بدلہ لینے کی کوشش ضرور کرے گا۔''

''پھر کیا کرنا چاہئے؟'' میں نے کہا اس کی باتوں نے مجھے قائل کر دیا تھا۔

"وہی جو میں نے کہا ہے۔" ناہید بولی۔ "اور کچھ نہیں ہو سکتا تو یہیں کراچی میں کہیں ایسے علاقے میں مکان کرائے پر لے لو جہاں ہم منتقل ہو جائیں۔ اتنا بڑا شہر ہے یہ لاکھوں افراد یہاں رہتے ہیں، کیا ہم دو انسان اتنے لوگوں کے درمیان خود کو پوشیدہ رکھ کر نہیں رہ سکتے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے گہرا سانس لے کر کہا۔ "فلیٹ پر پہنچ کر دیکھتے ہیں کہ وہاں کیا حالات ہیں پھر موقع مناسب دیکھ کر ممکن ہوا تو آج ہی نکل چلیں گے پھر جہاں ہمیں قسمت لے جائے۔"

میری بات سن کر ناہید قدرے مطمئن ہو گئی تھی اب ہم شہر کی حدود میں داخل ہو رہے تھے، سڑک پر ٹریفک ایک دم بڑھ گئی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ کسی مناسب جگہ پر رئیس قادر خان کی گاڑی کو چھوڑ کر ٹیکسی کے ذریعے کلفٹن پہنچا جائے اس گاڑی کی وجہ سے ہمیں کسی پریشانی کا سامنا بھی کرنا پڑ سکتا تھا۔

☆======☆======☆

دو پہر کے بارہ بج رہے تھے جب ہم اس عمارت کے سامنے پہنچے جس کے گراؤنڈ فلور پر ہمارا فلیٹ تھا، شہر میں داخل ہونے کے بعد ہم نے ایک جگہ رئیس قادر خان کی گاڑی چھوڑ دی تھی اور کچھ فاصلہ پیدل طے کر کے ہم ٹیکسی میں کلفٹن پہنچے تھے چونکہ ہمارے پاس فلیٹ کی چابی نہیں رہی تھی اس لیے ہم عمارت کے دائیں طرف بنے ہوئے دفتر میں چلے گئے جہاں سے ہم ڈپلی کیٹ چابی حاصل کر سکتے تھے۔ وہاں ہمیں بتایا گیا کہ ہمارے فلیٹ میں کوئی صاحب رہائش پذیر ہیں اور سوزو نامی شخص گزشتہ رات ڈپلی کیٹ چابی لے گیا تھا۔ سوزو وہاں اکثر آتا جاتا رہتا تھا اور انتظامیہ والے اسے فلیٹ کے مالک کے ملازم کے طور پر جانتے تھے۔

میں سمجھ گیا کہ گزشتہ رات میں حمزہ خان کے غیر ملکی مہمانوں کو لینے کے لیے اس کی کوٹھی پر نہیں پہنچا تھا تو یقیناً اس نے سوزو کے ہمراہ مہمانوں کو فلیٹ پر پہنچا دیا تھا۔ بہر حال ہم فلیٹ کی طرف چل دیئے۔ میں نے سوچا کہ نہا دھو کر اور لباس تبدیل کرنے کے بعد کلفٹن فن لینڈ کی پارکنگ سے اپنی گاڑی لے کر ڈیفنس، حمزہ خان کی کوٹھی پر چلا جاؤں گا اور اسے خود پر بیتنے والی افتاد کا ماجرا سناؤں گا۔ وہ نہ جانے میرے بارے میں کن شکوک و شبہات کا شکار ہو رہا ہوگا۔

ہم جیسے ہی فلیٹ میں داخل ہوئے، میں نے کمروں کے درمیان رکھی ہوئی ڈائننگ

ٹیبل کی ایک کرسی پر ایک شخص کو بیٹھے دیکھا۔ اس نے چونک کر ہماری طرف دیکھا اس کی آنکھوں پر عینک لگی ہوئی تھی۔ ہونٹوں کے درمیان سگار دبا ہوا تھا، سر کے بال سفید ہو رہے تھے لیکن اس سفیدی نے اس کے وقار میں اضافہ کر دیا تھا۔ مجھے یہاں غیر ملکیوں کی موجودگی کی توقع تھی لیکن وہ شخص غیر ملکی ہرگز نہیں تھا۔ میں حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا اچانک وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور دو قدم میری طرف بڑھا۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے اس نے بارعب اور بھاری آواز میں کہا۔ "کہاں مر گئے تھے تم؟"

اس کے لہجے میں غصہ نمایاں تھا۔

میں اپنی جگہ جم کر رہ گیا۔ ناہید کی گرفت میرے بازو پر سخت ہو گئی۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس شخص کو دیکھ رہا تھا اس سے پہلے میں نے صرف اس کی آواز ہی سنی تھی۔ رشاد نے مجھے بتایا تھا کہ وہ کسی کے سامنے نہیں آتا اس نے اپنے احکامات کارندوں تک پہنچانے کے لیے بھی ہمیشہ ٹیلی فون کی مدد لی تھی۔ اپنی کوٹھی میں بھی وہ کسی کے سامنے نہیں آتا تھا۔ میں آواز سے اسے شناخت کر چکا تھا، وہ حمزہ خان تھا۔

اس کی وہاں موجودگی کا صاف مطلب تھا کہ کوئی خاص واقعہ پیش آ چکا ہے اس کو اپنے سامنے دیکھ کر نہ جانے کیوں میں خود کو کسی نادیدہ گرداب میں چکراتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ حمزہ خان نے میرے سامنے آ کر گویا میری واپسی کی تمام راہیں مسدود کر دی تھیں۔

میں نے کھنکار کر حلق صاف کیا اور قدرے نرم اور مؤدبانہ لہجے میں کہا۔ "آپ کو یہاں دیکھ کر مجھے حیرت ہو رہی ہے، جناب!"

"حیرت تو مجھے بھی ہو رہی ہے تمہیں دیکھ کر۔" اس نے کہا۔ اس کے لہجے میں اب بھی خفگی تھی۔ "میں تو سمجھ رہا تھا کہ تمہیں تلاش کرنے کے لیے مجھے کچھ "خاص" لوگوں کی خدمات حاصل کرنا پڑیں گی۔"

"آپ کو میرے سلسلے میں ایسی کوئی زحمت کبھی نہیں کرنی پڑے گی۔" یہ کہہ کر میں نے اپنے کندھوں پر لپٹی چادر اُتار کر ایک طرف پھینک دی اور گہرا سانس لے کر بولا۔ "میں کل رات مقررہ وقت پر آپ کی کوٹھی پر نہیں پہنچ سکا دراصل......"

اس کے بعد میں نے اپنے اور ناہید کے اغوا کی پوری روداد، پھر رئیس قادر خان کے بنگلے سے فرار کی داستان تفصیل سے سنا دی اس دوران میں ناہید کمرے میں چلی گئی تھی اور میں حمزہ خان کے اشارے پر اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ جب تک میں بولتا رہا، وہ

خاموشی اور غور سے سنتا رہا۔ میرے خاموش ہونے پر اس نے کہا۔

''تم بہادر آدمی ہو شہباز!'' اب اس کے لہجے میں تبدیلی آ چکی تھی۔ ''میں بہادر اور دلیر لوگوں کی قدر کرتا ہوں اور میں انہیں اپنے قریب رکھتا ہوں۔ کل رات آٹھ بجے تم میری کوٹھی نہیں پہنچے تو میرے دل میں تمہارے لیے شک ضرور پیدا ہوا تھا...... اور ممکن تھا کہ میں تمہاری تلاش کے سلسلے میں کوئی کارروائی بھی کرتا...... لیکن ایک اچانک پیدا ہو جانے والے مسئلے کی وجہ سے میں فوری طور پر کچھ نہ کر سکا۔ خیر حالات بہتر ہونے پر ہم رئیس قادر خان سے بھی نمٹ لیں گے۔''

''جناب! آپ کسی مسئلے کی بات کر رہے تھے۔'' میں نے کہا۔ ''آپ کی یہاں موجودگی میرے لیے بڑی تعجب خیز ہے اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے بتائیں کہ ایسا کیا مسئلہ پیش آ گیا تھا کہ آپ کو اپنی کوٹھی چھوڑ کر یہاں آنا پڑا؟''

''اشرف خان ایک بار پھر وار کر گیا۔'' وہ دانت پیستے ہوئے بولا۔ ''پہلے بھی وہ مجھے خاصا نقصان پہنچا چکا ہے، کل رات بھی وہ ایک اوچھی حرکت کر گزرا۔''

''اس نے ایسا کیا کر دیا جناب!'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''کل شام میں نے اسے فون پر بتایا کہ اس کا ''مال'' میرے پاس ہے اگر وہ اسے دوبارہ حاصل کرنا چاہتا ہے تو رات نو بجے میری کوٹھی پر آ جائے، وہ مال کی طرف سے خاصا پریشان تھا۔ ایک غیر ملکی پارٹی سے معاہدے کے مطابق ہیروئن کو کھلونوں میں چھپا کر فوری طور پر بندرگاہ کے گودام میں پہنچانا تھا تاخیر اس کے لیے ناقابلِ تلافی نقصان کا سبب بن سکتی تھی اس نے کہا کہ وہ ہر قیمت پر اپنا مال واپس لینا چاہتا ہے اس نے نو بجے میری کوٹھی پر آنے کی حامی بھر لی تھی۔ میں نے اشارتاً اسے رقم بھی بتا دی جو اسے ادا کرنی تھی۔ وہ فوراً آمادہ ہو گیا۔ آٹھ بجے سے پہلے سوزو ائیر پورٹ سے غیر ملکی مہمانوں کو لے آیا تھا لیکن تم نہیں پہنچ سکے، دونوں غیر ملکی میرے توسط سے یہاں کچھ پارٹیوں سے ملنے والے تھے جن سے بڑے پیمانے پر چرس اور ہیروئن خریدی جاتی تھی۔ جب تم وقت پر نہیں پہنچے تو میں نے انہیں تمہارا انتظار کرنے کا کہا لیکن وقت گزرتا گیا اور تم نہیں آئے۔ آخر کار میں نے سوزو کے ساتھ انہیں ایک ہوٹل میں بھیج دیا کیونکہ نو بجے میری کوٹھی پر اشرف خان آنے والا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ غیر ملکیوں کی موجودگی میں اشرف خان وہاں آ جائے...... پونے نو بجے میں نے انہیں ایک ہوٹل بھیج دیا...... اور میں تمہیں حکم عدولی کی سزا بھی دینا چاہتا تھا۔ پہلے میں اشرف خان سے ملنا چاہتا تھا، ابھی نو بجنے میں کچھ دیر باقی تھی کہ میرے ایک جاننے

والے کا فون آ گیا۔ وہ پولیس انسپکٹر ہے اس نے اطلاع دی کہ ایس پی کی سرکردگی میں ایک پولیس پارٹی میری کوٹھی پر چھاپہ مارنے کے لیے روانہ ہو چکی ہے......''

''اوہ'' وہ خاموش ہوا تو بے اختیار میرے ہونٹوں سے نکلا۔ پھر میں نے کہا۔ ''آپ نے تو کہا تھا کہ وہ اپنا مال ہر قیمت پر واپس لینا چاہے گا...... اور اسے اس کی فوری ضرورت بھی تھی۔''

''ہاں......'' حمزہ خان نے گہرا سانس لے کر کہا۔ ''اس نے سوچا ہو گا کہ اس طرح مال بھی ہاتھ آ جائے گا اور میں گرفتار بھی ہو جاؤں گا اس طرح اسے دہرا فائدہ ہوتا۔ ایک تو اسے وہ رقم مجھے نہ دینی پڑتی جو میں نے طلب کی تھی دوسرے میں گرفتار ہونے کے بعد اس کے راستے سے ہٹ جاتا۔''

''لیکن جناب! اگر پولیس چھاپہ مار کر ہیروئن برآمد کر لیتی تو اشرف خان کے ہاتھ کیا آتا؟'' میں نے نہ سمجھنے والے انداز میں پوچھا۔

اس نے دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ اس طرح میری طرف دیکھا جیسے اس کے سامنے کوئی نادان اور ناسمجھ بچہ بیٹھا ہے اس نے کہا۔ ''مال برآمد ہونے کے بعد تھوڑی ہی دیر میں اشرف خان کے پاس پہنچ جاتا اس طرح اسے صرف چند لاکھ روپے خرچ کرنے پڑتے اور میری کوٹھی سے چرس یا شراب برآمد [illegible]تی جو اشرف خان خود فراہم کرتا اس طرح میرے خلاف کیس بھی مضبوط ہو جاتا۔ اشرف خان کا کام بھی ہو جاتا۔ پولیس بھی فائدے میں رہتی۔ خیر اطلاع ملتے ہی میں فوراً ہیروئن کا پیکٹ اٹھا کر اپنی کوٹھی سے نکل آیا اور اس فلیٹ پر آ گیا۔ میرا اندازہ تھا کہ تم مجھے دھوکہ دے کر فرار ہو گئے ہو لہٰذا یہ فلیٹ میرے لیے بہتر پناہ گاہ ثابت ہو سکتی تھی اور میرے خاص لوگوں کے علاوہ کوئی شخص اس فلیٹ سے آگاہ نہیں ہے''۔

''وہ پیکٹ آپ یہاں لے آئے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں!'' اس نے جواب دیا اور پھر کہا۔ ''میں نے یہ سب کچھ تمہیں اس لیے بتایا ہے آئندہ تم میرے رائٹ ہینڈ کے طور پر کام کرو گے۔ میں تمہارے ذریعے اشرف خان کے خلاف کارروائی بھی کرنا چاہتا ہوں۔''

میں نے جی کڑا کر کے کہا۔ ''حکم کریں جناب! مجھے کیا کرنا ہو گا؟''

وہ چند لمحے مجھے سوچتی ہوئی نظروں سے گھورتا رہا پھر بولا۔ ''تم ایسا کرو کہ اپنا سامان یہاں سے اٹھا کر کسی ہوٹل میں منتقل ہو جاؤ...... بریف کیس میں وہ پیکٹ بھی لے جاؤ جس

میں اشرف خان کا کروڑوں کا مال پیک ہے اس کا خاص خیال رکھنا اور اسے حفاظت سے رکھنا۔ دو دن کے بعد ارشاد اور پروین یہاں پہنچنے والے ہیں، وہ تم سے پیکٹ وصول کر لیں گے۔ یہ فلیٹ خاصا محفوظ ہے لیکن میں معمولی سا رسک بھی نہیں لینا چاہتا۔ اشرف خان کے کارندے پورے شہر میں کتوں کی طرح میری بو سونگھتے پھر رہے ہوں گے۔ بالفرض وہ کسی طرح یہاں تک پہنچ بھی گئے تو انہیں مال نہیں ملے گا...... تم سمجھ رہے ہو نا میری بات......؟ تم ہوٹل میں رہو گے اور دو دن بعد ارشاد تم سے ہوٹل ہی میں ملے گا۔''

''ٹھیک ہے جناب!'' میں نے کہا۔ ''میں آپ کی ہدایت پر عمل کروں گا۔''

''تم ہوٹل گلستان میں ٹھہرنا، یہ ہوٹل صدر میں ہے اور خاصا معقول ہوٹل ہے۔ تم پہلے بھی ارشاد کے ساتھ وہاں رہ چکے ہو، وہاں پہنچ کر مجھے فون کرنا۔''

''بہتر جناب!'' میں نے جواب دیا۔

''میں پیکٹ تمہیں لا کر دیتا ہوں۔'' حمزہ خان نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''اسے سامان کے درمیان چھپا دینا، بریف کیس کو حفاظت سے رکھنا۔''

یہ کہہ کر وہ دائیں طرف والے کمرے میں گیا اور تھوڑی دیر کے بعد وہی خوب صورت گفٹ پیپر میں ملفوف پیکٹ میرے حوالے کر دیا جو قریب المرگ کمال نے میرے حوالے کیا تھا جس کو حاصل کرنے کے لیے اشرف خان سرگرداں تھا۔

میں پیکٹ اٹھائے اس کمرے میں چلا آیا جس میں ناہید موجود تھی۔ وہ غسل کر کے لباس تبدیل کر چکی تھی۔ پیکٹ کو بیڈ پر رکھ کر میں نے الماری سے اپنے لیے سوٹ نکالا اور ناہید کو سامان پیک کرنے کی ہدایت کر کے باتھ روم میں گھس گیا۔ ناہید کے استفسار پر میں نے اسے مختصر الفاظ میں بتا دیا کہ ہم ہوٹل منتقل ہو رہے ہیں۔

جب میں باتھ روم سے نکلا تو ناہید کچن میں کھانا گرم کر رہی تھی۔ میرے پوچھنے پر حمزہ خان نے بتایا کہ وہ فی الحال کھانا نہیں کھائے گا لہٰذا ناہید اور میں نے کچن میں ہی کھانا کھایا اور اس کے بعد میں سوٹ کیس میں اپنا سامان پیک کرنے لگا۔ ناہید میری مدد کرنے لگی اس سے فارغ ہو کر میں نے ہیروئن کا پیکٹ اٹھایا اور بریف کیس میں رکھنے لگا۔ دفعتاً ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح لپکا اور میں چند لمحے خاموش بیٹھا رہ گیا۔ کھلا بریف کیس میرے سامنے تھا۔ یکا یک گویا میں ایک حتمی فیصلے پر پہنچ گیا اور ہیروئن کے پیکٹ کو بریف کیس سے نکال کر بیڈ کے نیچے کھسکا دیا۔ ناہید حیرت سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

''یہ...... یہ تم کیا کر رہے ہو؟'' ناہید نے حیرت سے پوچھا۔

''وہی، جو مجھے کرنا چاہئے۔'' میں نے جواب دیا اور اٹھ کر اس کے قریب چلا گیا۔

''کیا یہ پیکٹ تم یہیں چھوڑ جاؤ گے؟''

''ہاں۔'' میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''میرے ذہن میں ایک منصوبہ آیا ہے ناہید! اس کی تفصیل میں تمہیں ہوٹل پر چل کر بتاؤں گا۔ بس یوں سمجھو کہ ہم نے یہاں سے واپسی کے لیے ابتدائی جدوجہد شروع کر دی ہے۔ حمزہ خان کو معلوم نہیں ہونا چاہئے کہ ہم پیکٹ کو یہیں چھوڑے جا رہے ہیں۔''

ناہید نے اثبات میں دھیرے سے سر ہلایا۔ اس کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ میری اس حرکت سے الجھن کا شکار ہے۔ بہر حال، میں نے بریف کیس اور سوٹ کیس اٹھا کر فلیٹ کے دروازے کے قریب رکھ دیے اور حمزہ خان کی طرف پلٹا جو ڈرائنگ روم کے دروازے پر کھڑا تھا۔ میں نے کہا۔ ''جناب! میری گاڑی کلفٹن فن لینڈ کی پارکنگ میں کھڑی ہے۔ اس کی چابیاں اب میرے پاس نہیں رہیں۔ میں ناہید کو سامان کے ساتھ ہوٹل پر چھوڑ کر کار کو وہاں سے لانے کا کچھ انتظام کروں گا۔ میں نے قریبی مارکیٹ میں ایک چابی تالے والے کی دکان دیکھی تھی۔ میں اسے لے کر جاؤں گا اور......''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' حمزہ خان نے بھاری آواز میں کہا۔ اس کے لہجے سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کمرے میں شراب پیتا رہا تھا۔ ''تم جاؤ، میں سوزو کے ذریعے گاڑی منگوا لوں گا۔'' پھر اچانک اس نے پوچھا۔ ''وہ پیکٹ تم نے بریف کیس میں رکھ دیا ہے نا؟''

''جی ہاں۔'' میں نے حتی المقدور متوازن لہجے میں جواب دیا۔ میرے دل کی دھڑکن اچانک تیز ہو گئی تھی۔ پھر میں نے کہا۔ ''تو اب ہم جائیں؟''

''ہاں، پیکٹ کا خیال رکھنا۔''

آپ اس کی طرف سے کوئی فکر نہ کریں۔'' میں نے کہا۔

''اور اب تمہیں اس فلیٹ پر آنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' حمزہ خان نے کہا۔ ''تم کچھ دن ہوٹل پر رہو۔ تمام اخراجات میرے ذمے ہوں گے۔ بعد میں تمہارے لیے رہائش کا کوئی مستقل انتظام ہو جائے گا۔'' یہ کہہ کر اس نے پرس سے ہزار ہزار کے دس نوٹ نکال کر میری طرف بڑھائے۔ ''یہ رکھ لو اور ہوٹل پہنچ کر مجھے فون ضرور کرنا۔''

''جی بہتر۔'' میں نے کہا اور اس کے ہاتھ سے نوٹ لے کر ناہید کے حوالے کیے۔

پھر میں سوٹ کیس اور بریف کیس اٹھائے باہر آ گیا۔ سڑک پر پہنچتے ہی ہمیں ایک خالی ٹیکسی مل گئی اور ہم اس میں بیٹھ کر صدر روانہ ہو گئے۔ ڈرائیور نے سوٹ کیس ڈکی میں رکھ دیا تھا

جبکہ بریف کیس میں نے اپنے پاس رکھا تھا۔

ہمیں گلستان ہوٹل کی پہلی ہی منزل پر ایک ڈبل روم مل گیا۔ میں نے کاؤنٹر پر پانچ ہزار روپے پیشگی ادا کر کے کمرے کی چابی لے لی۔ ایک پورٹر نے آگے بڑھ کر ہمارا سامان اٹھایا اور ہم اس کے پیچھے چلتے ہوئے کمرے میں آ گئے۔ ہوٹل خاصا پُرسکون اور کمرہ آرام دہ تھا۔ پورٹر کو ٹپ دے کر میں نے دروازہ بند کر دیا۔ میرے پلٹتے ہی ناہید نے سوال جڑ دیا۔

''ہاں، اب بتاؤ شہباز! تم کس منصوبے کی بات کر رہے تھے؟ حمزہ خان کا دیا ہوا پیکٹ تم وہیں کیوں چھوڑ آئے ہو؟''

وہ خاصی بے صبری ہو رہی تھی۔ میں نے اسے اپنے قریب بٹھا کر مختصر الفاظ میں اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔ پوری بات سن کر وہ پُرجوش لہجے میں بولی۔ ''یہ تم نے واقعی ذہانت کا ثبوت دیا ہے شہباز! اس طرح یقیناً حمزہ خان سے ہماری جان چھوٹ جائے گی، لیکن ارشاد کے بارے میں تم نے کیا سوچا ہے۔ وہ اور پروین دو دن بعد یہاں پہنچنے والے ہیں۔''

''مجھے ان دونوں کی زیادہ فکر نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ویسے بھی ان کے آنے میں ابھی دو دن باقی ہیں۔ اس سے پہلے ایسے حالات پیدا ہو چکے ہوں گے کہ شاید وہ فی الحال کچھ عرصے تک کراچی آنے کی جرأت ہی نہ کر سکیں۔ بہرحال، اگر تقدیر نے ہمارا ساتھ دیا اور حالات اسی طرح پیش آتے رہے جس طرح ہم نے سوچا ہے تو امید ہے کہ ہم آزاد، خود مختار اور شریفانہ زندگی کا آغاز کر سکیں گے۔''

''خدا کرے ایسا ہی ہو۔'' ناہید بڑبڑائی۔

''انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔'' میں نے پُرامید لہجے میں کہا اور اٹھ کر بیڈ کے قریب سائیڈ ٹیبل پر رکھے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا لیا۔ ہوٹل کے آپریٹر کو فلیٹ کا فون نمبر بتا کر لائن ملانے کی ہدایت کی۔ تھوڑی دیر بعد حمزہ خان کی آواز سنائی دی۔

اس نے پوچھا۔ ''تم ہوٹل پہنچ گئے؟''

''جی ہاں۔''

''گلستان ہی میں ٹھہرے ہو نا؟''

''جی ہاں۔ میں وہیں سے بات کر رہا ہوں۔''

''اپنے کمرے کا نمبر بتاؤ۔''

میں نے فلور اور کمرے کا نمبر بتایا تو اس نے ایک بار پھر پیکٹ کی حفاظت کی ہدایت کی اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

اب مجھے ایک مشکل مرحلہ سر کرنا تھا جو کام میں کرنے جا رہا تھا، اس میں خطرہ بھی تھا۔ بہرحال اپنی آزادی کے لیے اور ناہید کے ساتھ پُرسکون زندگی گزارنے کے لیے میں نے یہ خطرہ مول لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اب اس پر عمل درآمد کے لیے مجھے ہوٹل سے باہر جانا تھا۔ میں اس سلسلے میں تاخیر نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ اگر حمزہ خان کو فلیٹ میں پیکٹ کی موجودگی کا علم ہو گیا تو میرا منصوبہ ناکام ہو سکتا تھا۔

ناہید کو ساری بات سمجھا کر اور اسے وہیں رکنے کا کہہ کر میں نیچے کاؤنٹر پر آ گیا اور کلرک سے کراچی شہر کی ٹیلی فون ڈائریکٹری طلب کی۔ اس نے مسکرا کر سر کو خفیف سا خم دیا اور کاؤنٹر میں قدرے نیچے بنی ہوئی ایک دراز کھول کر اس میں سے ڈائریکٹری کی تینوں جلدیں نکال کر میرے سامنے رکھ دیں۔

ڈائریکٹری لے کر میں ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ میں نے کاؤنٹر پر کھڑے کھڑے سرسری طور پر ڈائریکٹری کا جائزہ لیا تھا۔ ابتدائی صفحات پر اہم فون نمبر درج تھے۔ جس سے میرا کام مزید آسان ہو گیا تھا۔ فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے میں نے ابتدائی صفحات پر نگاہ ڈالی اور ایک نمبر منتخب کر لیا جس پر مجھے فون کرنا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ مجھے ایک سے زیادہ فون کرنے پڑتے۔

مجھے کسی ایسے پی سی او کی تلاش تھی جہاں سے میں رازداری اور اطمینان سے بات کر سکتا۔ تقریباً آدھے گھنٹے کی تلاش کے بعد میں ایک پی سی او میں داخل ہو گیا جس میں چھوٹے چھوٹے بوتھ بنے ہوئے تھے۔ کاؤنٹر پر ایک باریش بزرگ بیٹھے تھے۔ میں نے انہیں ایک نمبر ملانے کا کہا جو میں ڈائریکٹری سے یاد کر چکا تھا۔ انہوں نے نمبر ملایا اور مجھے بوتھ نمبر تین میں جانے کی ہدایت کی۔ میں نے بوتھ میں جا کر ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا لیا۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔ بائیں ہاتھ سے میں نے دروازہ بند کر دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد رابطہ ہو گیا اور ریسیور میں سے آواز آئی۔

''ہیلو، پولیس ہیڈ کوارٹرز۔''

''مجھے ایس پی شہر یار گوندل صاحب سے بات کرنی ہے۔'' میں نے اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کون صاحب بات کر رہے ہیں ایس پی صاحب سے کس سلسلے میں بات کرنا چاہتے ہیں؟'' دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

میں نروس ہونے لگا تھا گو کہ میں ایک انتہائی خطرناک کام کرنے جا رہا تھا اور اس

کے لیے میں ذہنی طور پر خود کو تیار کر چکا تھا لیکن اس کے باوجود اپنی گھبراہٹ پر قابو پانا میرے لیے بہت مشکل ہو رہا تھا۔ میں نے کہا۔'' دیکھیے جناب......! ام...... میں...... ایس پی صاحب کو ایک اہم اطلاع دینا چاہتا ہوں...... میں اپنا نام نہیں بتاؤں گا۔''

'' ایسی گمنام کالیں دن میں کئی آتی ہیں۔'' دوسری طرف سے قدرے سخت لہجے میں کہا گیا۔'' پہلے آپ اپنا نام اور پتا بتائیں اور اس کے بعد یہ بتائیں کہ آپ کس قسم کی اطلاع دینا چاہتے ہیں......''

بات لمبی ہوتی جا رہی تھی اور ایسا میں نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔'' میں حمزہ خان کے بارے میں اطلاع دینا چاہتا ہوں اور میں اپنا نام پتا نہیں بتاؤں گا۔ آپ ایس پی صاحب سے میری بات کرا دیں ورنہ میں فون بند کرتا ہوں۔''

'' آپ کس حمزہ خان کی بات کر رہے ہیں؟''

'' آپ فضول میں وقت ضائع کر رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔ رفتہ رفتہ میرے اندر خود اعتمادی پیدا ہو گئی تھی۔'' آپ ایس پی صاحب کو حمزہ خان کا حوالہ دیں گے تو وہ فوراً مجھ سے بات کرنا چاہیں گے۔''

'' پلیز ایک منٹ ہولڈ کیجئے۔'' ریسیور سے آواز آئی۔ غالباً وہ سمجھ گیا تھا کہ میں نے کس حمزہ خان کا حوالہ دیا ہے۔ تقریباً ایک منٹ تک میں ریسیور کان سے لگائے کھڑا رہا۔ ایک بار پھر میری خود اعتمادی جواب دینے لگی۔ میرے دل میں آیا کہ ریسیور رکھ کر یہاں سے نکل جاؤں۔ اس سے پہلے کہ میں اپنے اس خیال پر عمل کر گزرتا، دوبارہ ریسیور میں گویا جان پڑ گئی۔

''ہیلو، ایس پی صاحب سے بات کیجئے۔''

یکایک میرا جسم تن گیا۔ ہاتھوں اور پیروں کی کپکپاہٹ پر قابو پانا میرے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ میرے ذہن میں یہ خیال بھی ابھر رہا تھا کہ جو کرنے جا رہا ہوں یہ غلط ہے۔ اگر فلیٹ پر حمزہ خان نے پیکٹ دیکھ لیا تو وہ فوراً میری چال کو سمجھ جائے گا اور وہاں سے فرار ہو جائے گا۔ ایس پی نے میری اطلاع پر کارروائی کی بھی تو اسے وہاں حمزہ خان نہیں ملے گا اور پھر کیا ہوتا......؟ یہ میں سمجھ سکتا تھا۔ حمزہ خان مجھے ہرگز زندہ نہ چھوڑے گا۔ کراچی جیسے اجنبی شہر میں، جہاں میرا کوئی دوست کوئی شناسا نہیں تھا۔ میں ناہید کو ساتھ لئے کہاں بھاگ سکتا تھا، کہاں چھپ سکتا تھا؟

میری ہمت جواب دینے لگی۔ میں ریسیور رکھنے ہی والا تھا کہ میرے کانوں میں ایک

بھاری اور بارعب آواز آئی۔'' یس ایس پی شہریار گوندل سپیکنگ!''

کوشش کے باوجود نہ میں کریڈل دبا کر رابطہ منقطع کر سکا اور نہ ہی کوئی لفظ میرے ہونٹوں سے نکل سکا۔ میرے خاموش رہنے پر دوبارہ ایس پی صاحب کی آواز سنائی دی۔

''ہیلو، بولئے...... آپ مجھے کوئی اطلاع دینا چاہتے تھے؟''

'' جج...... جی ہاں۔'' میرے ہونٹوں سے بھنچی بھنچی سی آواز نکلی۔

'' جی، کہئے۔'' ایس پی صاحب کی قدرے نرم آواز آئی۔'' میرا پی اے بتا رہا تھا کہ آپ حمزہ خان کے بارے میں کوئی اطلاع دینا چاہتے ہیں۔''

'' جی ہاں۔'' میں نے ہمت مجتمع کر کے کہا۔'' کل رات اس کی ڈیفنس والی کوٹھی پر پولیس نے چھاپا مارا تھا لیکن وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اب وہ جہاں ہے، میں اس جگہ کی نشاندہی کر سکتا ہوں۔''

'' پہلے آپ اپنا تعارف کرا دیں تو بہتر ہے۔''

'' یہ اتنا ضروری نہیں ہے جناب!'' میں نے جواب دیا۔

'' دیکھیے، اگر آپ کی اطلاع درست ہوئی تو آپ کو انعام ملے گا......''

'' مجھے انعام کا کوئی لالچ نہیں ہے۔'' میں نے ختمی لہجے میں کہا۔'' حمزہ خان کلفٹن کے ایک فلیٹ میں موجود ہے۔ وہاں نہ صرف آپ حمزہ خان کو گرفتار کر سکیں گے بلکہ اس کے خلاف آپ کو وہاں سے خاصی مقدار میں '' ثبوت'' بھی ملے گا۔''

میرا اشارہ وہ سمجھ چکے تھے۔ یکایک ان کی دلچسپی بڑھ گئی انہوں نے پوچھا۔'' آپ کو یقین ہے کہ ہمیں اس کے خلاف کوئی '' ثبوت'' بھی مل جائے گا؟''

'' جی ہاں۔ اسے مجرم ثابت کرنے کے وہ پیکٹ کافی ثابت ہو گا جو ایک گفٹ پیپر میں لپٹا ہوا پارسل کی صورت میں ہے۔''

'' فلیٹ کا نمبر اور پتا بتائیے۔'' دوسری طرف سے قدرے عجلت میں پوچھا گیا۔ غالباً ایس پی صاحب کو میری اطلاع کی صداقت پر یقین آ گیا تھا۔ میں نے علاقے اور عمارت کے نام کے ساتھ ساتھ فلور اور فلیٹ کا نمبر بھی دہرا دیا اور پھر ایک دم ریسیور رکھ دیا۔

میں نے رومال سے اپنے چہرے پر آنے والے پسینے کو پونچھا اور بوتھ سے نکل آیا۔ چھ منٹ کی کال ہوئی تھی۔ میں ادائیگی کر کے پی سی او سے باہر نکل آیا۔ آئندہ کیا ہونے والا تھا، اس کے بارے میں کسی بھی قسم کا درست اندازہ لگانا مشکل تھا۔ اگر حمزہ خان گرفتار ہو گیا تو وہ لمبی سزا سے نہیں بچ سکتا تھا۔ دوسری صورت میں ہم اس کے عتاب سے نہیں بچ سکتے

تھے۔

میں ہوٹل واپس پہنچا تو ناہید بے چینی سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے اپنی کارکردگی کے بارے میں بتایا اور اپنے خدشات سے بھی آگاہ کیا۔ پہلے تو وہ بھی پریشان ہو گئی لیکن پھر اس نے گویا مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''تم اس معاملے کا صرف تاریک پہلو ہی کیوں دیکھ رہے ہو۔ ایسا ہو بھی سکتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے۔ حمزہ خان کو بھلا کس طرح شک ہو سکتا ہے کہ ہم پیکٹ وہیں چھوڑ آئے ہیں؟ بغیر شک کے وہ پیکٹ کو تلاش کرنے کی زحمت نہیں کرے گا اور سرسری نظر سے پیکٹ اسے نظر بھی نہیں آ سکتا جب تک کہ اسے باقاعدہ تلاش نہ کیا جائے......اور یہ کام پولیس کرے گی۔ اس سلسلے میں پریشان ہونے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اب ہمیں اپنے بچاؤ کی فکر کرنی چاہئے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم یہ ہوٹل فوری طور پر چھوڑ دیں۔''

ناہید کی بات معقول تھی۔ اگر حمزہ خان پولیس سے اب بھی بچ نکلتا تو اس کا پہلا نشانہ ہم بنتے۔ وہ ہماری رہائش سے آگاہ تھا۔ میں نے اور ناہید نے باہمی مشورے سے یہ فیصلہ کیا کہ ہمیں کسی دوسرے ہوٹل میں منتقل ہو جانا چاہئے اور اس کمرے کو بھی نہیں چھوڑنا چاہئے۔

ہم نے چند ضروری چیزیں بریف کیس میں رکھیں اور گلستان ہوٹل کے کمرے میں بریف کیس کو رہنے دیا۔ اس میں ہمارے صرف کپڑے تھے۔ اگر ہم دوبارہ وہاں نہ بھی آتے تو ان چیزوں سے ہماری شناخت نہیں ہو سکتی تھی اور نہ ہی ہمارا کوئی بھاری نقصان ہوتا۔ دراصل ہم وہ کمرا بھی اپنے نام پر اس لیے رکھنا چاہتے تھے کہ ممکن تھا کہ پولیس کے چھاپے سے پہلے حمزہ خان ہمیں کسی وجہ سے گلستان ہوٹل کے کمرے میں فون کرتا تو اسے جواب ملتا کہ ہم کچھ چیزوں کی خریداری کے لیے ہوٹل سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ اس طرح وہ مطمئن رہتا۔ ہوٹل چھوڑنے کی صورت میں وہ یقیناً ہماری طرف سے مشکوک ہو جاتا اور ہم یہ نہیں چاہتے تھے۔

بریف کیس میں سامان رکھتے ہوئے ہم پر یہ اندوہناک انکشاف ہوا کہ فلیٹ سے آتے وقت سامان کے ساتھ ہم وظائف کی ڈائری رکھنا بھول گئے تھے۔ گزشتہ رات رئیس قادر خان کی قید میں گزارنے کے بعد صبح ہونے والا خونی معرکہ اور وہاں سے ہمارا فرار...... بھوک، تھکاوٹ اور نیند کی کمی کے ساتھ ہمارے فلیٹ پر حمزہ خان کی موجودگی نے بھی مجھے بوکھلا دیا تھا۔ ایسے میں سامنے کی چیز بھی نہیں سوجھتی۔ یہی کیفیت ناہید کی بھی تھی۔ وہ ڈائری

ہمارے لئے بہت کارآمد ثابت ہو سکتی تھی اور اس سے محرومی کے احساس نے یکایک مجھے مایوس اور افسردہ کر دیا تھا۔

''میں سمجھی تھی ڈائری تم نے اٹھالی ہوگی۔'' کافی دیر کی خاموشی کے بعد ناہید نے کہا اور پھر گویا صفائی پیش کرنے کی غرض سے بولی۔ ''میں تو کچن میں کھانا بنانے میں مصروف تھی۔ پیکنگ تم کر رہے تھے۔ آخر میں آکر میں نے تمہارا ہاتھ ضرور بٹایا تھا۔ میرا خیال تھا کہ......''

گہرا سانس لے کر میں نے اس کی بات کاٹی۔ ''یہ تم کس انداز میں بات کر رہی ہو ناہید؟ میں تمہیں کوئی الزام تو نہیں دے رہا۔ ہم دونوں کو ڈائری کا خیال رکھنا چاہئے تھا...... خیر، نقصان تو بہت بڑا ہوا ہے لیکن کیا کیا جا سکتا ہے۔''

''کیا تم فلیٹ پر جا کر ڈائری نہیں لا سکتے؟'' ناہید نے کہا۔

''نہیں، اب وہاں جانا حماقت ہوگی۔''

''پولیس اتنی جلدی تو کارروائی نہیں کر سکتی۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو۔'' میں نے اس سے اتفاق کیا پھر کہا۔ ''اس کے باوجود میں معمولی سا خطرہ بھی مول نہیں لینا چاہتا۔''

یہ کہہ کر میں نے بریف کیس بند کیا اور اسے اٹھا کر ناہید کے ساتھ نیچے کاؤنٹر پر آ گیا۔ کلرک سے میں نے کہا کہ ہم کچھ خریداری کے لیے بازار جا رہے ہیں اس دوران میں اگر ہمارا کوئی فون آئے تو وہ پیغام نوٹ کر لے۔

باہر آ کر ہم پیدل ہی ایک طرف چلتے رہے۔ اس علاقے میں کافی ہوٹل تھے۔ ہم ٹہلنے کے انداز میں چلتے ہوئے گلستان ہوٹل سے کافی دور آ گئے اور ایک دوسرے ہوٹل میں داخل ہو گئے۔ ہمارے پاس کافی رقم موجود تھی۔ ایک دن پہلے میں نے بینک سے پچیس ہزار روپے نکلوائے تھے جن میں سے بیس ہزار روپے میں نے کل ہی بریف کیس میں رکھ دیے تھے جو محفوظ رہے تھے۔ اس ہوٹل میں بھی میں نے پانچ ہزار روپے پیشگی ادا کیے۔ وہاں تیسری منزل پر ایک کمرا ہمیں مل گیا۔ ہم نے وہاں بھی خود کو میاں بیوی ظاہر کیا تھا۔

کمرے میں آکر ہم دونوں سو گئے۔ تھکاوٹ اور نیند کی وجہ سے ہمارا برا حال تھا۔ لہٰذا ہم نے یہی بہتر سمجھا کہ آرام کیا جائے۔ ہماری آنکھ رات دس بجے کھلی۔ مجھ سے پہلے ناہید جاگ گئی تھی۔ نہا کر ہم بالکل تازہ دم ہو گئے اور روم سروس کے ذریعے کھانا منگا کر کھا چکے تھے۔ بیڈ پر نیم دراز ہو کر ہم درپیش صورت حال پر تبادلہ خیال کرنے لگے۔ ناہید نے پوچھا۔

''حمزہ خان پر کیا بیتی، اس کے بارے میں ہمیں کس طرح معلوم ہو سکے گا؟''

''صبح میں کمرے میں ہی اخبارات منگالوں گا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اگر پولیس نے حمزہ خان کو گرفتار کرلیا تو اس کی خبر اخبارات میں ضرور چھپے گی۔''

اس موضوع پر کافی دیر تک گفتگو کرتے کرتے اچانک ناہید نے کہا۔ ''شہباز...... میں...... میں تم سے ایک بات کرنا چاہتی ہوں...... وہ دراصل......'' کہتے کہتے وہ خاموش ہوگئی۔ میں اس کے انداز اور لہجے سے چونک گیا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات عجیب ہو رہے تھے۔ وہ بیڈ پر آلتی پالتی مارے، گردن جھکائے بیٹھی تھی۔ گود میں رکھے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں مضبوطی سے پیوست تھیں۔

''کیا بات ہے ناہید؟'' اس کے قریب کھسک کر میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ''ایسی کیا بات ہے آخر، جس کے کہنے میں تم جھجک رہی ہو وہ بھی مجھ سے......!''

''تمہیں یاد ہو گا شہباز...... بہاولپور جاتے ہوئے چھوٹے ریلوے اسٹیشن پر میں نے تم سے کیا کہا تھا......'' اس کی آواز مدھم ہوگئی تھی اور گردن کا خم مزید بڑھ گیا تھا۔ یکا یک میری نظروں کے سامنے وہ منظر آ گیا۔ اس کے ساتھ ہی گویا میرے اردگرد رنگ ہی رنگ بکھر گئے۔ ناہید کہتی رہی۔ ''میں نے کہا تھا نا کہ ہم ایک ہیں شہباز...... اور ہمیشہ ایک رہیں گے......''

''ہاں، مجھے یاد ہے ناہید!'' میں نے اس کی گود میں رکھے ہاتھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ میری آواز شدت جذبات سے کپکپانے لگی تھی۔ ''تمہارے وہ الفاظ میری زندگی کا حاصل ہیں۔ میں بھلا انہیں کیسے بھول سکتا ہوں۔''

''شہباز! پے در پے ایسے حالات پیش آتے رہے کہ ہم اپنے بارے میں کچھ سوچ ہی نہ سکے۔ ہم ساتھ ساتھ رہے...... ایک دوسرے کو میاں بیوی ظاہر کیا جبکہ ہم میاں بیوی نہیں ہیں۔''

''یہ تم جانتی ہو کہ حالات کے پیش نظر ہماری یہ مجبوری تھی کہ یہ جھوٹ بولیں۔'' میں نے کہا۔

''ہمیں کب تک یہ جھوٹ بولنا پڑے گا؟'' ناہید بولی۔ ''مم...... مجھے کبھی کبھی خوف آنے لگتا ہے۔ مجھے تمہاری شرافت اور کردار کی پختگی کا یقین ہے شہباز! میری بات کا برا مت منانا...... ہمارا اس طرح ساتھ ساتھ رہنا ہرگز مناسب نہیں ہے۔ اعتبار اور اعتماد، نیک نیتی اور شرافت کے سارے حصار کی موجودگی کے باوجود مجھے ڈر لگتا ہے...... اس ایک

لمحے سے جو ہمیشہ سے رہا ہے اور رہے گا، جب تک شیطان کا وجود ہے...... شہباز! مم...... میں چاہتی ہوں کہ ہم کسی کمزور لمحے سے مات کھا کر ندامت کا بوجھ اٹھائے پھرنے سے بہتر ہے کہ اس تعلق کو شرعی اور قانونی شکل دے دیں...... تم سمجھ رہے ہو نا......؟''

میں گنگ بیٹھا اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ ''تت...... تم یہ کہنا چاہتی ہو نا کہ ہم...... شادی کرلیں؟'' میں نے گویا تصدیق چاہی۔

''ہاں......'' ناہید نے کہا۔ ''مجھے معلوم ہے تمہارے دل میں میری محبت کا جذبہ کتنا پاک صاف ہے۔ تم کو میری عزت اتنی ہی عزیز ہے جتنی خود مجھے...... اور اسی لیے میں تمہاری بہت عزت کرتی ہوں لیکن ہم جس طرح رہ رہے ہیں اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اخلاقی اور مذہبی نکتہ نظر کے مطابق بھی ایک ہو جائیں۔''

''ٹھیک ہے ناہید......!'' میں نے سرشار لہجے میں کہا۔ ''ہم کل ہی نکاح پڑھوالیں گے۔ حالات خواہ کیسے بھی پیش آئیں، ہم کل کے دن یہ کام کرگزریں گے۔''

اس کے بعد ہمارے درمیان خاموشی طاری رہی۔ نہ جانے کب تک میں مستقبل کے پُرکیف اور مسرت سے لبریز دنوں کے متعلق سوچتا رہا کیونکہ آئندہ ناہید قانوناً اور شرعاً میری ہونے والی تھی۔ یہ خیال اس قدر کیف آگیں تھا کہ وقتی طور پر حالات کی سنگینی کا خوف بھی ذہن سے معدوم ہو گیا تھا۔ کل کیا ہونے والا تھا، یہ خیال بھی لاشعور میں کہیں دبک گیا تھا۔ اس وقت ذہن کے افق پر صرف ایک خیال اپنا حصار قائم کیے ہوئے تھا کہ کل محبوب کے وصل کا دن ہے۔ درمیان میں صرف رات کا ایک مختصر فاصلہ ہے اور پھر...... میں ذرے سے آفتاب بن جاؤں گا۔ اس دنیا میں ایسے خوش نصیب کم ہی ہوں گے جنہوں نے جس ہستی کو چاہا اسے پالیا جبکہ ان کے درمیان طبقاتی فاصلہ دھرتی اور امبر جتنا ہو۔

☆======☆======☆

وہ ایک دلکش منظر تھا۔ تاحدِ نگاہ پھول ہی پھول کھلے ہوئے تھے۔ میں ناہید کا نرم و نازک ہاتھ تھامے سرشاری کی کیفیت میں پھلواری کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ فضا میں خوشبو پھیلی ہوئی تھی اور میرے پہلو میں ناہید کا معطر وجود تھا۔ ماحول اور ناہید کی قربت نے مجھ پر گویا نشہ سا طاری کر دیا۔ مدہوشی کے سے عالم میں، میں نے اپنا بازو ناہید کی کمر کے گرد حمائل کر دیا۔ اس نے اپنا سر میرے شانے پر رکھ دیا۔ اس کی زلفیں میرے چہرے کو چھونے لگیں۔ گویا لمحے ساکت ہو گئے۔ میری آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں۔ میں اپنے چہرے پر سرسراتی زلفوں کے لمس کو محسوس کر رہا تھا۔

یکا یک احساسات میں تبدیلی آگئی۔ کیف وسرور کی جگہ خوف اور دہشت نے لے لی۔ مجھے احساس ہوا کہ ناہید اچانک مجھ سے دور ہوگئی ہے لیکن میں اپنے چہرے پر اس کی زلفوں کی سرسراہٹ محسوس کر رہا تھا۔ دفعتاً مجھے احساس ہوا کہ میرے چہرے پر ناہید کی زلفیں نہیں بلکہ پتلے پتلے سانپ کلبلا رہے ہیں جو میرے نتھنوں میں، کان میں اور منہ میں گھسے جا رہے ہیں۔ میں دہشت زدہ ہو کر انہیں نوچ نوچ کر پھینکنے لگا لیکن کم ہونے کی بجائے ان میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور میرا پورا چہرہ پتلے پتلے سانپوں سے بھر گیا۔ وہ چہرے پر جابجا مجھے ڈس رہے تھے۔ میں نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ پھر میں چیخ چیخ کر ناہید کو اپنی مدد کے لیے پکارنے لگا۔ آخر کار تکلیف سے بے حال ہو کر میں اندھوں کی طرح ایک طرف دوڑنے لگا اور دونوں ہاتھوں سے سانپوں کو مارنے کے لیے اپنا چہرہ پیٹنے لگا۔ میری آنکھیں بند تھیں، میں دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن مسلسل بھاگ رہا تھا۔ اچانک میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی اور جیسے میں کسی بلند پہاڑ سے پستی کی طرف گرنے لگا۔

میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور بے اختیار میرا ہاتھ اپنے چہرے کی طرف گیا۔ جاگنے کے باوجود میرے ذہن پر دہشت ناک خواب کا اثر باقی تھا اور میرا جسم ہلکے ہلکے کپکپا رہا تھا۔ میں نے چند گہری گہری سانسیں لیں اور اٹھ کر کولر سے پانی کا گلاس بھر کر ایک ہی سانس میں پی گیا۔ میں نے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ رات کا ایک بج کر دس منٹ ہو رہے تھے۔ گویا یہ وقت...... یعنی رات کے بارہ بجے سے فجر تک ہمارے لیے پُرسکون نیند کے لیے نہیں تھا۔ میرے ذہن میں یہ خیال ابھرا کہ معلوم نہیں یہ دہشت ناک خوابوں کا عذاب ہم پر مستقل مسلط رہے گا یا کچھ عرصے کے بعد ختم ہو جائے گا؟ ظاہر ہے مجھے اس کے بارے میں کوئی یقینی اندازہ نہیں تھا۔ اگر سلسلہ مستقل جاری رہا تو ہمارے لیے عذاب سے کم نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہمیں اس وقت کے دوران میں جاگتے رہنا تھا۔ ورنہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خواب کی دہشت ناکی کے سبب میرا یا ناہید کا نیند کی حالت میں ہی ہارٹ فیل ہو جائے کیونکہ جاگنے کے بعد دل کے دھڑکنے کی رفتار معمول سے بہت زیادہ ہوتی تھی۔ اس خیال سے مجھے جھرجھری سی آگئی اور جب میں واپس بیڈ پر آیا تو ناہید بھی جاگ چکی تھی اور اس کا چہرہ دیکھ کر مجھے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی کہ وہ بھی اسی کیفیت سے گزری ہے جس سے میں دوچار ہوا تھا۔

میں نے ٹیوب لائٹ جلا کر زیرو کا بلب آف کر آیا۔

''شہباز، تم نے بھی خواب دیکھا تھا؟'' ناہید نے پوچھا۔

''ہاں۔'' میں نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ پھر گہرا سانس لے کر کہا۔ ''کاش ہم وظائف والی ڈائری ساتھ لے آتے...... اس میں ضرور ایسا وظیفہ بھی ہوتا جو ہمیں اس عذاب سے نجات دلا سکتا۔''

اس کے بعد ظاہر ہے سونا ممکن نہیں تھا۔ ہم پلنگ پر بیٹھ کر باتیں کرتے رہے، کل کی...... آنے والے دن کی جس کا طلوع ہونے والا سورج ہمارے لیے یکجائی کا پیغام لانے والا تھا۔ میں نے کہا۔ ''ہم کسی مسجد چلیں گے، کسی بھی مسجد! ہم عاقل بالغ ہیں، یہ مولوی صاحب بھی دیکھ سکتے ہیں۔ ہم حلفیہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم اپنی مرضی سے شادی کر رہے ہیں۔ شرعاً نہ گناہ ہے نہ معیوب ہے۔ ہمیں دو گواہوں کی ضرورت ہوگی جو ہمیں وہیں مسجد میں ہی مل جائیں گے۔''

صبح سات بجے ہی نے ناشتے کے ساتھ اخبارات بھی منگوا لئے۔

بیرا تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد ناشتے کی ٹرے پر اردو کے تین بڑے اخبار بھی ساتھ لایا تھا۔ بیرے کے جاتے ہی میں نے ایک اخبار اٹھا لیا اور دوسرا ناہید نے۔ دوسرے صفحے پر وہ خبر شائع ہوئی تھی۔ چند لمحے میں اخبار پر نظریں گاڑے ساکت بیٹھا رہ گیا۔ جو کچھ ہوا تھا میری توقع کے بالکل خلاف تھا۔ خبر کی سرخی تھی۔

''معروف مل اونر شفقت قریشی پولیس کے ہاتھوں ہلاک۔''

میں جلدی جلدی خبر کی تفصیل پڑھنے لگا۔ سرخی کے نیچے شفقت قریشی کی تصویر بھی چھپی تھی جو صدفی صد حمزہ خان کی تھی۔ جسے دیکھ کر ہی میں اس خبر کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ خبر کی تفصیلات خاصی ہوشربا تھیں۔

''معروف بزنس مین شفقت قریشی دہرے کردار کا مالک تھا۔ وہ کاروبار کی آڑ میں منشیات کی اسمگلنگ کرتا تھا۔ چند دن قبل پولیس کو اطلاع ملی کہ شفقت قریشی بین الاقوامی تنظیم ''فاکس سینڈیکیٹ'' کا مقامی نمائندہ ہے۔ یہ تنظیم منشیات، خصوصاً ہیروئن کی اسمگلنگ کے حوالے سے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ ایک دن قبل پولیس نے اطلاع ملنے پر ڈیفنس سوسائٹی کے ایک بنگلے پر چھاپا مارا تھا جو حمزہ خان نامی شخص کی ملکیت ہے۔ پولیس کا دعوا ہے کہ شفقت قریشی ہی اصل میں حمزہ خان ہے۔ غیر قانونی سرگرمیوں کے لیے وہ ڈیفنس والی کوٹھی کو ہیڈ کوارٹر کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ ایک دن قبل وہ پولیس کو غچا دے کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ کل شام پولیس نے اطلاع ملنے پر کلفٹن کے ایک فلیٹ پر چھاپا مارا جہاں حمزہ خان یا شفقت قریشی موجود تھا۔ پولیس کے مطابق اس نے کچن کی کھڑکی سے فرار

ہونے کی کوشش کی تھی اور وارننگ دینے پر اس نے پولیس کے ایک اہلکار کو فائرنگ کر کے زخمی کر دیا۔ پولیس کی جوابی فائرنگ سے وہ موقع پر ہی ہلاک ہوگیا۔ فلیٹ میں سے پولیس کو کچھ ایسے ثبوت بھی ملے ہیں جن سے اس کا ہیروئن کے کاروبار سے تعلق ثابت ہوتا ہے لیکن اس کے ''فاکس سینڈیکیٹ'' سے تعلق کے سلسلے میں پولیس کو کوئی تحریری یا دستاویزی ثبوت نہیں مل سکا۔''

دوسرے اخبارات میں یہی تفصیلات تھیں۔ میں اور ناہید کافی دیر اس سلسلے میں تبادلہِ خیال کرتے رہے۔ ناہید کا خیال تھا کہ جو کچھ بھی ہوا بہتر ہی ہوا۔ اب کم سے کم ہمارے سر پر حمزہ خان کے خوف کی تلوار تو نہیں لٹکی رہے گی۔ میں بھی اس کے خیال سے متفق تھا۔ ہم دونوں اس وقت خود کو آزاد تصور کر رہے تھے۔

تقریباً دس بجے ہم دونوں ہوٹل سے نکل اور پیدل ہی مختلف سڑکوں سے گزرتے معلوم نہیں کس علاقے کی طرف نکل آئے۔ اس دوران میں ہم تین مسجدوں کے پاس سے گزرے مگر نہ جانے کیوں ہم ان کے سامنے سے گزرتے چلے گئے۔ آخر کار میں نے ہمت مجتمع کی اور ایک مسجد میں داخل ہوگیا۔ میں نے ناہید کو باہر ہی رکنے کی ہدایت کی تھی۔ مسجد کے صحن میں چند بچے قرآن پڑھ رہے تھے۔ اندر چند افراد حلقہ بنائے بیٹھے تھے۔ میں ان کی طرف بڑھ گیا۔ درس دینے والا جوان آدمی تھا، درس لینے والوں میں عمر رسیدہ افراد شامل تھے۔ ان سب نے ایک ساتھ میرے سلام کا جواب دیا۔

میں نے کہا۔ ''مولوی صاحب! میرا نام شہباز ڈوگر ہے۔ اس وقت دنیا میں میرا حقیقی رشتے دار کوئی بھی نہیں ہے۔ میں حال ہی میں کراچی آیا ہوں......''

''آپ کس سلسلے میں تشریف لائے ہیں؟'' درس دینے والے نے شائستگی سے کہا۔

''یہ میں تخلیئے میں عرض کروں گا۔'' میں نے جواب دیا۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور درس لینے والے ساتھیوں سے بولا۔ ''آپ لوگ تشریف رکھیں۔ میں ان کی بات سن لوں۔''

وہ مجھے مسجد کے صحن سے ملحق اپنے دو کمروں والے گھر میں لے گیا۔ وہاں میں نے اسے بتایا۔ ''میں ایک لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ ہم دونوں الحمدللہ مسلمان ہیں اور بالغ ہیں۔ لڑکی بھی تعلیم یافتہ اور باشعور ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ کی کو حاضر ناظر جان کر حلفیہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم کسی لالچ، ڈر یا دباؤ کے بغیر بہ رضا و رغبت نکاح کرنا چاہتے ہیں اور اس میں کوئی بات خلافِ شرع بھی نہیں ہے اور نہ ہی خلافِ قانون ہے۔ ویسے تو کسی مسلمان کے

لیے حلف اٹھا کے بیان دینا بھی کافی ہے لیکن اس کے علاوہ بھی آپ اپنی تشفی کے لیے......''

''نعوذ باللہ۔'' اس نے میری بات کاٹی اور شفقت سے کہا۔ ''اس کے بعد یقین نہ کرنے والا خود مسلمان کہلانے کا مستحق نہیں۔ آپ کا اندازِ گفتگو ہی آپ کی شرافت اور صداقت کی دلیل ہے......لڑکی کہاں ہے؟''

''وہ میرے ساتھ آئی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''اسے اندر بلا لیجیے، اس طرف سے۔'' اس نے دوسرے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ ''میں آپ کی موجودگی میں اس سے چند سوالات کروں گا۔''

میں نے ناہید کو بلا لیا۔ مولانا نے اس سے صرف وہی پوچھا جو ضروری تھا۔ مثلاً آپ مسلمان ہیں، بالغ ہیں۔ آپ کی پہلے تو شادی نہیں ہوئی؟ یہ شادی آپ اپنی مرضی سے کسی دباؤ یا لالچ کے بغیر کر رہی ہیں۔ آپ خدا کو حاضر ناظر جان کے کہیں گی کہ جو کچھ آپ نے بتایا ہے سچ ہے؟

ناہید کا پورا جسم سیاہ چادر سے ڈھکا ہوا تھا اور اسی کے پلو سے اس نے چہرے پر نقاب ڈالی ہوئی تھی۔ اس نے نقاب ہٹائے بغیر سب کچھ کہہ دیا پھر مولوی نے اسے پردے کے پیچھے بھیج دیا جہاں اس کی بیوی موجود تھی۔ مولوی صاحب پھر مسجد کی طرف چلے گئے جہاں وہ اپنا درس نامکمل چھوڑ آئے تھے۔ میں اس کمرے میں اکیلا رہ گیا۔

وہ تقریباً آدھے گھنٹے بعد واپس آئے تو ان کے ساتھ چار آدمی تھے۔ غالباً وہ چاروں ہی درس میں شریک تھے۔ مولوی صاحب نے باری باری مجھے سب سے متعارف کرایا۔ وہ سب کسی تبلیغی جماعت کے کارکن تھے۔

نکاح کی رسم بڑی سادگی سے اور چند منٹ میں انجام پائی۔

مولانا صاحب خود دولہن کے وکیل ہوئے اور حاضرین میں سے دو میرے گواہ بنے۔ حق مہر پچاس ہزار روپے طے پایا۔ مولانا صاحب رجسٹرڈ نکاح خواں بھی تھے چنانچہ انہوں نے کاغذی خانہ پری کی اور جب سب لوگ دستخط کر چکے تو انہوں نے دعائے خیر کے لیے ہاتھ اٹھائے اور مجھے مبارک باد دی۔ میری ذہنی کیفیت اس وقت عجیب تھی۔ جہاں مجھے ناہید کو پانے کی خوشی تھی وہاں یہ خلش بھی ستاتی تھی کہ ہمارا کوئی مستقل ٹھکانا نہیں تھا۔ ایک گھنٹے بعد جب ہم وہاں سے رخصت ہونے لگے تو مولانا صاحب نے کہا کہ نکاح نامے کی مصدقہ نقول مجھے دو ہفتوں بعد مل جائیں گی۔

میں ناہید کے ساتھ باہر آیا تو مجھے ساری دنیا بدلی ہوئی لگی۔ جب ناہید میرے ساتھ

چل رہی تھی تو میں یوں محسوس کر رہا تھا جیسے میں فضا میں پرواز کر رہا ہوں۔ اب ہم میاں بیوی ہو گئے تھے۔

ہماری زندگی میں گویا رنگ ہی رنگ بھر گئے تھے۔ ایک ہفتہ ہم نے اسی ہوٹل کے کمرے میں گزارا۔ پہلے ہوٹل سے ہم اپنا سامان اٹھا لائے تھے۔ اب ہمیں کسی کا خوف نہیں تھا۔ حمزہ خان اس دنیا میں نہیں رہا تھا اور میں اس کے کارندوں کے طور پر اشاد اور پروین کے علاوہ کسی کو نہیں جانتا تھا اور نہ ہی کوئی ہمیں جانتا تھا۔ ہمیں رئیس قادر خان کی طرف سے خدشہ ضرور تھا لیکن میرا خیال تھا کہ اب ہمارا اس سے کبھی سامنا نہیں ہو سکے گا۔

ایک ہفتے کے بعد ناہید نے کہا۔ ''آخر تم نے کیا سوچا ہے شہباز!''

''کس سلسلے میں؟''

''یہاں سے جانے کے بارے میں...... ہم نے پروگرام بنایا تھا نا کہ ہم کہیں دور دراز علاقے میں کچھ زمین خرید کر......''

''میرا خیال ہے اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

''کیا مطلب......؟'' ناہید نے حیرت سے کہا۔

''کسی گمنام علاقے میں زمینداری کرنے سے بہتر ہے کہ میں یہیں کراچی میں کوئی کاروبار شروع کر دوں۔'' میں نے کہا۔ ''ہم یہاں سے حمزہ کے خوف سے چلے جانا چاہتے تھے۔ اب ایسی کوئی بات نہیں رہی۔ ناہید! میرا خیال ہے کہ ہم کراچی میں محفوظ رہیں گے۔ ہمارے پاس تقریباً ایک کروڑ روپے موجود ہیں۔ پہلے تو میں یہاں کوئی مکان خریدوں گا پھر اس میں منتقل ہونے کے بعد میں کسی کاروبار کے بارے میں سوچوں گا۔''

اس کے بعد میں نے مکان کی خریداری کے سلسلے میں بھاگ دوڑ شروع کر دی۔ آخر کار کئی اسٹیٹ ایجنٹوں کے توسط سے کئی مکان اور فلیٹ دیکھنے کے بعد میں نے ناظم آباد کے علاقے میں مکان خرید ہی لیا۔ اس میں منتقل ہونے کے بعد گویا ہماری زندگی میں سے افراتفری اور انتشار رخصت ہو گیا۔ اس کی جگہ سکون اور طمانیت نے لے لی۔

یہ سب کرنے کے بعد ہمارے بینک اکاؤنٹ میں پچاس لاکھ روپے بچے تھے۔ اس میں، میں نے ناظم آباد ہی میں بننے والی ایک نئی مارکیٹ میں کارنر کی دکان خرید لی اور جنرل اسٹور کھول لیا۔

دکان خریدنے اور اس میں مال بھرنے کے بعد ہمارے پاس صرف دس لاکھ روپے باقی بچے تھے۔

جنرل اسٹور چل نکلا تھا۔ اس میں دو ملازم اور ایک تعلیم یافتہ نوجوان سیلز مین کے طور پر کام کرتا تھا جسے اس کام کا تجربہ بھی تھا۔ میں بھی زیادہ تر وقت اسٹور پر ہی گزارتا تھا۔ سب ٹھیک ٹھاک چلنے لگا تھا لیکن ناہید اور میری زندگی میں ایک مستقل تشنگی پیدا ہو گئی تھی۔ آدھی رات کے بعد ہم سو نہیں سکتے۔ ہماری شادی کو تین برس گزر چکے ہیں۔ ہماری زندگی انتہائی خوشگوار طریقے سے گزر رہی ہے...... بس کمی ہے تو پُرسکون نیند کی۔

ہم نے اس سلسلے میں کئی عاملوں اور علماء سے رابطہ کیا اور انہیں ساری صورت حال بتائی۔ انہوں نے ہمیں کچھ وظائف دیے کہ انہیں کرنے سے ہم پر مسلط نحوست ختم ہو جائے گی۔ اس سلسلے میں ہمیں خاصی رقم بھی خرچ کرنی پڑی لیکن کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ رات کے بارہ بجے کے بعد میں اور ناہید جاگ کر گزارتے ہیں۔ اگر ہم اس دوران میں سوتے رہ جائیں تو بھیانک خواب ہمیں جگا دیتے ہیں۔

احتیاطاً ہم بارہ بجے کا الارم لگا کر جلدی سو جاتے ہیں اور پھر رات کے بارہ بجے کے بعد فجر تک جاگ کر گزارتے ہیں۔ جو وظیفہ ہم نے ادھورا چھوڑ دیا تھا غالباً اس کے اثرات پوری زندگی ہم پر مسلط رہیں گے۔ اب ہمیں اپنی وظائف والی ڈائری کے ملنے کی بھی امید نہیں۔ وہ پولیس کے ہاتھ لگ گئی تھی اور یقیناً ضائع کر دی گئی ہوگی۔

بہر حال، میں اپنی یہ داستان یہیں ختم کرتا ہوں جو ایک چھوٹے سے گاؤں سے شروع ہوئی تھی۔ ہم نے ماضی سے ہر طرح کا ناتا توڑ دیا ہے۔ ہم حال ہی میں خوش ہیں اور اللہ تعالیٰ سے مستقبل میں بہتری کی دعا مانگتے رہتے ہیں۔ میری آپ سب سے درخواست ہے کہ ہمارے لیے دعا کریں کہ ہمیں بے خوابی اور خوابوں کے عذاب سے نجات مل سکے اور ہم عام انسانوں کی طرح نارمل اور پُرسکون نیند سو سکیں۔

☆====== ختم شد ======☆